زاہدہ زیدی کی ادبی خدمات کا تنقیدی مطالعہ

مقالہ برائے پی ایچ ڈی

مقالہ نگار

زلفی حسیب

نگراں

پروفیسر مظہر حسین (مہدی)

ہندوستانی زبانوں کا مرکز

جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی-۶۷

۲۰۲۲ء

Dated: 10 /06 /2022

Declaration

I hereby declare that the Ph.D. thesis entitled **"ZAHIDA ZAIDI KI ADABI KHIDMAT KA TANQIDI MUTALAA" [A CRITICAL STUDY OF LITERARY WORKS OF ZAHIDA ZAIDI]** submitted by me is the original research work. It has not been previously submitted for any other degree in this or any other University/ Institution to the best of my knowledge.

I further declare that no plagiarism has been committed in my work. If anything is found plagiarised in my Thesis, I will be solely responsible for the act.

Zulfi Haseeb
Name of Students

जवाहरलाल नेहरू विश्वविद्यालय
JAWAHARLAL NEHRU UNIVERSITY
भारतीय भाषा केन्द्र
Centre of Indian Languages
भाषा, साहित्य एवं संस्कृति अध्ययन संस्थान
School of Language, Literature & Culture Studies
नई दिल्ली–110067, भारत NEW DELHI-110067, INDIA

Dated: 10 /06 /2022

Certificate

This is to certify that the **Ms. Zulfi Haseeb**, a bona-fide Research Scholar of Centre of Indian Languages, SLL&CS has fulfilled all the requirements as per the University Ordinance for the submission of Ph.D. thesis entitled "ZAHIDA ZAIDI KI ADABI KHIDMAT KA TANQIDI MUTALAA" [A CRITICAL STUDY OF LITERARY WORKS OF ZAHIDA ZAIDI]

This may be placed before the examiners for evaluation for the award of the degree of Ph.D.

Prof. Mazhar Mehdi Hussain
(Supervisor)
CIL/SLL&CS/JNU

Dr. MAZHAR MEHDI HUSSAIN
Professor
Centre for Indian Languages
SLL&CS
Jawaharlal Nehru University
New Delhi - 110067

Prof. Omprakash Singh
(Chairperson)
CIL/SLL&CS/JNU

अध्यक्ष / Chairperson
भारतीय भाषा केंद्र / CIL
भा. सा. एवं सं. अ. सं. / SLL & CS
ज. ने. वि. / J.N.U
नई दिल्ली / New Delhi-110067

GRAM: JAYENU, Tel.: (91-011) 26741557, 26742676 Extn.: 4217, (D) 26704217; Telefax: (91-011) 26704217;
Email: chair_cil@mail.jnu.ac.in, jnucil@gmail.com

فہرست

پیش لفظ	5
باب اول :	
زاہدہ زیدی کی زندگی کے احوال و آثار	11
باب دوم :	
زاہدہ زیدی کی شاعری	29
باب سوم :	
زاہدہ زیدی کی ڈراما نگاری اور ناول نگاری	79
باب چھارم:	
زاہدہ زیدی کی ترجمہ نگاری اور تنقید نگاری	137
باب پنجم :	
اردو ادب میں زاہدہ زیدی کا مقام و مرتبہ	289
ماحصل	303
کتابیات	311

پیش لفظ

زمانہ قدیم سے ہی ہمارا معاشرہ مرد اساس رہا ہے اس نے ہمیشہ عورت کے وجود کو نا کارنے کی کوشش کی ہے عورت کی آزادی اور اس کی آواز کو پردے میں رکھا اور اس کے حقوق کی پامالی کرتا رہا ہے اس کی سماجی اور معاشرتی حیثیت سے بھی انکار کیا حتی کہ عورت کو کم عقل اور کم ذہن سمجھ کر اسے علم وشعور سے بھی دور رکھا گیا۔ جس کے نتیجے میں عورت کا وجود تاریکی میں رہا اور علم کی روشنی سے وہ محروم ہو کر رہ گئی لیکن اس کے باوجود اگر زمانہ قدیم سے دور حاضر تک کا مشاہدہ کیا جائے تو ہمیں ہر زمانہ میں کچھ ایسی خواتین نظر آئیں گی جو نہ صرف علم کی روشنی سے فیضیاب ہوئیں بلکہ اپنی صلاحیتوں کے باعث انہوں نے قابل قدر تخلیقات بھی پیش کی ہیں اور یہ سب آزادی کی خواہش اور آزادی کے لیے ان کی جدوجہد کے باعث ہی ممکن ہو سکا ہے جس کا ثبوت آج ہمیں تاریخ سے بھی مل جاتا ہے۔

اردو ادب میں اگر خواتین کی تخلیقات کا جائزہ لیا جائے تو ان کی ادبی خدمات کی نہ صرف ایک لمبی فہرست نظر آئے گی بلکہ خواتین کا یہ کام صدیوں پر محیط نظر آئے گا نثر اور شاعری دونوں صنف میں انہوں نے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ خواتین چونکہ فطرتاً قصہ گو ہوتی ہیں ابتداء آفرینش سے آج تک قصہ کہانی سنانا اور سنا ان کا محبوب مشغلہ رہا ہے اسی لیے نثری صنف میں خواہ وہ ناول ہو یا افسانہ، مختصر کہانی ہو یا مضمون نگاری یا پھر خطوط نگاری کی صنف ہو ان تمام اصناف سخن میں خواتین نے غیر معمولی خدمات انجام دی ہیں انہوں نے گھر کی چہار دیواری میں رہ کر اور گھریلو کاموں کو انجام دیتے ہوئے بھی قصے کہانیوں میں اپنے عہد کی حقیقی عکاسی کی ہے خاص کر ناول کی صنف میں انہوں نے اپنے زمانے کا سماجی، معاشرتی اور معاشی مطالعہ کر کے اس عہد کی بہت سی برائیوں کو ختم کرنے کی کوشش کی ان خواتین نے اپنی ہم جنس کی معاشرتی اور سماجی زندگی کا جائزہ

لیاان کی بدترین حالت اوران پر ہورہی ناانصافی ،نابرابری ،ان کی حق تلفی اوران کی ناخواندگی کواپنی تخلیقات میں پیش کرکے ان کی اصلاح کی جدوجہد کی اورعورتوں کوتعلیم یافتہ بنانے کی پرزورحمایت کی۔ان خواتین میں رشیدانساء،صغراءہمایو،اختری بیگم،اکبری بیگم،محمدی بیگم،حسن بیگم،روشنک بیگم،طیبہ بیگم،نذرسجاداورحجاب امتیاز علی وغیرہ نام خاص طور سے قبل ذکر ہیں۔اور جب ہم بعد کے دوریعنی بیسویں صدی کی نصف دہائی سے تاحال، ناول اورافسانہ دونوں صنف پرنظرڈالتے ہیں تو خواتین کے بے شمار نام ہمیں دیکھنے کو ملتے ہیں جن کی تخلیقات نے اردوادب میں گراں قدراضافے کیے۔ان میں رشید جہاں،عصمت چغتائی،قرۃالعین حیدر،رضیہ سجادظہیر، خدیجہ مستور،جمیلہ ہاشمی، جیلانی بانو،رضیہ فصیح ، ہاجرہ مسرور ، بانو قدسیہ وغیرہ کے نام خاص طور سے اہم ہیں۔ان تمام خواتین نے اپنی تخلیقات میں اپنے عہدکی سماجی معاشرتی اورمعاشی زندگی کی ایسی حقیقی عکاسی کی ہے کہ اس عہدکی پوری تصویرسامنے آجاتی ہے۔

جہاں تک شاعری کی صنف کاتعلق ہےتواگرچہ خواتین کوشاعری کی اجازت نہیں تھی اورنہ ہی کوئی شریف خاندان کی عورت شاعری کرسکتی تھی بلکہ خواتین کاپڑھنا،لکھناہی معیوب سمجھاجاتا تھا پھربھی شاعری کے برعکس نثری تخلیقات میں خواتین کی شمولیت کوقابل قبول سمجھا گیااوران کی بہت سی تخلیقات منظرعام پرآئیں۔مگر جب ہم انیسویں صدی پرنظرڈالتے ہیں تواس صدی میں بھی شاعری کے میدان میں ہمیں خواتین کے بے شمار کارنامےنظرآئیں گےجن کی تخلیقات کوادبی سندتو حاصل نہیں ہوئی لیکن بعدمیں ان کی تخلیقات کونظرانداز بھی نہیں کیا جاسکاان ابتدائی خواتین میں جوسب سے پہلی صاحب دیوان شاعرہ ہمارے سامنے آتی ہیں ماہ لقاچندا ہیں وہ پہلی شاعرہ ہیں جنھوں نے اپنادیوان مرتب کیا یہ ایک طوائف تھیں اوردکن کی رہنے والی تھیں۔

ماہ لقاچنداکےعلاوہ بھی بہت سی صاحب دیوان شاعرات کا ذکرتذکروں میں ملتا ہے۔لیکن ان کا کلام اب دستیاب نہیں ہےان شاعرات میں بیگم دختر میرحجاب،نواب شاہ جہاں بیگم شیریں،نواب صدر، عالم زوجہ واجدعلی شاہ،نجم النساءعفت وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ان میں زیادہ تر شاعرات طوائف پیشہ سے تعلق رکھتی تھیں اس کی ایک خاص وجہ یہ تھی کہ اس عہدمیں شریف عورتوں کاشاعری کرنا تو دوران کا گھرسے باہر قدم رکھنا بھی معیوب سمجھا جاتا تھا ان کی ضروریات کے تمام اسباب گھرکے اندرموجودہوتے تھے جب کہ

طوائف باہری دنیا کا اہم حصہ رہی ہیں ان پر اس قدر پابندی عائد نہیں تھی انہوں مختلف علوم وفنون میں مہارت میں حاصل کی لکھنا پڑھنا، گانا بجانا اور موسیقی ان کے محبوب مشغلے رہے یہی وجہ ہے کہ پہلی صاحب دیوان شاعرہ بھی ایک طوائف تھی لیکن ان طوائفوں کے علاوہ بھی کچھ ایسی خواتین کا نام ملتا ہے جن کا تعلق شریف خاندان سے تھا جنہوں نے اپنے جذباتی اظہار کے لیے شاعری کی ۔ان میں زیب النساء مخفی، بیگم، جینا بیگم، کاملہ بیگم، اختر، پارسا اور ثریا بیگم کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

انیسویں س صدی کے برعکس جب ہم بیسویں صدی پر نظر ڈالتے ہیں تو یہاں بھی ہمیں بہت سی شاعرات نظر آتی ہیں۔ چونکہ اس زمانے میں آزادی کی جدوجہد جاری تھی ہندوستان کی تحریک آزادی کو آگے بڑھانے اور مجاہدین آزادی میں جوش وولولہ پیدا کرنے میں شاعری نے ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔اس ان میں بھی شاعروں کے ہم قدم شاعرات نے بھی اس کار خیر میں اپنے کارنامے انجام دیے انہوں نے آزادی سے پہلے اپنے ہم وطنوں میں ایک طرف وطن کی محبت کے لیے جوش وولولہ پیدا کیا تو دوسری طرف آزادی کے بعد حتی کہ تقسیم ہند کے خونی واقعہ سے متاثر ہوکر بھی جذباتی اور غیر معمولی شعری کارنامے انجام دیے۔جن میں انور فاطمہ شمیم،عزیز جہاں ادا، تاجور زیب،سعیدہ جہاں مخفی، نجمہ تصدق اور رفیعہ بانو مضمر وغیرہ کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

اس کے بعد دور حاضر تک بے شمار شاعرات منظر عام پر نظر آتی ہیں جنہوں نے شاعری کی دنیا میں نا قابل فراموش خدمات انجام دی ہیں اور شاعری کی دنیا میں اپنی غیر معمولی پہچان قائم کی ۔ان شاعرات میں زہرہ نگار، پروین شاکر، یاسمین حمید، سارا شگفتہ ،فہمیدہ ریاض ،شاہدہ حسن، زاہدہ حسن، عذرا عباس ،شفیق فاطمہ شعریٰ،ممتاز مرزا، ساجدہ زیدی، جمیلہ بانو،مسعودہ حیات ،بلقیس ظفیر الحسن، ادا جعفری،شہناز نبی اور زاہدہ زیدی کے وغیرہ کے نام سرِ فہرست ہیں۔

نثر اور نظم دونوں اصناف میں خواتین اپنی نا قابل فراموش خدمات انجام دے رہی ہیں اور انہوں نے یہ واقف کرایا کہ عورت بھی کسی لحاظ سے مرد سے کسی طرح کم نہیں وہ بھی مرد کی طرح سماج کی ایک فرد ہے۔ان تمام خواتین کا حوالہ بھی میں نے اپنے اس مجوزہ مقالے میں پیش کیا ہے۔ جنہوں نے اپنے وجود اور اپنی

صلاحیتوں کو اجاگر کر کے اپنی ذات کو نا قابل فراموش بنایا۔

زاہدہ زیدی بھی ان ہی میں سے ایک ہیں جنھوں نے اپنے علم و ہنر، اپنے مطالعہ و مشاہدہ سے اپنی شخصیت کے ہمہ جہت پہلوؤں کو منور کیا اور اپنی قابلیت کے باعث انہوں نے اردو ادب کی مختلف اصناف میں اپنی تخلیقات کو پیش کیا زاہدہ زیدی نے نثر اور شاعری دونوں میں یکساں مہارت حاصل کی۔ جہاں ایک طرف ان کی شاعری داخلی، خارجی اور زندگی کے گونا گوں تجربات تنہائی، آزادی، سیاسی وسماجی ماحول، اقدار کی شکست وریخت وغیرہ کا اظہار اور ان کے ذاتی تجربات واحساسات کی ترجمان ہے، وہیں انہوں نے نثری اصناف ناول، ڈرامہ اور تراجم میں بھی طبع آزمائی کی اور ڈرامہ کے میدان میں خاص طور سے کئی اہم کارنامے انجام دیے انہوں نے یونانی ڈرامہ سے لے کر جدید مغربی ڈرامے تک کا بغور مطالعہ ومشاہدہ کر کے انہوں نے نہ صرف ڈرامہ کی تخلیق کی بلکہ اسے پوری جدوجہد کے ساتھ اسٹیج پر پیش کرنے میں بھی کامیاب ہوئی ہیں۔

میرے اس تحقیقی مقالے سے زاہدہ زیدی کی ہمہ جہت خدمات کی تصویر سامنے آسکے گی، ان کی فکری وفنی تشکیلات میں مختلف ادبی تحریکات ورجحانات کے اثرات کا اندازہ ہو سکے گا جس سے ان کی ادبی تخلیقات کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ یہ مقالہ اردو ادب سے شغف رکھنے والوں اور خواتین کی خدمات پر تحقیق کرنے والوں کے لیے بھی مفید ثابت ہوگا کیوں کہ اب تک زاہدہ زیدی کی ادبی خدمات پر کوئی تحقیقی مقالہ منظر عام پر نہیں آسکا ہے۔ اس کے علاوہ اردو ادب میں زاہدہ زیدی کے ادبی مقام ومرتبہ کا بھی تعین ہو سکے گا۔

اس مقالے میں حتی الامکان کوشش کی ہے کہ زاہدہ زیدی کی تمام تخلیقات کا جائزہ لیا جائے اور مختلف اصناف شاعری، ڈراما، ترجمہ، تنقید اور ناول نگاری کے میدان میں ان کی تمام تر تخلیقات وتصنیفات کا تفصیلی احاطہ پیش کیا گیا ہے اس کے بعد ان کی فکری وفنی خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ساتھ ہی ان کی ادبی خدمات کے ذریعہ اردو ادب میں ان کی اہمیت کی وضاحت بھی کی گئی ہے۔ جسے میں نے مختلف ابواب کے تحت پیش کیا ہے۔

پہلا باب ان کی سوانحی زندگی کے تعلق سے ہے۔ جس میں ان کے سوانحی کوائف کے ساتھ ان کی تعلیمی زندگی اور گھر کے ماحول پر گفتگو کی گئی ہے۔ اس کے بعد زاہدہ زیدی کے عہد کے سماجی وسیاسی اور معاشرتی حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ جس سے ان کی شخصیت پر ان کے زمانے کے اثرات کا علم ہو سکے۔

دوسرا باب زاہدہ زیدی کی شاعری کے متعلق ہے۔ جس میں ان کی غزل اور نظم گوئی کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس باب میں سب سے پہلے شاعری اور اصناف شاعری غزل اور نظم پر بات کی گئی ہے اس کے بعد زاہدہ زیدی کے عہد کی شاعری اور ان کی معاصرین شاعرات کی شاعری پر بھی نظر ڈالی گئی ہے تا کہ ان معاصرین کی شاعری کو سمجھتے ہوئے زاہدہ زیدی کی شعری اور فکری وفنی خصوصیات کی انفرادیت کا علم ہو سکے۔ اور ان کی شاعری کے داخلی وخارجی پہلوؤں پر روشنی ڈالی جا سکے۔

تیسرا باب اس باب میں زاہدہ زیدی کی ڈراما اور ناول نگاری کا جائزہ لیا گیا ہے۔ پہلے حصہ میں ڈرامے کی صنف اور زاہدہ زیدی کے معاصرین پر گفتگو کی گئی ہے۔ اس کے بعد زاہدہ زیدی کی ڈرامہ نگاری اور ان کے ڈراموں پر تفصیل سے گفتگو کرنے کے بعد زاہدہ زیدی کے ڈراموں کی خصوصیت واہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ ان کی ڈراما نگاری معاصرین سے کس طرح مختلف اور انفرادیت کی حامل ہے۔ اسی طرح ناول کے حصہ میں بھی کیا گیا ہے۔ صنف ناول اور ان کے معاصرین کا جائزہ لینے کے بعد زاہدہ زیدی کے ناول اور ان کے ناول نگاری کی فکری فنی خصوصیات کی وضاحت کی گئی ہے۔

چوتھا باب اس باب میں پہلے حصہ میں ترجمہ نگاری کی صنف پر بحث کرتے ہوئے زاہدہ زیدی کی ترجمہ نگاری پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ترجمہ نگاری کی صنف میں ان کے طرز بیان اور سلوب کا جائزہ لیتے ہوئے اس بات کا احاطہ بھی کیا گیا ہے کہ وہ ترجمہ نگاری کے فن کو برتنے میں کس حد تک کامیاب ہوئی ہیں۔ جب کہ دوسرا حصہ ان کی تنقید نگاری پر منحصر ہے۔ اس میں پہلے اردو ادب میں تنقید کی اہمیت کا جائزہ لینے کے بعد زاہدہ زیدی کے معاصرین کے ساتھ ان کی تنقیدی صلاحیتوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اور ان کی تنقیدی کاوشوں پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کے تنقیدی نظریہ کی بھی وضاحت کی گئی ہے۔

پانچواں باب اس آخری باب میں زاہدہ زیدی کی ہمہ جہت شخصیت کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ ادب کی مختلف اصناف غزل، نظم، ڈرامہ، ناول، تنقید اور تراجم کے میدان میں کی گئی ان کی تخلیقی، تحقیقی اور تنقیدی کاوشوں کا جائزہ لینے کے بعد ان کی ادبی تخلیقات سے ادب میں جو اضافہ ہوا اس کی وضاحت پیش کی گئی ہے علاوہ ازیں اردو ادب میں زاہدہ زیدی کے مقام ومرتبہ کا صحیح تعین بھی کیا گیا ہے جس کی وہ حقدار ہیں۔

اس تحقیقی مقالے کی مواد کی فراہمی سے لے کر اس کی تکمیل تک جن حضرات کا تعاون شامل رہا ان کا شکریہ ادا کرنا میں اپنا اولین فریضہ سمجھتی ہوں۔ سب سے پہلے اپنے مشفق استاد جناب پروفیسر مظہر مہدی کی شکر گزار ہوں، جنھوں نے ہر قدم پر اپنے نیک اور مفید مشوروں سے نوازا اور جن کی معاونت سے یہ کام پایۂ تکمیل کو پہونچ سکا۔ مجھے امید ہے کہ مستقبل میں بھی وہ اسی طرح میری رہنمائی کرتے رہیں گے۔ ساتھ ہی اپنے شعبے کے دیگر اساتذہ کرام کی بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے میری ہمت افزائی کی اور گاہے بگاہے اپنے گراں قدر مشوروں سے نوازا۔

میں اپنے ان دوستوں کا بھی شکر گزار ہوں خصوصاً محمد اعظم ایوبی، محمد مظہر، محمد عامر اور خدیجہ کا جنھوں نے مواد کی فراہمی سے لے کر مقالے کی تکمیل تک کسی نہ کسی سطح پر میری مدد اور حوصلہ افزائی کی۔

آخر میں اپنے والدین، بہن اور بھائیوں کا جتنا بھی شکر ادا کروں وہ کم ہے، جن کی محبت اور شفقت کا سایہ میری تعلیمی مشغولیت وانہماک کے لیے امداد غیبی کی حیثیت رکھتا ہے اور ان کی دعائیں میری زندگی کا عظیم سرمایہ ہیں۔

زلفی حسیب

جواہر لال نہرو یونیورسٹی

نئی دہلی-۱۱۰۰۶۷

باب اول

زاہدہ زیدی حیات وشخصیت

زاہدہ زیدی میرٹھ میں 4 جنوری 1930 کو پیدا ہوئیں۔ان کے والد پروفیسر مستحسن زیدی میرٹھ میں بیرسٹر تھے۔والد کے انتقال کے بعد زاہدہ زیدی کی والدہ اپنے بھائی خواجہ غلام السیدین کے یہاں علی گڑھ منتقل ہوگئی تھیں یہاں ابھی ایک برس مشکل سے گزرا تھا کہ غلام السیدین جو علی گڑھ کے شعبہ تعلیم میں پروفیسر تھے اب ان کی منتقلی کشمیر ہوگئی تھی۔تو ان کی والدہ اپنے آبائی مکان پانی پت میں آ کر رہنے لگیں۔ جہاں انہوں نے اپنی خالہ اکھن کے قائم کردہ گرلز اسکول میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔

زاہدہ زیدی کی پانچ بہنیں صابرہ زیدی،ساجدہ زیدی،زاہدہ زیدی،شاہدہ زیدی اور خدیجہ زیدی تھیں۔ان سے بڑی ساجدہ زیدی اور سب سے بڑی صابرہ زیدی نے چونکہ ابتدائی تعلیم اپنی خالہ کے گرلز اسکول سے حاصل کرنے کے بعد علی گڑھ میں عبداللہ کالج سے ہاسٹل میں رہ کر حاصل کر رہی تھیں اسی قاعدہ کے مطابق زاہدہ زیدی کو بھی آگے کی تعلیم یہیں سے حاصل کرنی تھی۔مگر ان کے گھر کے حالات اس قدر خوش حال نہ تھے کہ ان کی والدہ ساری لڑکیوں کے ہاسٹل کا ذمہ اٹھا سکیں لہذا زاہدہ زیدی کی والدہ نے علی گڑھ میں مستقل سکونت کا ارادہ کیا۔اور پھر وہ یہیں رہائش پذیر ہوگئیں۔

زاہدہ زیدی کے گھر کا ماحول تعلیمی تھا ان کے والد مستحسن زیدی تعلیم یافتہ اور نیک سیرت انسان تھے،انہیں اپنی بیٹیوں سے بہت محبت تھی،کبھی بیٹے کی خواہش ظاہر نہ کی بلکہ اپنی بیٹیوں کی تربیت بڑے سلیقے سے کی۔اور انہیں بے جا پابندیوں میں باندھنے کے بجائے انہیں خودمختار بنانے اور اپنے کام کرنے میں مکمل آزادی دی۔ساجدہ زیدی اپنے ابا کی شخصیت کے بارے میں ''نوائے زندگی'' میں لکھتی ہیں:

میرے والد مستحسن زیدی (مرحوم) بائیٹ لا کی شخصیت میں ایک ایسا سحر تھا کہ بزرگ وخورد سب ان کے دلدادہ تھے، وہ نفاست اور پاکیزگی، وقار اور انکسار، انٹلکچولزم اور فطرت پرستی، وضعداری اور آزادی کا حسین امتزاج تھے۔ایک طرف وہ کیمبرج یونیورسٹی کے علم الریاضی کے مایہ ناز اسکالر تھے تو دوسری طرف وہ غالب واقبال اور حافظ وسعدی کے پرستار تھے اور اردو فارسی ادب سے گہرا شغف رکھتے تھے، ایک طرف وہ قانون داں تھے تو دوسری طرف زبان دان۔۔۔قانون دان ایسے کہ ان کی وکالت اور قابلیت کی شہرت میرٹھ شہر اور آس پاس کے تمام علاقوں میں ان کے انتقال کے بعد مدتوں پھیلی رہی۔آج بھی ان کے زمانے کے لوگ انہیں عزت واحترام سے یاد کرتے ہیں، زبان وادب کے قدردان ایسے کہ اپنی بچیوں کے ذہن میں بچپن ہی سے غالب واقبال اور حافظ وسعدی اور دوسرے شعراء کی حسن ومعنی آفرینی کا نقش بٹھا دیا۔ ہماری سماعت اور ذہن کو اس وقت شعر کے آہنگ سے آشنا کیا جس عمر میں بچے نرسری رائمز پڑھنے کی ابتدا کرتے ہیں۔1ے

زاہدہ زیدی کی والدہ مختار زیدی چونکہ حالی کی پوتی اور خواجہ غلام الثقلین کی بیٹی تھیں جن کا شمار میرٹھ کے مشہور وکیلوں میں ہوتا تھا انہوں نے علی گڑھ سے تعلیم حاصل کی تھی، اور بہت سی قابل قدر تصانیفات بھی ان سے یادگار ہیں۔ان کی والدہ مذہبی شعر وشاعری بھی کرتی تھیں، اردو اور فارسی کے بے شمار شعراء کا کلام انہیں ازبر تھا، ان کا دیوان ''چمنستان عقیدت'' کے نام سے شائع بھی ہو چکا ہے جو مذہبی عقیدت مندوں کے درمیان مقبول بھی رہا ہے۔ساجدہ زیدی اپنی والدہ کے بارے میں لکھتی ہیں:

اماں شاعرہ تھیں، اور تمام مرثی، سلام، قصیدے (ائمہ اور معصومین کے قصیدے) منقبت، حمد، نعت اور مذہبی نظمیں لکھتی تھیں۔کبھی غزل وسمال کے فورم میں اور کبھی مسدس کے یا رباعی کے انداز میں ان کے کلام پر میر انیس کا واضح اثر تھا، ان کی ایک مشہور کتاب ''چمنستان عقیدت'' کے نام سے اور دسرا ترمیم شدہ ایڈیشن ''چراغ تہہ داماں'' کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔فارسی اشعار کا ایک لامحدود خزانہ ان کے ذہن میں محفوظ تھا اور وہ ہمارے بچپن سے اپنی آخری عمر تک حافظ وسعدی، غالب یا رومی واقبال کے اشعار دوران گفتگو برمحل پڑھ دیا کرتی تھیں۔بے ساختہ وبے محابہ۔2ے

زاہدہ زیدی کی بڑی بہن صابرہ زیدی بھی اسی طرح ذہین اور اعلیٰ صلاحیتوں کی مالک تھیں۔انہیں انگریزی ادب سے گہرا شغف تھا وہ اپنے وقت کی پہلی طالبہ تھیں جنہیں کولمبیا یونیورسٹی میں full brite

scholarship ملی تھی۔

ایسے ماحول میں زاہدہ زیدی کی تربیت ہوئی؛ ظاہر ہے ان کی طبیعت پر اس کا خاصا اثر ہوا دوسرے وہ خود بھی ذہین اور تخلیقی صلاحیتوں کی مالک تھیں۔ زاہدہ زیدی نے ابتدائی تعلیم علی گڑھ سے حاصل کی اور یہیں سے انگریزی میں M.A کیا اس کے بعد اعلی تعلیم کے لیے انگلینڈ چلی گئیں واپس آ کر Miranda اور Lady Irwin کالج میں لکچرار ہوئیں اسکے بعد علی گڑھ کے شعبہ انگریزی میں پروفیسر کے عہدے پر رہیں اور پھر یہیں سے ریٹائر ہوئیں۔ نہ صرف زاہدہ زیدی بلکہ ان کی تمام بہنوں کی تعلیم وتربیت میں ان کے گھر کے ماحول اور ان کے والدین خصوصاً ان کی والدہ محترمہ کا اہم رول رہا ہے۔ اپنی بہنوں کی تعلیم وتربیت سے متعلق اپنی والدہ کے کردار کی وضاحت کرتے ہوئے ساجدہ زیدی کہتی ہیں؛

ہم بہنوں کے تعلق سے اماں کی تعلیم وتربیت کا انداز بالکل ماڈران تھا۔ انہوں نے کبھی ہمیں مذہب واخلاق کی براہ راست تعلیم نہیں دی بلکہ بالواسطہ طور پر نظموں، کہانیوں، حکایات وغیرہ کے ذریعہ دی۔ یا ہر موقع پر غالب، اقبال وحالی اور انیس کے یا پھر فارسی کے اشعار دوران گفتگو پیش کرتی تھیں۔ ہم بہنوں کو کھیل کود سیر وتفریح (باغوں میں گھومنے) اپنے مشاغل کے انتخاب وعمل میں کافی آزادی تھی، اماں کم ہی دخل دیتیں، بس ایک خاص قسم کے نظام اخلاق اور روایتوں کے پاس کا نہوں نے ماحول سا پیدا کر دیا تھا۔ جس میں اماں اور بھائی ابا دونوں کے رویوں میں یگانگت تھی۔'' 3

لیکن کچھ ہی عرصہ بعد ان کے والد محترم کا انتقال ہوگیا جس کے باعث انہیں مختلف طرح کی دشواریوں کا بھی سامنا کرنا پڑا اب ان کی والدہ تنہا تھیں اور پانچ بیٹیوں کی ذمہ داری ان کے کندھوں پر اکیلے پڑی تھی، ان کے تایا اور چچا نے ان کے والد کی ساری جائیداد اپنے نام کر لی تھی نہ صرف جائیداد بلکہ ان کا گھر تک پر قبضہ کر لیا تھا۔ ان کی والدہ نے ہر ممکن کی کوشش کی مگر انہیں جائیداد میں کچھ حصہ نہیں دیا گیا۔ اور پھر وہ اپنی بیٹیوں کے ساتھ اپنے آبائی وطن منتقل ہوگئی تھیں، ان تمام واقعات کے باعث زاہدہ زیدی اور ان کی بہنوں کو بچپن سے ہی باپ کا سایا نہ ہونے کی وجہ سے یتیمی کے علاوہ اور بہت سی محرومیاں کا سامنا کرنا پڑا تھا، جس کا اثر ان کی تخلیقات میں بھی نظر آتا ہے۔ ساجدہ زیدی نے اپنے تایا و چچا کی اس چالبازی کا ذکر اپنی سوانح عمری

میں بھی کیا ہے:

آہستہ آہستہ یہ بھی انکشاف ہوا کہ ہمارا گھر اور بھائی ابا کے شوق ومحنت سے لگائے ہوئے باغات اور حدنظر تک پھیلے ہوئے کھیت سب پر منجھلے تائے نے قبضہ کرلیا ہے۔ چچا بھی اس سازش میں شامل تھے۔ بھائی ابا اپنی شریف النفسی کی بنا پر منجھلے تائے کے روغن قاز اور منافقانہ مذہبیت سے متاثر ہوکران پر اس قدر بھروسہ کرتے تھے کہ جائداد خریدتے گئے اوراس کا انتظام ان کے سپرد کرتے گئے۔ یہاں تک کہ چالاک بہانوں سے کام لے کرانہوں نے اپنے آپ کو تمام کھیتوں، باغات، کوٹھی اور سب جائداد کا مختار کل مقرر کرالیا۔ان کا پیش کردہ جواز یہ تھا کہ بھائی تمہیں کچہری مقدموں وغیرہ سے فرصت ہی کہاں ملتی ہے۔ میں خالی ہوں سب دیکھ لوں گا۔۔۔وہ خود بے اولاد تھے۔۔پولس کی نوکری کبھی کی تھی، جس سے کسی نا قابل اظہار الزام میں برطرف کردیے گئے تھے۔۔۔گورنمنٹ کی ملازمت ملنے کا امکان نہ تھا،انہیں اور چھوٹے چچا کو ہم نے ہمیشہ بیکار دیکھا۔۔بس نماز روزہ کرتے ماشاء اللہ،معاذ اللہ وغیرہ ہر بات میں کہتے۔۔غالبًا خدا کو تو رام نہ کر سکے مگر بندوں کے سامنے Holier Than Thuo یا کبازی کا پوز بناتے رہے۔۔ بھائی ابا کے بعد وہ ہر چیز پر قابض ہوگئے۔4

اس سے ہمیں ان کی مصیبتوں، پریشانیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ کہ انہوں نے کس قدر محنت ومشقت کے ساتھ زندگی بسر کی ہوگی۔ مگر یہ بات بھی عیاں ہے کہ ان کی والدہ نے کبھی بھی اپنی بیٹیوں کی تعلیم سے دست برداری نہیں کی۔ بلکہ ناسازگار حالات میں بھی وہ اپنی اولاد کی تعلیم کی خاطر وہ مستقل طور پر علی گڑھ منتقل ہوگئیں۔اور پوری دل جوئی کے ساتھ ان سب کو اعلیٰ تعلیم کی طرف گامزن کیا۔

زاہدہ زیدی نے اپنی تخلیقی زندگی کا آغاز عنفوان شباب میں ہی کردیا تھااوراس کے بعد انہوں نے اپنی زندگی میں ادبی سفر کی مختلف تحریکوں جیسے ترقی پسند تحریک، جدیدیت، مابعد جدیدیت اور تانیثیت کی تحریک وغیرہ کے زیر و بم کا مشاہدہ کیا اور کبھی خود بھی اس سے وابستہ رہیں۔ ترقی پسند تحریک سے وہ اوران کی سب بہنیں بھی بے حد متاثر تھیں، جس کا ذکر خود زاہدہ زیدی نے اپنے ناول اور ساجدہ زیدی نے اپنی خودنوشت ''نوائے زندگی''میں کیا ہے۔ساجدہ زیدی لکھتی ہیں؛

زاہدہ، شاہدہ، بیا پارٹی کارکن بن گئیں، میں پارٹی کی علیحدگی پسند secterianism سے خائف تھی اور میری خانگی

ذمہ داریاں اور بچہ بھی تھا، ذہن میں کچھ شکوک ابھر رہے تھے، میں ممبر بہ بنی۔ باہر رہ کر مدد گار رہتی۔ جس طرح ممکن ہوتا ساتھ دیتی۔5

ساجدہ زیدی نے ایک اور واقعہ بیان کیا جب زاہدہ زیدی اور شاہدہ زیدی آزادی کے بعد حکومت کی مخالفت میں سڑکوں پر کالے جھنڈے لے کر اتر آئیں تھیں جس کی پاداش میں انہیں بنارس جیل خانے کی کوٹھریوں میں بھی گزارنا پڑے تھے اور جہاں انہوں نے 17/18 دن کی بھوک ہڑتال بھی کی تھی۔ ساجدہ زیدی بنارس جیل اپنی ماں اور اپنے دو چھوٹے بچوں کے ساتھ زاہدہ، خدیجہ اور شاہدہ زیدی سے ملنے گئیں تھیں، وہ کہتی ہیں:

جب قیدیوں تک رسائی کی نوبت آئی تو دیکھا زاہدہ، شاہدہ اور بیا (خدیجہ) مع جیل کی ایک اور نوعمر لڑکی کے ساتھ ،سوکھ کر کانٹا ہوگئی ہیں، وہ 18 دن سے بھوک ہڑتال پر تھیں اور ایک گز مربع کی کال کوٹھری میں قید تنہائی کی سزا کاٹ رہی تھیں۔۔۔ (سولٹری سیل میں) یعنی اندھیری کوٹھریوں کی تنہائی میں یہ جیل میں نعرے لگانے کی سزا تھی۔ یہ بے یار و مددگار لڑکیاں تھیں، بڑے سیاسی قیدی نہیں جنہیں، ''اے کلاس'' ملتی ہے۔ آزاد ہندوستان میں سترہ اٹھارہ سال کی دوشیزاؤں کو کالے جھنڈے لے کر سڑکوں پر آنے کی پاداش میں ''سولٹری سیل'' ملے تھے۔ یہ آزاد ہندوستان تھا، کانگریس کی حکومت تھی، یہ سیاسی قیدی تھیں۔6

اس کے بعد اگر تانیثی تحریک کی بات کی جائے تو یہ بات صحیح ہے کہ زاہدہ زیدی نے کبھی باقاعدہ طور پر اس تحریک سے خود کو وابستہ نہیں کیا اور نہ ہی ان کی شاعری میں تانیثی لب و لہجہ اور نعرہ بازی ملتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود نہ صرف ان کی شاعری میں خواتین کے مسائل اور ان کے جذبات و تاثرات کا اظہار کیا گیا ہے بلکہ زاہدہ زیدی عورتوں پر پابندی کے خلاف تھیں انہوں نے اپنی ساری زندگی موڈرن اور لبرل طریقے سے گزاری ہے۔ اور نہ صرف زاہدہ زیدی بلکہ ان کی دوسری بہنیں بھی عورتوں پر کسی قسم کی سخت پابندی کے خلاف تھیں۔ ساجدہ زیدی نے اس کے بارے میں بھی اپنی خودنوشت میں ذکر کیا ہے۔ کہتی ہیں:

یہ وہ دور تھا جب تانیثی تصورات اور تحریکوں نے ہندوپاک میں جنم نہیں لیا تھا۔ بلکہ عام لوگ اس تصور سے بھی ناواقف تھے، لیکن ہم چار بہنیں ہندوستان میں women,s lib& women empowerment کے تصورات کو اپنی زندگی میں جی رہے تھے۔ اور امریکہ، نیویارک میں ہماری بہن صابرہ زیدی liberation of

blacks کی تحریک میں در ہے،قدمے، سخنے،شریک تھیں۔7

اس انداز سے زندگی جینے کا رنگ ان بہنوں کو دوسروں سے مختلف بنا تا تھا،انہوں نے کسی دوسرے کے طرز کو اپنانے کے بجائے اپنے ذہن ودل کو استعمال کر کے اپنا طرز زندگی خود وضع کیا اور یہ سب کی علم وادب کے ذوق وشوق اور گہرے مطالعہ کی وجہ سے ہی ممکن ہو پایا۔ان بہنوں نے بارے میں پروفیسر غضنفر لکھتے ہیں:

واقعی یہ دونوں بہنیں علم وادب کی پیر وفقیر تھیں،درگاہ ادب میں یہ دونوں سچ مچ کی ساجدہ اور زاہدہ تھیں،ان کے پاس جب تک رہیے علم وادب کا بکھان سنتے رہیے۔علم وادب کے علاوہ کوئی اور بات ان کے ہونٹوں پر نہیں آتی تھی یعنی معرفت علم اور عرفان ادب کے حصول میں ہمہ وقت مستغرق رہتی تھیں،دونوں علم وادب کی دلدادہ بلکہ رسیا تھیں۔ایسی رسیا جیسا کہ کوئی پیئڑ (رند بلانوش) یا طرسی ہوتا ہے کہ جیسے شراب کے گھونٹ یا چرس کے کش کے بنا چین نہیں آتا ہے۔مطالعہ کا انہیں ایسا چسکا تھا کہ جب تک شریانوں میں نوشۂ علم گھل نہیں جاتا انہیں سکون نہیں ملتا۔جب تک کچھ پڑھ نہیں لیتیں انہیں نیند نہیں آتی تھی، یہ کتابوں کو پڑھتی ہی نہیں تھیں بلکہ ان کا سارا رس نچوڑ کر پی جاتی تھیں۔علم وفنون کا وہ رس ہی تھا جو ان کے دل ودماغ کو ہر وقت تروتازہ اور چہروں کو شگفتہ وشاداب رکھتا تھا۔اور آنکھوں میں جادو جگائے رہتا تھا۔8

زاہدہ زیدی کی شخصیت ہمہ گیر تھی وہ ایک انگریزی کی پروفیسر تھیں۔علی گڑھ سے ایم۔اے (انگریزی) کرنے کے بعد زاہدہ زیدی نے دہلی کے لیڈی ارون کالج میں نوکری کی۔لیکن بعد میں ان کا تقرر بحثیت لکچرر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ومنس کالج میں ہوگیا تو وہ واپس علی گڑھ آ گئیں،1956 میں اسکالر شپ پر کیمبرج اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے چلی گئیں،وہاں انہوں نے 1958 تک ایم۔اے انگریزی کی تعلیم حاصل کی اور اسی سال ہندوستان واپس ہوئیں۔لندن میں دوران تعلیم زادہ زیدی کو وہاں کی تہذیب وثقافت کو نہ صرف سمجھنے کا موقعہ ملا بلکہ وہ تعلیم کے علاوہ بھی دوسری سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتی رہیں،خاص کر ڈرامہ سے ان کو گہری دلچسپی تھی لندن میں انہوں نے ڈرامے کی صنف کا گہرا مشاہدہ کیا اور اسٹیج ڈراموں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔وہاں وہ مغربی ڈراموں سے بے حد متاثر ہوئیں یہی وجہ ہے کہ ان کے ڈراموں میں مغربی ادب کی بہت گہری چھاپ ہے۔

زاہدہ زیدی اگرچہ ماڈرن ،آزادخیال اورمغربی کلچر کی دلدادہ تھیں مگروہ اپنی تہذیب ومعاشرت سے بھی بخوبی واقف تھیں۔اورانہیں مذہب اسلام سے بھی اسی قدرواقفیت تھی ،اس کی خاص وجہ ان کے گھر کا مذہبی ماحول تھا جوان کواپنے والدین سے ورثہ میں ملاتھا۔اس بارے میں پروفیسرغضنفر لکھتے ہیں:

مغربی معاشرہ میں پرورش پانے اوراسی انداز سے جینے کارنگ ڈھنگ اپنانے اورترقی پسندخیالات رکھنے کے باعث ان دونوں بہنوں کے متعلق دوسروں کی طرح میرے تصور میں بھی یہ گھر کرگیا تھا کہ مذہب سے ان کا کوئی واسطہ نہیں لیکن ایک دن ہمارا یہ تصور غلط ثابت ہوگیا ایک دن میں ساجدہ زیدی کے گھرکسی کام سے گیا ہوا تھا جب وہ ذاکر باغ کے ایک فلیٹ میں رہا کرتی تھیں،مغرب کی آذان کی آواز میرے کانوں میں پڑی تو حسب عادت جیب سے رومال نکالا۔یہ دیکھتے ہی وہ بول پڑیں ’’نماز پڑھنا چاہتے ہومسجد تو یہاں سے ذرادور ہے۔جماعت سے نماز نہیں مل پائے گی۔بہتر ہے یہیں پڑھ لو،ادھرغسل خانے میں لوٹا رکھا ہوا ہے میں جانماز لاتی ہوں۔‘‘وضوکرتے ہوئے میں یہ سوچتا رہا ہم نے کتنا غلط تصوران کے بارے میں قائم کررکھا تھا، جانماز اورلوٹا اس بات کی غمازی کررہے تھے کہ وہ مذہبی ارکان کی ادائیگی سے غافل نہیں تھیں۔اگرغافل تھیں بھی تب بھی یہ دونوں اشیاءاس بات کی گواہی تو تھی کہ ان کا اپنا تہذیبی سنسکار جس میں مذہب دورتک شامل رہتا ہےان کے اندرون تک موجود ہے۔9

ان کی صورت پرکشش اوران کا ذہن غوروفکر کا غماز تھا،جس کی وجہ سے ان کی شخصیت میں ایک قسم کا رعب تھا۔مگران کا یہ رعب غروراور گھمنڈ کی نشاندہی نہیں کرتا البتہ انہیں ممتاز اورمنفردضرور بناتا تھا،ان کی گفتگو میں علم وادب کے شگوفے بکھرتے رہے،ہرموضوع اور ہرپہلوپران کی نظرعمیق اورواضح ہوتی تھی۔اوروہ اپنے مطالعہ ومشاہدہ کے باعث ہی اردوادب میں ان کا قد بہت بلند نظر آتا ہے۔

زاہدہ زیدی کی ادبی خدمات:

زاہدہ زیدی کی ادبی خدمات پرگفتگو کی جائے تو یہ بات عیاں ہے کہ انہوں نے اردوادب کی بیشتر اصناف میں نہ صرف طبع آزمائی کی ہے بلکہ ہر صنف میں اپنی صلاحیتوں کے جوہر بھی دکھائے۔

ان کی ادبی خدمات کی گراں قدرکوششوں کااندازہ ہم اسلوب احمد انصاری کےاس قول سے لگاسکتے ہیں:

زاہدہ زیدی کی ادبی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے،شاعرہ،ڈرامہ نگار،اورمترجم کی حیثیت سے ان کی تخلیقات

گراں قدر ہیں۔اوران کی حیثیت مسلم ہے۔اب تک ان کے تین شعری مجموعے منظرعام پر آچکے ہیں۔اور چوتھا اشاعت کی منزل سے گزر رہا ہے۔ان کی شاعری میں عصری آگاہی کے ساتھ ساتھ ایک کائناتی وژن بھی جاری وساری ہے۔اوران کی نظموں میں فورم کا بھی گہرا اور تراشیدہ احساس ملتا ہے۔زبان و بیان کے لطیف اور خوشگوار تجربے پیکر تراشی،علامتی اظہار اور ایک معنی آفریں استعارتی نظم ان کی شاعری کی کچھ نمایاں خصوصیات ہیں،اور جدید شاعری کے منظر نامے میں ان کی انفرادیت سے انکار ممکن نہیں۔ساتھ ہی ڈرامہ کی حیثیت سے بھی ان کا قد اپنے ہم عصر سے بلند تر ہے۔ان کے منفرد اور پر کشش ڈرامے جو''دوسرا کمرہ''اور''صحرائے اعظم'' کی صورت مین منظر عام پر آچکے ہیں۔موضوعات کی اہمیت اور مرکزیت کے ساتھ ساتھ فنی خوبیوں سے بھی آراستہ ہیں۔ماحول اور زندگی سے گہری وابستگی اور مغرب کے شاہکار ڈراموں کے وسیع مطالعہ نے ان کے ڈراموں کو تہ داری اور معنی آفرینی عطا کی ہے۔10؎

شاعری:

سب سے پہلے ہم صنف شاعری پر نظر ڈالیں۔تو ہمیں یہاں صنف غزل اور نظم دونوں میں زاہدہ زیدی کی تخلیقات نظر آئیں۔ان کی شعری تخلیقات میں مجموعہ زہرِ حیات(1970)،دھرتی کا لمس(1975)،سنگ جاں(1989)،شعلۂ جاں(2000)اور شام تنہائی(2008)شامل ہیں۔

زاہدہ زیدی نے ترقی پسند تحریک کے آخری دور میں اپنی شاعری کا آغاز کیا اور پھر جدیدیت،مابعد جدیدیت اور تانیثیت کی تحریک کا دور بھی دیکھا۔لیکن انہوں نے کسی نظریہ یا تحریک سے خود کو وابستہ نہیں کیا۔بلکہ انہوں نے خود اس بات پر زور دے کر کہا ہے کہ میری شاعری کو کسی نظریہ یا تحریک سے جوڑ کر نہ دیکھا جائے۔بلکہ تانیثیت جو کہ بیشتر خواتین کا حصہ رہی ہے۔زاہدہ زیدی نے اس سے بھی خود کو الگ رکھا۔لیکن پھر بھی ان کے یہاں ترقی پسندی اور کچھ حد تک جدیدیت کے رجحانات بھی ملتے ہیں۔شعری مجموعہ''دھرتی کا لمس'' کی بیشتر نظمیں جدیدیت سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہیں۔وصل،یاد اک سمندر،طوفان،بازدید،سفر طویل ہے،ویرانہ،تخریب کے بعد تحت الثریٰ،دھرتی کا لمس،اورادھورا نگر وغیرہ اس مجموعے کی اہم نظمیں ہیں۔

یہیں مٹا تھا وہ شہر

وہ شہر رعنا

یہیں بجھے تھے

وہ سب جگمگاتے ہوئے دریچے

یہیں وہ نغمے

بکھر کے

خاموشیوں میں تحلیل ہوگئے تھے

یہیں وہ اصنام مرمریں

ریت کا ڈھیر ہوگئے تھے

یہیں وہ سنگین جسم

لاوے سے

اور یند شعلوں سے

تشکیل ہو کے

ابھرا تھا رفتہ، رفتہ

بس ایک بار اور چوم لو

اس جراحت نصیب

کرب آشنا بدن کو

کہ کوئی زلزلہ

پھر زمین کی تہ میں

پروان چڑھ رہا ہے [11]

پروفیسر شمیم حنفی ان کی تخلیقات کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

پچھلے چالیس برسوں کے دوران میں نے انہیں ہمیشہ ذہنی طور پر سرگرم دیکھا ہے۔شاید اسی لیے ادبی نظریات کی آبادھاپی کے دور میں بھی، وہ نہ تو کسی بے معنی بحث میں الجھیں، نہ ان کے تخلیقی انہماک میں کبھی فرق آیا۔ان کی شاعری، جسے ان کی تخلیقی سرگرمی کا بنیادی حوالہ اوران کے مجموعی مزاج کی پہچان سمجھنا چاہیے، وقت کے کسی بھی مرحلے میں، یکسانیت اور تکرار کا شکار نہیں ہوئی۔ان کی فکر ایک واضح وجودی سطح رکھنے کے باوجود، اپنے گردوپیش کی دنیا اور

ماحول کی تخلیقی دستاویز بھی ہے۔جدیدیت کے انتہا پسندی کے دور میں بھی انہوں نے حقیقی زندگی کے آشوب، سیاسی اور نظریاتی اساس رکھنے والے واقعات پر اپنی توجہ قائم رکھی۔ان کی وابستگی اپنے انفرادی وجود سے رہی بھی تو اس طرح کہ عام زندگی اور زمانے کے مطالبات کا احساس مدھم نہ ہونے پائے۔''زہرحیات'' سے لے کر''شعلۂ جاں'' تک ان کی حسیت پر ٹھہراؤیا ذہنی اور جذباتی تساہلی کی ذراسی گرد بھی نہیں جمی اور''شام تنہائی'' میں زاہدہ زیدی کے تخلیقی شعور میں، آج بھی وہی حرارت اور تب وتاب موجود ہے، جس سے ان کے ابتدائی دور کی شاعری پہچانی جاتی تھی۔طنز و متانت آمیز مزاح کی ایک خلقی لہر نے زاہدہ زیدی کے انتہائی سنجیدہ شعور کو ایک نئی جہت سے ہم کنار کیا ہے۔یہ جہت انہیں اپنے پیشتر ہم عصروں سے ممیّز کرنے کے علاوہ ان کے ہمہ گیر تفکر اور ان کی گہری بصیرت کا پتہ بھی دیتی ہے۔ایک مسلسل سوچتے رہنے والا ذہن، ایک مستحکم انسانی، سروکار سے مالا مال حسیت اور ایک منظّم، تربیت یافتہ، غنائی ادراک زاہدہ زیدی کی شاعری کے نمایاں عناصر ہیں اور ان کے فنکارانہ اظہار کو ایک حقیقت پسندانہ اساس مہیا کرتے ہیں۔ہمارے عہد کا ادبی منظرنامہ زاہدہ زیدی کے نام کی شمولیت کے بغیر ادھورا رہے گا۔12ؔ

زاہدہ زیدی نے اپنی شاعری میں عصری مسائل کی بڑی حقیقی تصویر کشی کی ہے، اور ذاتی زندگی کے سکھ دکھ کو آفاقی غم میں ڈھال دیا۔ان کی شاعری داخلی تجربے کی شدت، گہرائی، گہرے وجودی اور وجدانی تجربے کا ایک علامتی منظرنامہ ہے، جس میں ماضی، حال اور مستقبل ایک نقطے پر مرتکز نظر آتے ہیں۔

آسمانوں کی محراب پر
ایک تحریر ہے نام
زیرِ زمیں
گہرے غاروں میں پوشیدہ
اک سیل نادیدہ
اور اس جوئے نادیدہ
اور اس جوئے گم گشتہ کی کھوج
میرا مقدر
مرے فن کی جوئے مسلسل
مری ہستیِ ناتمام 13ؔ

ڈراما:

شاعری کے بعد دوسری صنف سخن جس میں ان کی دلچسپی سب سے زیادہ رہی ہے وہ ڈراما ہے۔ڈرامے کی صنف سے ان کی یہ فطری دلچسپی تھی کہ انہوں نے اپنے زمانہ طالب علمی میں کالج میں پیش ہونے والے ڈراموں میں بھی اکثر و بیشتر ڈرامے میں اداکاری بھی کی۔سردار جعفری کا ''نئی دنیا کو سلام'' اور کرشن چندر کے ''ان داتا'' میں انہوں نے اہم کردار نبھایا۔اردو کے علاوہ ان پر سب زیادہ انگریزی ڈراموں کا اثر تھا وہ انگریزی ادب کی طالب علم اور پروفیسر تھیں۔انگریزی ادب سے ان کی وابستگی فطری تھی مگر اس میں بھی انہیں خاص کر ڈرامے کی صنف سے بہت لگاؤ تھا۔وہ اپنے بارے میں لکھتی ہیں:

> ڈرامے سے اس گہری وابستگی کا لازمی نتیجہ تھا کہ انگلش لٹریچر کی طالب علم اور استاد کی حیثیت سے میں نے ڈرامے پر خاص توجہ دی اور یونانی ڈرامے سے لے کر جدید ڈرامے تک ہر دور کے ڈرامائی ادب کا بغور مطالعہ کیا۔اور شیکسپیئر کو تو شروع سے آخر تک کچھ اس قدر گہرائی اور ذوق وشوق سے پڑھا کہ ایک مدت تک یہ عظیم ڈرامہ نگار میرے دل و دماغ پر چھایا رہا یہاں تک کہ خواب میں بھی اکثر خود کو شیکسپیئر کے کسی کردار ہم کلام پاتی۔لیکن پیشہ وارانہ نقطہ نظر سے میں نے جدید ڈرامے کو خاص طور سے اپنایا اور اس میں برطانوی اور امریکی ڈراموں کے علاوہ یوروپین ڈرامے کو بھی شامل کیا۔اور میرے لیے بے حد وسیع ہمہ جہت زرخیز اور مالامال علمی میدان ثابت ہوا۔جس میں نہ صرف ذہنی کشادگی اور علمی تحقیق کے بے پایاں امکان موجود تھے۔بلکہ خود میری افتادِ طبع اور تخلیقی تقاضوں سے بھی پوری طرح ہم آہنگ تھا۔14

زاہدہ زیدی کے ڈراموں کی کل تعداد 08 ہے۔ان کے طبع زاد ڈراموں کا پہلا مجموعہ ''دوسرا کمرہ (1990) ہے۔جس میں ''چٹان'' دل ناصبودارم'' دوسرا کمرہ''،اور وہ صبح کبھی تو آئے گی'' اور'' اور جنگل جلتا رہا'' شامل ہیں۔اس کے علاوہ ''صحرائے اعظم (1991)''، بہت دور تک رات ہوگی (2006) اور'' کیوں کرس بت سے رکھوں جانِ عزیز (1998)'' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔

زاہدہ زیدی نے ان طبع زاد ڈراموں کی تخلیق کے علاوہ 24/25 ڈراموں کو اسٹیج بھی کیا۔چونکہ انہیں مغربی ڈرامے سے خاصہ لگاؤ تھا۔جس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے یونانی اور مغربی کو نہ صرف پڑھا تھا بلکہ لندن

میں دورانِ تعلیم ان ڈراموں کو اسٹیج ہوتے ہوئے بھی دیکھا جس سے ان کے مشاہدہ میں بھی وسعت پیدا ہوئی۔ خلیق انجم نے ڈرامے سے ان کی وابستگی اور دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے:

> اردو ادب کی خواتین ،شاعروں،ادیبوں،نقادوں اور ڈرامہ نگاروں میں پروفیسر زاہدہ زیدی کا نام سرفہرست ہے۔ان کی ادبی فتوحات کا بڑا حصہ وہ ہے جو اردو کی کسی شاعرہ یا ادیبہ کو نصیب نہیں ہوسکا۔زاہدہ زیدی شاعرہ،ادیب،نقاد اور مترجم ہیں۔اور ہر میدان میں انہیں ممتاز حیثیت حاصل ہے۔پروفیسر زاہدہ زیدی کا اسٹیج سے گہرا تعلق ہے۔وہ چوبیس پچیس انگریزی اور اردو ڈرامے اسٹیج کر چکی ہیں۔انہوں نے ڈراموں کا اردو ترجمہ بھی کیا ہے۔15ے

خود زاہدہ زیدی اور ان کے تعلق سے لکھنے والوں کے قول سے بھی ہم اس بات کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ صنف ڈراما سے انہیں کس قدر لگاؤ اور دلچسپی تھی بلکہ اس صنف میں ان کی کوششیں کس درجہ اہم اور قابل قدر ہیں۔

تراجم:

صنف ڈراما میں ہم زاہدہ زیدی کی دلچسپی اور ان کی صلاحیتوں کے بارے میں پہلے ہی نظر ڈال چکے ہیں مگر ڈرامے سے ان کی وابستگی یہیں ختم نہیں ہو جاتی کہ انہوں نے ڈراموں کا مطالعہ ومشاہدہ کیا اور پھر انہیں لکھ کر اسٹیج کر دیا۔ بلکہ ڈراما ان کے رگ وپے میں سرایت کر چکا تھا انہوں نے مغربی ڈراموں کا مطالعہ کیا۔اس کے طرز واثرات سے اردو ڈرامے کو مالا مال کیا اور پھر ان ڈراموں کو اردو میں منتقل کر کے اردو والوں تک ان کی رسائی کو ممکن بنا دیا۔چیخوف رولوے، پرانڈیلو، سارتر، بکیٹ اور ایونیسکو کے ڈراموں کا نہ صرف مطالعہ کیا بلکہ ان کے ڈرامے انگریزی سے اردو میں ترجمہ بھی کئے۔

چیخوف کے ڈراموں کو ’’چیخوف کے شاہکار ڈرامے(1992)کے نام سے ترجمہ کیا۔اس میں انتون چیخوف کے تین ڈرامے ’’حبیب ماموں، تین بہنیں‘‘ اور ’’چیری کا باغ‘‘ شامل ہیں۔

بارتول بریخت کا ’’انصاف کا دائرہ(2002)‘‘

لوئی جی پرانڈیلو کا ’’عالم تمام حلقہ دام خیال ہے(1996)‘‘

اورسارتر، پراندیلو،بکیٹ اور اوینیسکو کے ڈراموں کو ''مسدود راہیں(1998)'' کے نام سے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔جس میں یوجین آنیسکو کے دو ڈرامے ''کرسیاں'' اور بادشاہ سلامت خدا حافظ''، مینول دی پیدرولوکا ''کمرہ''، ژال پال سارتر کا ''بند کمرہ'' اور سیمول بیکٹ کا ''شہ مات'' شامل ہیں۔

اس کے علاوہ رولومے کی نفسیاتی کتاب کا ''انسان اپنی تلاش میں(1986)'' کو اردو میں منتقل کیا۔

ناول:

ڈرامے اور شاعری کے علاوہ زاہدہ زیدی نے ناول اور تنقید کے میدان میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ اردو میں انہوں نے صرف ایک ہی ناول لکھا جو ''انقلاب کا ایک دن'' کے نام سے منظرِ عام پر آچکا ہے۔یہ ایک سیاسی اور انقلابی ناول ہے چونکہ ناول کی صنف میں بھی زاہدہ زیدی انگریزی ادب سے متاثر نظر آتی ہیں ان کا یہ ناول ورجینا وولف کے ناول ''مستقبل کے ناول'' سے ماخوذ ہے۔ڈرامائی انداز میں لکھا گیا یہ ناول چودہ پندرہ قسم کے مناظر پر مشتمل ہے اس ناول میں ڈرامائی انداز اور شعور کی رو کے علاوہ شاعرانہ عناصر سے بھی کام لیا گیا ہے۔فطرت کی عکاسی ہے۔فطرت کی عکاسی کے ساتھ کائنات کے داخلی اور خارجی مسائل کو کامیابی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے جس میں ماضی اور حال کے نقوش ابھرتے نظر آتے ہیں تو مستقبل کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔لیکن اس کے مرکزی کردار صادقہ کی سوچ اور فکر زمان ومکان کی قید سے آزاد نظر آتی ہے۔لیکن اسے حقیقت کے سرد وگرم کا احساس بھی ہے۔صادقہ کے علاوہ اس ناول کے تمام کردار جاذب اور سرگرم عمل نظر آتے ہیں جن کی مدد سے مصنفہ نے اس ناول کی فضا تیار کی ہے جو ناول کو دلچسپ بنانے اور موضوع کی وضاحت کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہے۔

اس ناول کے تعارف میں ناول کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے شہناز ہاشمی لکھتی ہیں:

> مجموعی طور پر ''انقلاب کا ایک دن'' بے حد دلچسپ اور فکر انگیز ناول ہے۔جس میں ایک پورے دور کے نقوش ابھرتے ہیں۔سب سے زیادہ جاذب توجہ خود صادقہ کا کردار ہے۔صادقہ ان انگریزی ادب میں گہری دلچسپی رکھتی ہے۔ڈرامے اور شاعری سے انہیں خاص لگاؤ ہے۔وہ کمیونسٹ پارٹی کی ایک رکن بھی ہے۔اور اپنے چاروں طرف کے حالات اور واقعات کے بارے میں سنجیدگی اور گہرائی سے سوچتی ہے۔اگر چہ اس کی سوچ زمان ومکاں کی قید سے

آزاد ہے۔لیکن اس کو زمانے کے سرد وگرم کی سوجھ بوجھ اور کشاکش جذبات کا احساس بھی ہے۔صادقہ کے تخیل کی پرواز بے کنار ہے۔لیکن ساتھ ہی وہ حقیقت کی دنیا سے بھی آشنا ہے۔انسانی رشتوں کی نزاکتیں اور لطافتیں مصنفہ نے صادقہ کی زباں اور سرگرمیوں کے ذریعہ بڑی خوبی سے پیش کی ہیں۔استاد اور شاگرد کے رشتے، بزرگوں اور نوجوانوں کے رشتے، دوستوں اور ط ہم عصروں کے رشتے اور ساتھ انسان اور سماج کی وابستگی، انسانی خیالات پر مناظر فطرت کے اثرات، یہ سب چیزیں بہت ہی سیر حاصل طریقے سے اجاگر کی گئی ہیں۔16

تنقید:

تنقید میں بھی ان کی کئی تصانیف ملتی ہیں ایک ''رموز فکر وفن (1993)'' جس میں زاہدہ زیدی نے میر انیس، علامہ اقبال، اختر الایمان، مخمور سعیدی اور رفعت سروش کی شاعری کا تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے اور ساتھ ہی ان حضرات کی شاعری میں ڈرامائی عناصر کی نشاندہی کی ہے کیوں کہ زاہدہ زیدی کا خیال تھا کہ شاعری ڈرامے سے الگ نہیں شاعری اور ڈرامے کا ایک دوسرے سے گہرہ تعلق ہے اور ہمیں ہر بڑے شاعر کی شاعری میں ڈرامائی عنصر ضرور دیکھنے کو ملے گا۔یہی وجہ ہے انہوں نے اپنے تنقیدی خیالات میں ڈرامے کو اہمیت دی ہے۔زاہدہ زیدی نے انہیں دو اصناف میں خاص توجہ بھی کی ہے ان کی شاعری اور ان کی ڈرامہ نگاری ایک دوسرے سے ہم آہنگ بھی ہیں۔

اس کتاب میں کل نو مضامین شامل ہیں:

1۔میر انیس کی شاعری میں ڈرامائی عناصر

2۔کلام اقبال کی عصری معنویت کے چند پہلو

3۔اردو ڈراما آزادی کے بعد

4۔خواجہ احمد عباس: سوانحی اور تنقیدی جائزہ

5۔اختر الایمان کی شاعری میں داستان حسن وعشق

6۔اختر الایمان کی شاعری کا فکری وفنی جائزہ

7۔مخمور سعیدی کی شعری کائنات

8۔رفعت شروس کے منظوم ڈرامے اور

9۔سلیمان اریب: کبھی اک چیخ تھا اب خامشی ہوں

اس کے علاوہ ان کی دوسری کتاب ’’جدید مغربی ڈرامے کے رجحانات (1997)‘‘ کے نام سے ہی واضح ہے کہ یہ کتاب بھی ڈرامے کی تنقید سے متعلق ہے لیکن اس کتاب میں زاہدہ زیدی نے مغربی ڈرامے کے اصول وضوابط بیان کئے ہیں۔انہوں ں نے یونانی ڈرامے اور الزبیتھن کے دور سے جدید دور تک کے ڈرامے کی اہمیت ،خصوصیت،فورم اور تکنیک کو بیان کرنے کے ساتھ ڈرامے کی مختلف تحریکات اور جدید تھیٹر کے اسلوب اور ترسیلی امکانات پر بھی تفصیل سے گفتگو کی ہے اور ایک ہمہ گیر تہ دار اظہاریت سے بھر پور تھیٹر کا تصور پیش کیا ہے. جس سے زاہدہ زیدی کی مغربی ادب کی گہری معلومات ،مطالعہ اوران کے وسیع مشاہدہ کا اندازہ ہوتا ہے۔

’’لذت آشنائی (2003)‘‘ یہ بھی زاہدہ زیدی کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔اس میں بھی انہوں نے مختلف شعراء کے کلام کا جائزہ لیا ہے۔اور مشاہدہ ومطالعے اور بصیرت سے فرداًفرداً ان کے کلام کی خصوصیات کوواضح کیاہے،اس میں انہوں نے مندرجہ ذیل شعراء کےکلام پر تبصرہ کیا۔

01۔غالب کی شاعری کی عصری معنویت کے چند پہلو(اردوغزل کے آئینے میں)

02۔اقبال کی شاعری کےاسرار ورموز

03 ۔فیض احمد فیض کی شاعری میں جذبہ وفکر کا توازن

04۔سردار جعفری کی شاعری میں پیکر تراشی کی معنویت

05۔سردار جعفری کی شاعری کی فکری اورفنی جہات

06۔نئی دنیا کوسلام ۔۔کا ڈرامائی اسٹرکچر

07۔وحید اختر کے مراثی میں عصری اور آفاقی بصیرتوں کی بازیافت

08۔آزادنظم: تفاعل اورامکانات

08۔عصری غزل کا منظر نامہ

09۔انور عظیم: یادیں اور تاثرات

10۔جھلتے جنگل: ایک مطالعہ

11۔مرنے والوں کی جبیں روشن ہے۔اس ظلمات میں (جگن ناتھ آزاد کے چار شخصی مرثیے) شامل ہیں۔

''دردِ تہِ جام(2010)'' بھی زاہدہ زیدی کے تنقیدی مضامین شامل ہیں۔اس کتاب میں بھی کل تیرہ۔مضامین پر زاہدہ زیدی نے روشنی ڈالی ہے۔جن کی فہرست درج ذیل ہے۔

1۔مرزا غالب کی شعریات

2۔اقبال کی شاعری میں فطرت اور فن کی کارکردگی

3۔حالی کے سیاسی اور سماجی افکار

4۔مسدس حالی اور شکوہ و جواب شکوہ

5۔مخدوم محی الدین کی شاعری میں رومانوی حسیت اور انقلابی آئیڈلزم

6۔معین احسن جذبی کی نظم نگاری

7۔علی سردار جعفری کی عشقیہ شاعری

8۔منیب الرحمن کی شاعری کی اہم جہات

19۔میدان عمل۔۔۔۔میں فیصلے اور انتخاب کی اہمیت

10۔انقلاب۔۔۔سیاسی پس منظر میں ایک پرسنل ناول

11۔چاندنی بیگم،ایک ہمہ جہت ناول

12۔قرۃ العین کے فکشن میں عورتوں کے کردار۔۔۔دومختصر ناولوں کے حوالے سے اور

13۔پیغام آفاقی کے ناول ''مکان'' کا تانیثی کردار

زاہدہ زیدی کی ان تخلیقات کا جائزہ لینے کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان کی تخلیقات و تصانیف کا حلقہ کافی وسیع ہے۔انہوں نے اردو ادب کی تقریباً تمام اصناف میں اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے جن سے اردو ادب میں کئی اہم اضافے ہوئے ہیں اور ادب کے شائقین کے لیے بھی قیمتی سرمایہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔آئندہ اس مقالے میں ان کی ان تصانیفات وتخلیقات اور مختلف اصناف میں ان کی ادبی کاوشوں پر تفصیلی،تحقیقی اور تنقیدی روشنی ڈالی جائے گی۔اور ان کی تخلیقات کے پس منظر میں اردو ادب میں ان کے مقام

ومرتبے کا تعین بھی کیا جائے گا۔

حوالے:

1۔ ساجدہ زیدی،نوائے زندگی،اردو اکادمی،دہلی،2012،ص،37

2۔ ایضاً،ص،31-32

3۔ ایضاً،ص،31

4۔ ایضاً،ص،47-48

5۔ ایضاً،ص،158-159

6۔ ایضاً،ص،168

7۔ ایضاً،ص،166

8۔ رسالہ آج کل،ماہ نامہ جون،نمبر11،ص،04،2011

9۔ رسالہ آج کل،ماہ نامہ جون،نمبر11،ص،05،2011

10۔ زاہدہ زیدی؛کیوں کر اس بت سے رکھوں جان عزیز،دہلی:ایجوکیشنل پبلی شنگ ہاؤس،1998ء،مصنفہ کا تعارف،اسلوب احمد انصاری

11۔ زاہدہ زیدی؛دھرتی کالمس،علی گڑھ:لیتھوکلر پرنٹرس،1975ء،تخریب کے بعد،ص،45/56

12۔ زاہدہ زیدی؛شامِ تنہائی،نئی دہلی:انجمن ترقی اردو ہند،2008ء،تعارف،شمیم حنفی

13۔ زاہدہ زیدی؛لذتِ آشنائی،علی گڑہ،آبشار پبلیکیشنز،2003ء،،داخلی منظر،ص،44

14۔ زاہدہ زیدی؛دوسرا کمرہ،علی گڑھ:آبشار پبلی کیشنز،1997ء،ص،5-6

15۔ زاہدہ زیدی ؛انتون چیخوف کے شاہکار ڈرامے،نئی دہلی :انجمن ترقی اردو ہند،1992ء،حرف آغاز، ص،11-12

16۔زاہدہ زیدی؛انقلاب کا ایک دن،نئی دہلی:ایجوکیشنل پبلی شنگ ہاؤس،1996ء،حرف آغاز،شہناز نبی،ص،7-8

☆☆☆

باب دوم
زاہدہ زیدی کی نظم نگاری اور غزل گوئی

نئی شاعری کی اصطلاح خاص طور سے 1960 کے بعد کی شاعری (غزل اور نظم) کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔جس کے لیے کہا جاتا ہے کہ نئی شاعری میں تہذیب کی شکست وریخت، ماضی کا المیہ، سیاسی، معاشی، معاشرتی تضادات وفرقہ وارانہ فسادات،تنہائی، مایوسی،غریب الوطنی، ذات کا کرب،قدرتی نظام کے بکھرنے کا غم اور معاشرتی نظام سے ردوعمل کی تحریک ہے۔اس دور میں نہ صرف نئی شاعری کے فورم میں تبدیلیاں نظر آئیں گی۔ بلکہ اس کے لسانی ڈھانچے میں بھی تبدیلیاں ہونے لگی تھیں۔الفاظ اگرچہ وہی تھے لیکن ان کے معنی بدلنے لگے تھے۔اور نئی نئی علامتوں اور تشبیہوں کا نمونہ بھی پیش کیا جانے لگا تھا۔اس کے علاوہ سائنس اور ٹکنالوجی کی روز بروز بڑھتی ہوئی ترقی نے انسان کو ایک مشین کی طرح اور مشین پر کام کرنے کا عادی بنادیا گیا تھا۔جس کے بدلتے ہوئے پس منظر میں انسان خود کو اکیلا اور تنہا محسوس کرنے لگا اور خود کو سماج سے کٹا ہوا پانے لگا۔جس کا اثر فنکاروں پر بہت زیادہ پڑا ان کا یہ کرب اس دور کی شاعری میں نظر آنے لگا۔جس کے نتیجے میں نئی نئی صنعتیں اور اصطلاحیں وضع کی جانے لگیں۔تاکہ وہ اس نئے تشکیل کردہ معاشرے اور اس میں رونما ہونے والی تبدیلیوں اور رجحانات کی درپردہ عکاسی کرسکیں۔اس دور کی شاعری میں کچھ اس طرح کے اشعار سامنے آئے:

ساری بستی ہماری جلا دی گئی
بے گناہی کی کیسی سزا دی ہے

(راشد صدیقی)

ہم دشت کربلا میں سدا تشنہ لب رہے
بہتا تھا گرچہ پاس ہی دریا فرات کا

(مخمور سعیدی)

ویراں ہے شہر سارا باقی کھنڈر رہے ہیں
سہمے ہوئے ہیں کتے لاشوں سے ڈر رہے ہیں

(محمد علوی)

سرد لبوں پر چیخیں نیلی نیلی ہوکر بیٹھ گئی ہیں
برفیلی نظروں سے مجھے گھورے ہی جاتا ہے سناٹا
اپنی اپنی لاش اٹھائے لوگ گھروں کو لوٹ گئے سب
خون میں ڈوبی کچلی سڑکیں چاٹے جاتا ہے سناٹا

(بلقیس ظفیر الحسن)

اس طرح کی لاتعداد غزلیں ہیں جو موجودہ عہد کی نمائندگی کرتی ہیں۔ساتھ ہی اس طرح کی بے شمار نظموں میں بھی شاعروں نے انہیں سب موضوعات کو پیش کیا ہے۔

نظم:

اردو شاعری میں نظم کی صنف کوئی نئی نہیں ہے۔ بلکہ یہ کہا جائے کہ اردو شاعری کا ابتدائی سرمایہ نظم کی ہیت میں ہے تو یہ غلط نہیں ہوگا مثنوی، مرثیہ، قصیدہ، ہجو، شہر آشوب، رباعی، مخمس، مسدس، ترجیح بند ترکیب بند غرض کہ کوئی بھی مسلسل خیال کے لیے نظم ہی کا استعمال کیا جاتا تھا۔لیکن نئی نظم کا آغاز آزاد اور حالی کی انجمن پنجاب 1867 سے ہوتا ہے۔ایک طرف محمد حسین آزاد نے نظم کے باب کو فروغ دیا وہیں حالی نے مقدمہ شعروشاعری میں غزل کے مقابلے میں نظم کی پرزور حمایت کی ہے۔اور ایک مسلسل خیال اور اپنی بات کو وضاحت کے ساتھ پیش کرنے کے لیے نظم کی صنف کو زیادہ کارآمد بتایا ہے۔

چونکہ 1857 کی تحریک آزادی کی ناکامی کے بعد ہندوستان میں جب سماجی اور معاشرتی زندگی میں مغرب کی تقلید شروع ہوئی تو ادب بھی اس روایت کو فروغ ہوا اور اردو ادب میں بھی انگریزی ادب کے زیر اثر

تبدیلی آنا شروع ہوئی اور اردو ادب نئے زاویوں سے رونما ہوا۔ اور اب نظم میں بھی پرانی ہیت کے برعکس نئے تجربے ہونے لگے۔ آزاد، حالی، اسماعیل میرٹھی اور نظم طباطبائی اس میدان میں پیش پیش نظر آئے۔ نظم کی مروجہ ہیئتوں کے برعکس نظم کے لیے ردیف وقافیہ کی پابندی سے انحراف ہونے لگا۔ بنا ردیف وقوافی کی نظمیں کہنے کی کوشش کی جانے لگی۔

لیکن اس وقت تک بھی نظم کی ہیئت میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی۔ اکبرالہ آبادی، حالی، شبلی، چکبست، سرور جہاں آبادی اور تلوک چند محروم وغیرہ نے حب الوطنی، قومی اور وطنی نظمیں ضرور کہیں ہیں مگر نظم کی ہیئت میں باقاعدہ تبدیلی عبدالحلیم شرر کی ''نظم معریٰ'' کی تحریک سے ہوتی ہے۔ جو انہوں نے اپنے رسالہ ''دلگداز'' کے ذریعہ شروع کی تھی۔ اس رسالے سے نظم کی ایک فورم اسٹینزا کی شروعات ہوتی ہے۔ یہ چار مصرعوں کے قطعے کی صورت میں تھی، اس دور کے دوسرے رسائل میں بھی نظم کی اس ہیت پر بحثیں شروع ہوئیں، شیخ عبدالقادر نے اپنے رسالے ''مخزن'' سے اس کی طرف خاص توجہ دی۔

اس عہد میں انگریزی نظموں کے ترجمے کا بھی رواج ہوا۔ نظم طباطبائی، محمد حسین آزاد، پنڈت دتاریہ کیفی، محمود خاں شیرانی، حسرت موہانی وغیرہ نے انگریزی ادب کی بیشمار نظموں کے ترجمے کئے۔ اس عہد میں اقبال کی نظمیں فکری وفنی لحاظ سے خاص سے خصوصیت کی حامل ہیں۔ عظمت اللہ خاں کا نام بھی نظم کی ہیئت واسلوب کے تجربے میں اہم ہے۔ وہ غزل کے سخت مخالف تھے۔ انہوں نے نظم نگاری کی ہیت اور اسلوب میں نئے نئے تجربے کئے۔ ہندی بحروں کو اردو میں داخل کیا اور عربی وفارسی اسلوب کی جگہ ہندی پنگل کو جگہ دی۔ عظمت اللہ خاں کی نظموں سے فائدہ اٹھا کر میراجی اور ن۔ م راشد نے آزاد نظم کی روایت کو آگے بڑھایا۔

1936 کی ترقی پسند تحریک کے زیراثر نظم میں ایک انقلاب برپا ہو گیا تھا، ایک طرح سے قومی وانقلابی نظمیں کہنے کا سلسلہ رواں دواں تھا، ترقی پسند تحریک نے نظم میں فن وتکنیک کے نئے نئے تجربے کئے جس سے نظم کی مختلف ہیتیں سامنے آئیں، نظم معریٰ، آزاد کے علاوہ ایسی بھی نظمیں کہی گئیں، جن میں صرف خیال کو تسلسل کے ساتھ پیش کر دیا جاتا تھا۔ مغرب کے زیر اثر انہوں نے کبھی تین تین اور کبھی چار مصرعوں کی جاپانی نظمیں بھی کہیں۔ اس طرح اب اردو نظم میں نظم معریٰ اور آزاد کے علاوہ جدید نظم کی مختلف ہیتیں موجود ہیں۔

جدید اردو نظم کا دامن مرد وخواتین فنکاروں کے ہاتھوں وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔ان فنکاروں میں جوش،فراق گورکھپوری،معین احسن جذبی،سردار جعفری،فیض احمد فیض،اختر الایمان،وامق جونپوری،جاں نثار اختر،منیب الرحمٰن،وحید اختر،خلیل الرحمان اعظمی،شہاب جعفری،عمیق حنفی،شہریار وغیرہ۔وہیں اگر خواتین شاعروں کا نام لیا جائے تو ان میں کشور ناہید،فہمیدہ ریاض،زہرہ نگار،شاہدہ حسن،سارا شگفتہ،پروین شاکر،فاطمہ حسن،عذرا عباس،تنویر انجم،رفیعہ شبنم عابدی،شبنم عشائی،ادا جعفری،شفیق فاطمہ شعریٰ،نسرین انجم بھٹی،بلقیس ظفیر الحسن،ساجدہ زیدی اور زاہدی زیدی وغیری خاص اہمیت کی حامل ہیں۔

نظم شاعرات کی پسندیدہ صنف رہی ہے۔جہاں انہیں اپنے جذبات وتاثرات اور خیالات کو واضح انداز میں پیش کرنے کا موقعہ ملتا ہے۔اردو کی تقریباً تمام شاعرات نے اس میدان اپنے گہرے نقوش چھوڑے ہیں اور اپنی فکر سے نظم کی صنف میں وسعت پیدا کی ہے۔جہاں تک زاہدہ زیدی کا تعلق ہے انہوں نے غزل اور نظم دونوں صنف سخن میں اپنی تخلیقی صلاتیوں کا مظاہرہ کیا ہے۔لیکن غزل کے مقابلے میں ان کی نظموں کا پلہ بھاری نظر آتا ہے۔جہاں انہوں نے اپنے ذاتی اور خارجی تجربات واحساسات کی عکاسی نادر تشبیہوں اور استعاروں کے ذریعہ کی ہے۔اور آزاد نظم کی فورم کو بذیعہ وسیلہ استعمال کیا۔

آزاد نظم:

اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اردو میں جدید نظم اور نظم کی اقسام کی ابتدا مغرب کے زیر اثر ہوئی ہے۔چاہے وہ پابند ہو،نثری ہو،معریٰ ہو یا پھر آزاد۔آزاد نظم بھی اردو میں انگریزی ادب کے توسط سے ہی آئی ہے۔غیر مساوی اور غیر مقفیٰ مصرعوں پر مشتمل اس شعری ہیت کو انگریزی میں فری ورس کہا جاتا ہے۔جدید نظم کی یہ قسم پہلے انیسویں صدی میں فرانسسی اور پھر بیسویں صدی میں انگریزی ادب میں منظر عام پر آئی۔آزاد نظم قدیم اصناف واسالیب نظم سے بغاوت اور ایسے شعری تجربے کی جستجو کا نتیجہ تھی جو زمانے کی تیز رفتاری کا ساتھ دے سکے۔اسی لیے اس کو anty traditinal movement بھی کیا جاتا ہے۔شیخ عبدالقادر نے اپنے رسالے ''مخزن'' سے اس کی طرف خاص توجہ دی۔

آزاد نظم میں بحر اور قافیہ کی روایتی پابندیوں کے برعکس اس نظم کی بنیاد اس نظریہ پر رکھی گئی ہے کہ اس کا

سارا انحصار موضوع پر ہوگا نہ کہ ہیت پر۔اس نظریہ سے اس صنف کو بحور وقوافی کی روایتی پابندیوں سے نجات ملی۔کیوں کہ اس پہلے نظم معریٰ میں اگر چہ قوافی کی پابندی نہیں تھی مگر بحر اور وزن کا خیال رکھا جاتا تھا جس سے آزاد نظم کو بالکل نجات مل گئی۔اب اس نظم کے ذریعہ ہمارے شاعروں نے موضوع کے آزاد اظہار و ابلاغ کے لیے خود کو آزاد محسوس کیا۔اور انہیں قوافی و بحور سے مکمل آزادی حاصل ہوگئی۔آزاد نظم پر کسی بھی قسم کی خارجی پابندی کو نہیں لگایا جاتا۔خیال اور جذبہ کا داخلی آہنگ اور ترنم ہی شاعری کی بنیاد قرار دیا جاتا ہے۔

اردو میں اگر آزاد نظم کی ابتدا کی بات کی جائے تو اس کے علمبردار ن۔م راشد اور میرا جی ہیں۔ن۔م راشد کی ''ہونٹوں کا لمس''، میرا جی کی ''رس کی الوکھی لہریں'' وغیرہ اسی قبیل کی نظمیں ہیں۔ان کے علاوہ سردار جعفری کی ''ایشا جاگ اٹھا'' بھی شامل ہے۔اس کے بعد جن شعراء نے اس نظم میں اپنے قلم کے جوہر دکھائے ان میں یوسف ظفر، قیوم نظر، قاضی سلیم، رفعت سروش، مجید امجد، ضیا جالندھری، مخدوم محی الدین، اختر الایمان، فیض، منیب الرحمان، خلیل الرحمان اعظمی ،بلراج کومل، مخمور سعیدی، کمار پاشی، زبیر رضوی، شمس الرحمان فاروقی، عمیق حنفی، وحید اختر اور شہر یار کے نام قابل ذکر ہیں۔ان کے پہلو بہ پہلو شفیق فاطمہ شعریٰ، ساجدہ زیدی اور زاہدہ زیدی کے نام شامل ہیں۔

زاہدہ زیدی کا نام بھی ان فنکاروں میں شامل ہے جنہوں نے آزاد نظم کے دامن کو وسیع کرنے میں نمایاں مقام حاصل کیا۔انہوں نے اپنے شعری اظہار کے لیے نظم کی جس فورم کا استعمال کیا وہ آزاد نظم ہی ہے۔اگر چہ انہوں نے ابتدا میں کچھ پابند نظمیں بھی کہیں لیکن ان کی نظموں کی بڑی تعداد آزاد نظم کی ہیت میں ہی ہے۔ان کی پہلی آزاد نظم ''اندھیرا'' کے عنوان سے شائع ہوئی تھی۔جو ان کے شعری مجموعہ ''زہر حیات'' میں شامل ہے۔اس مجموعے کی دوسری آزاد نظموں میں تنہائی، خزاں، صحرا اور سمندر، موت، دیوان خاص، فاصلے، زہر حیات، دن کا کرب، چٹانوں کے بدن وغیرہ، اور بھی بے شمار آزاد نظمیں جو ان کے کلیات میں شامل ہیں۔جیسے وصل، تحت الثریٰ، سمندر کا انتم بلاوا، حرف وصوت وصدا، داخلی منظر متلاش، وہ اک نحیف سی صدا، سنگ جاں اور شعلۂ جاں وغیرہ۔وہ اپنی آزاد نظموں کے متعلق لکھتی ہیں:

داخلی تجربات اور بصیرتوں کے ساتھ ساتھ خارجی ماحول اور مسائل بھی مجھے گہرے طور پر متاثر کرتے رہے ہیں، اور

ان کے اظہار کے لیے بھی میں نے آزادنظم کوایک نہایت موثر پیرایہ اظہار پر پایا ہے۔اور میری متعدد نظمیں جن میں خارجی ماحول اوراہم ترین عصری مسائل کاعکس ہے۔بھی آزادنظم ہی کے طور پر وجود میں آئیں۔اوران میں ''زہر کی لہر،کربلا،فردوس گمشدہ،آگ،سیاہ سوراخ،محشر اور کئی دوسری نظمیں شامل ہیں۔جو شدت فکرواحساس میں ایک دوسرے سے قریب تر لیکن فورم اور تکنیک کے اعتبار سے مختلف اور منفرد ہیں۔تجربہ اور فورم ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں اور ہر اچھی اور معتبر نظم اپنے مخصوص فورم،امیجری اور شعری آہنگ کے ساتھ ہی وجود میں آتی ہے۔اور یہ بات آزادنظم کے لیے زیادہ اہم ہے جس کا ہر سانچہ منفرد ہوتا اور جس کی معنویت اس کے تراشیدہ پیکر اور اس کے رمزوآہنگ ہی کی مرہون منت ہوتی ہے،اور میں نے اپنی ہر آزادنظم کوایک ایسے منفرد فورم میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے جواس کے گہرے جذبات اور فکری عناصر کونہایت اختصار کے ساتھ منعکس کر سکے۔1

جہاں تک زاہدہ زیدی کی ہم عصر شاعرات کا تعلق ہے تو ان کا مختصر تعارف یہاں شامل کیا جا رہا ہے تا کہ ان کی معاصر شاعرات کے فکری وفنی خیالات سے آگاہی حاصل کی جائے اور ساتھ ہی ان میں زاہدہ زیدی کے کلام کی انفرادیت کا جائزہ بھی لیا جاسکے۔

اردوشاعرات:

1۔فہمیدہ ریاض۔

فہمیدہ ریاض نے اردونظم اور غزل دونوں میں طبع آزمائی کی ہے۔انہیں جدید شاعرات میں اپنے باغی لب ولہجے کی وجہ سے جانا جاتا ہے۔ان کے یہاں حقوق نسواں کی حمایت کا بے خوف انداز ملتا ہے۔اوراس مرداساس معاشرے میں عورت کی بے وقعتی اور مظالم کے خلاف انہوں نے بے خوف آواز اٹھائی ہے۔فہمیدہ ریاض کی شاعری میں داخلی اور خارجی عنصر کا امتزاج دیکھنے کو ملتا ہے۔جہاں ان کی شاعری میں ایک طرف حقوق نسواں،عورت کی نفسیات،اس کے مسائل،احساسات،تجربات،عورت کے جذبوں اور خاص کر پاکستان کی عورت پر مذہب کی آڑ میں پابندی،کی عکاسی ملتی ہے۔وہیں خارجی دنیا کے تمام پہلوؤں سیاست،معاشرت اوراس سے پیدا ہونے والے تمام مسائل کا احاطہ ملتا ہے۔

فہمیدہ ریاض کا تخلیقی سفر 1960 کے آس پاس شروع ہو جاتا ہے۔ان کا پہلا شعری مجموعہ ''پتھر کی

زبان(1968)'' ہے۔ جو منظر عام پر آیا۔ ان کے اس مجموعے میں کچھ مایوسی سی چھائی ہوئی نظر آتی ہے۔ لیکن امید و بیم کی ایک کرن بھی اس دور کی نظموں میں ملتی ہے۔ اس مجموعے کی نظموں میں لمبے سفر کی منزل، گڑیا اور زادِ راہ اہم ہیں۔

نہ امید نہ کوئی سہارا
بغاوت کی ہمت نہ کوشش کا یارا
مری بے بسی مجھ پہ ظاہر ہے لیکن
تمہاری تمنا! تمہاری تمنا!

(تمنا، پتھر کی زبان)

اس کے برعکس ان کا دوسرا شعری مجموعہ ''بدن دریدہ (1973)'' میں ان کی شاعری اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔ جہاں انہوں نے عورت کی نفسیات، اس کے دکھ درد، اس کی گھٹن اور جنسی مسائل کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ پروفیسر نجمہ رحمانی اس مجموعے پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> عورت اس کی زندگی۔ جنسی مسائل اور گھٹن کے جیتے جاگتے مرقعے ''بدن دریدہ'' کے صفحات پر بکھرے ہوئے ہیں۔ یہاں انہوں نے رسمی حیا کی وہ چادر سر سے اتار پھینکی ہے جو خود پر ہونے والے مظالم پر اس کی زبان کو کھلنے سے روک رہی تھی۔ ان نظموں میں سیدھے سادھے جنسی تجربات بھی ہیں۔ male dominated سماج میں عورت کی بے وقعتی پر گہرے طنز کے ساتھ مردوں کے لیے ایک challenge بھی۔ اظہار میں یہ جسارت آمیز رویہ فہمیدہ ریاض سے قبل شاید کسی دوسری شاعرہ نے انہیں اپنایا۔2ے

ان شعری مجموعوں کے علاوہ بھی ان کے دوسرے مجموعے ،دھوپ1975، حلقہ میری زنجیر کا1979، کیا تم پورا چاند نہ دیکھو گے 1981 (نثری نظم)، اپنا جرم ثابت ہے 1987، ہم رکاب 1987 اور آدمی کی زندگی2000، بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کی شاعری سے نہ صرف اپنے ارد گرد معاشرے میں ہو رہے عورت کے خلاف مظالم یا جنسی و سیاسی صورت حال کو ہی پیش نہیں کرتی ہیں بلکہ سماجی نظام میں سماج اور ثقافتی دونوں سطحوں کی صورت حال کی پردہ دری کرتی ہیں۔

شاعری کے علاوہ فہمیدہ ریاض کا ناول ''گوداوری 1987'' اور افسانوی مجموعہ'' خط

رموز2001''اور ایک نثری تصنیف ''پاکستان۔لٹریچر اینڈ سوسائٹی'' کے نام سے ہے۔

2۔کشور ناہید۔

پاکستانی شاعرات کی صف اول میں کشور ناہید کا شمار ہوتا ہے۔کشور ناہید 1940 میں یو پی کے بلند شہر میں پیدا ہوئیں۔کشور ناہید اگر چہ ایک قدامت پرست روایتی گھر میں پیدا ہوئی تھیں۔کشور ناہید نے شاعری کی دونوں صنف یعنی نظم اور غزل میں طبع آزمائی کی ہے۔لیکن ان کی شاعری روایت سے بغاوت، احتجاج اور غم وغصے کا عنصر نمایاں ہے۔اور انہوں نے اپنی شاعری میں ایسے نسوانی جذبات اور مسائل کا اظہار کیا ہے جنہیں ان سے پہلے کسی عورت کے لیے بیان کرنا بھی معیوب سمجھا جاتا تھا۔وہ سماج میں عورت کے ساتھ ہونے والی معاشرتی ناانصافیوں کے بالکل خلاف ہیں۔اور انہیں اپنی شاعری میں بھی برملا بیان کر دیتی ہیں۔ان کی شاعری میں عورت کا مکمل وجود اور اس کی آواز سنائی دیتی ہے۔وہ نئے سماج اور نئی فکر کی پروردا ہیں۔

کشور ناہید نے اپنی تخلیقی زندگی کا آغاز کالج میں زیر تعلیم ہی کر دیا تھا۔۔کشور ناہید نے شاعری کی دونوں صنف یعنی نظم اور غزل میں طبع آزمائی کی ہے۔یہاں ان کی غزلوں پر ہماری توجہ مرکوز رہے گی۔ان کا پہلا شعری مجموعہ''لب گویا1968'' ہے۔اس میں ان کی عنفوان شباب کی شاعری نظر آتی ہے۔جو عشق اور اس کے ناپختہ احساس سے لبریز ہے۔اسی کے ساتھ اس میں احتجاج کی کیفیت بھی نظر آتی ہے۔اس مجموعے میں شامل ان کی غزلوں کے کچھ اشعار:

بچھڑ کے ملنے میں لذت سہی مگر ناہید
کبھی تو وصل مسلسل کا ہی عذاب تو دے
خوبی ہے لاکھ وصف تحمل تشکیب غم لیکن نگار شوق پذیرائی چاہے ہے
صحبتیں خوب ہیں خوش وقتی غم کی خاطر
کوئی ایسا ہوا جسے جان و جگر سے چاہوں

کشور ناہید کی زیادہ تر شاعری عورت کے احتجاج، اس کی فکر، اس کی سوچ، عورت کا معصومانہ پن اور اس کی مرد اساس سماج سے بغاوت ہے۔ساتھ ہی اس کی بہادری، اس کی ہمت، اس کے حوصلے اور اس کی خود مختاری کا بھی ذکر ملتا ہے۔کشور ناہید کی غزلیہ شاعری میں نسوانی مزاج کے ساتھ ساتھ اس عہد کا کرب بھی ملتا

ہے۔ جو غزل کے فنی امکان کے ساتھ جدید تخلیقی حسیت کا احساس بھی ملتا ہے۔ وہ اگر حقوق نسواں کی علمبردار ہیں تو وہ ارباب اقتدار کے جبر و تشدد کے خلاف بھی آواز بلند کرتی ہیں:

طلب کی پیاس کو پھولوں میں بانٹ دیتا تھا
وہ خواب میں بھی مرے لب پہ اوس رکھتا تھا
بندھے ہیں پیٹ سے بچے بھی اور پیسے بھی
زمیں کی بیٹی کی تصویر دیکھ کر جانا

کہنا بھی ناروا ہے سو کہتا نہیں کوئی   اب تو بدن کے جلنے کی بو شہر بھر میں ہے

ان کی شعری تخلیقات میں باد خرابہ، دشت قیس میں لیلیٰ، گلیاں دھوپ دروازے، رات کے مسافر، ورق ورق آئینہ وغیرہ شامل ہیں۔

3۔ پروین شاکر۔

پروین شاکر اردو شاعری میں اپنے منفرد لب و لہجے کی وجہ سے جانی جاتی ہیں۔ پروین شاکر کی شاعری کا موضوع عورت اور محبت ہے۔ محبت اردو شاعری کا زمانہ قدیم سے محبوب موضوع رہا ہے پروین شاکر نے بھی محبت کے بدلتے رویوں کو مختلف انداز سے پیش کیا ہے۔ انہوں نے اپنے پہلے شعری مجموعے ''خوشبو 1976'' میں ایک نازک لڑکی کے جذبات و احساسات کو بیان کیا ہے۔ اور اس نوجوان لڑکی کی آرزوئیں، خواب اور خواہشوں کی تصویر کشی کی ہے۔

رات بھر میں نے کھلی آنکھوں سے سپنا دیکھا
رنگ وہ پھیلے کہ کھلی آنکھوں سے چرائے نہ گئے

جاگ اٹھتی ہیں عجیب خواہشیں انگڑائی کی   اب بھی برسات کی راتوں میں بدن ٹوٹتا ہے

چلنے کا حوصلہ نہیں رکنا محال کردیا
عشق کے اس سفر نے تو مجھ کو نڈھال کر دیا

(خوشبو)

انہوں نے نظم اور غزل دونوں میں بہترین شاعری پیش کی ہے۔ ان کے دوسرے شعری مجموعوں

میں صد برگ 1989،خود کلامی 1990،انکار 1990،ماہ تمام 1994 ہیں۔مجموعہ کلام ''خوشبو'' کے برعکس ''صد برگ'' اور خود کلامی'' میں زندگی کا الھڑ پن کسی قدر کم نظر آتا ہے اور یہاں ان کے شعور میں پختگی دیکھنے کو ملتی ہے۔یہاں سیاسی اور سماجی رنگ میں نمایاں ہے۔اور اب وہ عورت کے دل اور محبت سے نکل کر گھر آنگن ،ازدواجی زندگی ،نفسیاتی الجھنوں اور خارجی معاملات بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔

عشق نے سیکھ ہی لی وقت کی تقسیم کہ اب وہ مجھے یاد تو آتا ہے مگر کام کے بعد

وہ مجبوری نہیں تھی یہ اداکاری نہیں ہے
مگر دونوں طرف پہلی سی سرشاری نہیں ہے

(صد برگ)

پروین شاکر کی شاعری میں عورت کے مسائل اور اس کے جذبات واحساسات کے علاوہ اپنے دور کے سیاسی سماجی حالات کا بھی ذکر ہے۔جس کو انہوں نے دوٹوک انداز میں پیش کر دیا ہے۔اس کے علاوہ انہوں نے بے رحم حقیقتوں اور سفاکیوں کی پردہ دری کی ہے۔مگر ان کی بیش تر شاعری ان کے ذاتی جذبات واحساسات کی عکاسی کرتی ہے۔جس کو وہ آفاقی منظر میں سمو دیتی ہیں۔اس پس منظر میں انہوں نے جدید عورت کی ترجمانی کر کے اس کے ذہن فکر اور احساس کو بیان کیا ہے۔اور مرد اساس معاشرے کے ان خود ساختہ اصولوں کے خلاف بھی آواز بلند کی ہے جس نے عورت کو رسم ورواج کی فرسودہ دیوار میں قید کرتے ہیں۔وہ کہتی ہیں:

میں نے آئینے کو کب جھٹلایا
ہاں گہنے مجھ پر بھی اچھے لگتے ہیں
لیکن جب مجھ کو ان کا مول کبھی یاد آتا ہے
کنگن بچھو بن جاتے ہیں
اور پازیبیں ناگ کی صورت میرے پاؤں جکڑ لیتی ہیں
بہت سے میٹھے بولوں اک جزو اعظم
جب حالت خام میں مجھ کو نظر آجاتا ہے
وحشت سے میری آنکھیں پھیلنے لگتی ہیں

اوراس خوف سے میری ریڑھ کی ہڈی جمنے لگتی ہے کہ
ان ہی مادرزادمنافق لوگوں میں
مجھ کوساری عمر بسر کرنی ہے

(برمن بلاشدی)

4۔اداجعفری۔

اداجعفری نے بھی غزل اورنظم دونوں صنف میں طبع آزمائی کی۔جن کا شماراردو کی صف اول کی شاعری میں ہوتا ہے۔ان کے موضوعات کا دائرہ وسیع ہے۔ان کے یہاں عشقیہ جذبات کے ساتھ تانیثی تحریک کے واضح اثرات ملتے ہیں۔ان کے شعری سرمائے میں میں ساز ڈھونڈتی رہی 1950،شہر درد 1968،غزالاں تم تو واقف ہو 1974،ساز سخن بہانہ ہے 1982،حرف شناسائی اورکلیات موسم موسم 2002 ہے۔

اداجعفری نے اپنی شاعری اگرچہ ترقی پسند تحریک کے دورعروج میں شروع کی لیکن وہ کبھی اس تحریک وابستہ نہیں رہیں۔نہ کبھی کسی نظریہ کوقبول کیا۔بلکہ انہوں نے اپنی راہ الگ نکالی۔انہوں نے عشق کی مختلف کیفیات کا بڑی خوبصورتی سے ذکر کیا ہے۔خاص کر ہجر کے موضوعات کوانہوں نے بڑی شدت کے ساتھ پیش کیا ہے۔

سینے میں اک چبھن سی ہوتی ہے   آنکھوں میں کیوں جلن سی ہوتی ہے
یہ کیوں حالت ہے بے قراری کی
سانس بھی کھل کے آ نہیں سکتی

عشق کی اس کیفیت کے علاوہ ان کے یہاں احتجاج اور بغاوت کی صورت حال بھی ملتی ہے۔جو وہ اپنے معاشرے اورسماج کے رسم ورواج سے کرتی ہیں۔نجمہ رحمانی اداجعفری کی شاعری کے بارے میں لکھتی ہیں:

اداکی شاعری میں اکثر اپنے ماحول سے بغاوت کے عناصر ابتداء ہی سے کارفرما تھے۔آغاز مین ان کی یہ فکر اتنے تابناک انداز میں سامنے نہیں آئی۔لیکن ان کے پہلے مجموعے سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کی شاعری کا رجحان اب نسبتاً وسیع دنیا کی جانب ہورہا ہے۔

زمیں پہ شعلہ باریاں،فلک پہ گڑگڑاہٹیں

کہ سن رہے ہیں چشم و دل مظام نو کی آہٹیں
بہار بیت ہی چکی خزاں بھی بیت جائے گی
مگر ایک سوچ میں پڑی ہوئی ہوں آج بھی
وہ میری آرزا کی ناؤ کھے سکے گا یا نہیں
نظام نو بھی مجھے ساز دے سکے گا یا نہیں3

اس کے ساتھ ادا جعفری نے قدیم و جدید شعری امتزاج اور زبان و بیان کی دل آفرینی سے انہوں نے اپنے شعری سرمائے کی تکمیل کی ہے۔اورانہوں نے زندگی کے عام فہم اور سیدھے سادھے انداز کو اپناتے ہوئے اپنے شعری سفر کو جاری رکھا۔ بیزاری،شکست ساز، میں ساز ڈھونڈتی رہی،احساس اولین،میراث آدم اور ماں ان کی اہم نظمیں ہیں۔

5۔ممتاز مرزا۔

غزلیہ شاعری میں اہم مقام رکھنے والی ممتاز مرزا نے یوں اس وقت شاعری کی جب ان کی ہم عصر شاعرات تانیثیت اور حقوق نسواں کے لیے آواز بلند کر ہی تھیں۔اور عورت کو جدید معاشرے میں پابندی کے برعکس ان کی آزادی کی حمایت کر رہی تھیں۔لیکن ممتاز مرزا نے اس بغاوت کے برعکس کلاسکی روایت اور لب و لہجے کی پاسداری کی۔اور غالب و میر کی زمینوں تک میں شعر کہ ڈالے۔ان کا محبوب موضوع کلاسکی شعراء کی طرح عشق ہی ہے۔

بے طرح آپ کی یادوں نے ستایا ہے مجھے
چاندنی راتوں نے آآ کے رلایا ہے مجھے

وہ اک نگاہ کہ مفہوم جس کے لاکھوں ہیں اسی نگاہ کا اک آسرا سا رہتا ہے

ممتاز مرزا کے یہاں کلاسکی شاعری کی طرح عشق کا اظہار برملا نہیں ملتا بلکہ وہ مشرقی عورت کی طرح شرم ولحاظ کا پاس رکھتے ہوئے محبوب کی طرف سے پہل کا انتظار کرتی ہیں اور کہتی ہیں:

ہم ان کا عکس دکھا دیں گے اپنی آنکھوں میں
وہ پوچھیں تو ممتاز آرزو کیا ہے

ممتاز مرزا کے یہاں بھی فانی کی طرح غم واندوہ کا ذکر بھی ملتا ہےلیکن وہ فانی کی زندگی سے مایوس یا بیزار نہیں بلکہ زندگی کو ہر صورت میں قبول کر کے اس کے ہر رنگ میں تازگی پیدا کر لینا ہے۔اور وہ زندگی کے تمام مصائب کو بڑی خوش دلی اور ہمت ے ساتھ برداشت کر کے قنوطیت سے اپنے دامن کو بچائے رکھا۔

غموں میں ڈوبی ہوئی ہے ہر اک خوشی میری
عجیب طور سے گزری ہے زندگی میری

شرم آتی ہے میں اب اور بھلا کیا مانگوں　　غم ملا ،رنج ملا،درد ملا،سوز ملا

عشقیہ موضوعات کے علاوہ عورت کی جو تصویر ممتاز مرزا نے پیش کی ہے۔وہ دکھ درد اور غموں سے بھری ہوئی ہے۔اور اس کے نصیب میں صرف پریشانیاں اور مصیبتیں ہیں۔لیکن وہ اس غم سے کسی طرح بیزار نہیں بلکہ ان دکھوں کو بھی ہنسی سے برداشت کر جاتی ہیں۔

تمہیں صبح تو مبارک مجھے غم نصیب شامیں
مری زندگی کا حاصل یہی سرمئی دھندلکے

کہاں کہ بہاریں خزاں بھی نہیں　　مری زندگی بیاباں بیاباں

ممتاز مرزا نے کلاسکی روایت اور لب ولہجے کے ساتھ ایک مشرقی عورت کی نفسیات کو بھی پیش کیا۔انہوں نے عورت کو ایک آزاد انسان کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔وہ عورت کو اس کی مرضی سے جینے دینے کی حمایت بھی کرتی ہیں۔اس طرح ممتاز مرزا کی شاعری جہاں ایک طرف پرانی روایت کی پاسداری کرتی ہے وہیں جدیدیت کی روشنی سے وہ آگاہ ہیں۔

6۔زہرا نگار۔

تقسیم ہند کے بعد ادبی دنیا میں نمودار ہونے والی زہرہ نگاہ نے اپنی شاعرانہ صلاحیت سے جلد ہی لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لی۔"شام کا ستارہ1980"ان کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔اس کے بعد ان کے شعری مجموعے"ورق"اور"فراق"زہرہ نگاہ نے اپنے ذاتی تجربات کے ساتھ دنیاوی مسائل ومصائب کو بھی اپنی شاعری میں پیش کیا۔وہ سیاسی حالات سے پوری طرح باخبر تھیں۔اور پاکستانی سیاسی حالات کو انہوں نے بخوبی بیان کیا ہے۔کہتی ہیں:

اداس اداس چہرے بجھی بجھی سی ہے سحر　　نقاب چہرۂ شب اٹھ چکا مگر پھر بھی
ہم تقاضا حرام دیکھیے کب تک رہے　　گردش مینا و جام دیکھیے کب تک رہے
بڑے فریب دیے تم نے بندگی کے لیے　　جہان نو کا تصورحیات نو کا خیال

یہ اشعار تقسیم وطن کے بعد ابھرنے والی نسلوں کے جذبات کی عکاسی کرتے ہیں۔ان سماجی وسیاسی حالات کے علاوہ انہوں نے نسائی جذبات واحساسات کا اظہار فنکارانہ انداز سے کیا۔ان کی نظمیں آنگن،ایک سہیلی اور مدھ مالتی پون لیرائے وغیرہ عورت کے نازک جذبات کو بیان کرتی ہیں۔

اتنے دن کے بعد مجھ کو آئینہ اچھا لگا　　اپنا ہر انداز آنکھوں کو تروتازہ لگا
اور چہرہ جھلملاتا، جاگتا ہنستا لگا　　سارا آرائش کا سامان میز پر سوتا رہا
کیسا ہر کونا مجھے کہتا لگا،سنتا لگا　　کیسے ہر کونے میں دیواروں کے چہرے کھل اٹھے
سارے گھر کا کام اس دن کس قدر ہلکا لگا　　ملگجے کپڑے میں اس دن غضب کی آب تھی

زہرہ نگاہ ایک حساس طبیعت کی مالک تھی۔وہ اگرچہ عورت کے دکھ درد اوراس کے مصائب سے آگاہ تھیں لیکن اس سے نمٹنے کی ان میں ہمت نہ تھی اسی لیے مصلحت کا راستہ تلاش کرتی تھیں۔اسی لیے ان کی شاعری میں عورت ایک نفسیاتی اور ذہنی گھٹن میں رہتی ہے۔نظم ''ہمارے اورتمہارے راستوں میں'' اس کی عمدہ مثال ہے۔

انہوں نے نظم اور غزل دونوں میں بہترین شاعری تخلیق کی ہے۔بہر حال ہمیں زہرہ نگاہ کی شاعری میں روزمرہ کی زندگی کے جذباتی معاملات نظر آتے ہیں۔جن میں سیاسی،سماجی حالات اور ایک عورت کی جذبات کی عکاسی کے ساتھ ایک ماں کی محبت،شفقت اوراس کے مادرانہ جذبوں کی تصویر کشی کی گئی ہے۔نظم ماں،علی کے نام،نعمان کے نام، جرم وعدہ اور ایک بچے کا گیت ماں کے جذبات کی ترجمانی کرتی ہیں۔ان کی نظموں میں غزلوں کے مقابلے باغیانہ لب ولہجہ ملتا ہے۔جب کہ ان کی غزلیں عشقیہ اورلطیف جذبات و احساسات کی نمائندہ ہیں۔

7۔مسعودہ حیات۔

ہندوستانی شاعرات میں مسعودہ حیات کی شاعری بھی اہم ہے۔انہوں نے نظم کے برعکس غزل کو پیرائے اظہار کے لیے موزوں بنایا۔مسعودہ حیات کی شاعری میں بھی عورت کی نفسیات،اس کے دکھ درد اور

گھٹن کی تصویر کشی کے ساتھ گہرے سیاسی اور سماجی مسائل کی عکاسی بھی ملتی ہے۔اس کے علاوہ انہوں نے عشق کے لطیف جذبات کو بھی سرشاری اور وارفتگی کے ساتھ پیش کیا ہے۔اور وہ عشق کی راہ میں محبوب کی خاطر کانٹوں پر بھی چلنا گوارا کرتی ہیں؛

رہ حیات میں کانٹیں بچھیں کہ پھول کھلے
یہ شرط ہے تری جانب وہ راستہ جائے

اک یاد کی خوشبو سے مری تنہائی　　　تم نے جو جدا ہوکر کی اورمسیحائی

نجمہ رحمانی ان کی شاعری کے بارے میں لکھتی ہیں:

عصری زندگی اس کی بے چہرگی ماضی کی روشن روایتوں کے سماج میں گم ہو جانے کا احساس ان کے یہاں اکثر و بیشتر ملتا ہے۔توہمات ورسومات کے درمیان انسان کی مظلومیت اس کا کچلا ہوا وجود ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کی پاداش میں جو سزا فن کار کو ملتی ہے اس سے واقف ہونے کے باوجود وہ اپنی زبان کو مصلحت کے دھاگوں سے سی لینے کے لیے تیار ہیں۔یہی بے خوفی اور حالات کی سچی تصویر کشی ان کی تقریباً ہر غزل میں کسی نہ کسی طرح ظاہر ہوتی ہے۔4

مسعودہ حیات نے عورت کی ذات وصفات اور اس کی نفسیات کی عکاسی کی عمدہ مثالیں پیش کی ہیں۔ ان کے یہاں ایک ایسی عورت کی تصویر ملتی ہے جہاں عورت روایت کی پاسداری کر کے تھک چکی ہے۔اور اب وہ سماج میں تبدیلی کی خواہش مند نظر آتی ہے۔

عمر بھر کو ترے غم کی امانت سمجھا　　　اب وہی تار نفس ٹوٹ گیا مجھ سے

مسعودہ حیات نے عورت کے ان جذبات کو شگفتہ زبان و بیان اور لب ولہجہ کے بیان کیا ہے۔ان کی شاعری غیر تصنع اور تکلفات کے دائروں میں قید نہیں بلکہ انہوں نے بڑے شائستہ اور مہذب انداز میں اس کو پیش کیا ہے۔اس سرشاری کی کیفیت کے متعلق اختر الایمان ان کے شعری مجموعے ''بوئے سمن'' کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

یہ سرشاری کی کیفیت ان کے یہاں غالباً اس لیے ہے کہ ان کے کلام اور ان کی شاعری کی بنیاد جمالیاتی قدریں اور بالیدہ جمالیاتی ذوق ہے۔ ہماری زندگی میں سیاسی سماجی اور معاشی مسائل کی کج روی سے جو بدصورتی پیدا ہوتی ہے

اس کا احساس اس وقت تک ہو ہی نہیں سکتا جب تک لکھنے والے کا جمالیاتی احساس بہت تربیت یافتہ اور نکھرا ہوا نہ ہو،

ہزار درد سمیٹے ہوئے ہوں اک دامن میں
بکھر گئی جو مری داستاں تو کیا ہوگا 5

8۔ساجدہ زیدی۔

ساجدہ زیدی کی شاعری میں سماج ،سیاست ،عورت کا استحصال اور بغاوت کا عکس نظر آتا ہے۔اردو کے علاوہ انگریزی ادب پر زبردست پکڑ کے باعث اور وسیع مطالعہ کے سبب ان کی شاعری اپنی ایک الگ پہچان رکھتی ہے۔ان کا خاص موضوع عورت کی ہستی ،اس کا وجود اور اس کی نفسیات رہا ہے۔عورت کا کرب انہیں پریشان رکھتا ہے۔اسی لیے انہوں نے عورت کی جو تصویر پیش کی ہے اس میں عورت دکھ درد اور آلام و مصائب کا مجسمہ نظر آتی ہے۔اس کے علاوہ انسانی زندگی میں مشینوں کی دخل اندازی اور احساس محرومی اس عہد کے انسان کا بہت بڑا المیہ ہے۔ایسا محسوس ہوتا ہے آلات نے صرف مروت کو ہی نہیں کچلا بلکہ لوگوں میں جینے کی تڑپ اور کوئی آرزو نہیں بلکہ سانسوں کی تکمیل تک جینا مجبوری ہو گیا ہے۔

آنکھ بھی تر نہیں
اب دل بھی طلب گار نہیں
رہ گزاروں میں کہاں قطرہ شبنم کا وجود
خون جم جاتا ہے برفیلی فضاؤں میں
تو پھر آنکھ سے ڈھلتا بھی نہیں
زندگی جبر ہے
مجبور ہیں ہم

(انکشاف)

ان کی نظم ’’مغرب و مشرق کا استحصال‘‘ بھی اسی نقطۂ نظر کی وضاحت کرتی ہے۔علاوہ ازیں ساجدہ زیدی کے یہاں جنسی مسائل کی تصویر کشی بھی ملتی ہے لیکن یہ جنسی مسائل کسی لذت آمیزی کے لیے نہیں بلکہ اس کے ذریعہ انہوں نے زندگی کے نرم و نازک پہلوؤں کو پیش کیا ہے۔

تم میرے شوق کے مجروح بدن کو چھیڑو

میں تمہارے لیے احساس سے ہر لحہ بغل گیر رہوں

تم میری فکر کے پژمردہ لبوں کو چومو

میں تمہاری نگہ تشنہ کے زہر لب کا جام

اپنی رگ رگ میں اتاروں کہ بجھے پیاس کی آگ

ساجدہ زیدی کا پہلا شعری مجموعہ ''جوئے نغمہ 1962'' ہے۔ان کی اہم نظموں میں ، میں وہ تصویر نہیں ،مرگ حیات ،تلاش ،رقص ناتمام ،میں وہ تصویر نہیں ،دوآتشہ ، یہ نہ میری کہانی ، ایک نظم ،عندلیب گلشن نافریدہ ،سوچ ،مشرق ومغرب کا استحصال اور انکشاف وغیرہ اہم ہیں۔شاعری کے بارے میں انہوں نے اپنے شعری مجموعے'' آتش سیال'' کے مقدمے میں لکھا ہے۔؛

میرے خیال میں شاعری شرط اول۔ تجربہ کرنا experience نہیں۔ بلکہ تجربہ ہونا ہے۔تجربہ کی بھٹی ہی میں تپ کر کوئی خیال شاعری ، یا کسی بھی تخلیق کا جامہ پہن سکتا ہے۔ ہیت کے تجربے خود بڑی حد تک ذاتی تجربے ہی کے بطن سے پیدا ہوتے ہیں۔شاعری یا تخلیقی عمل کے محرکات بنیادی طور پر میرے نزدیک دو ہیں۔زندگی کے المیے کا احساس...اور تصادم وکشمکش۔6

9۔نوشی گیلانی۔

نوشی گیلانی کا شمار بھی پاکستان کی موجودہ اہم کی اہم شاعرات میں ہوتا ہے۔وہ نثر ونظم دونوں میں خامہ فرسائی کر رہی ہیں۔وہ 1964 کو بہاول پور میں پیدا ہوئیں۔گھر کا ماحول ادبی تھا۔انہوں نے امریکہ سے فنانسنگ کی تعلیم حاصل کی۔فنانس کے ساتھ انہیں سیاست اور انگریزی سے بھی لگاؤ تھا۔لیکن انہوں نے اپنی شاعری کی ابتداء مزاحیہ شاعری سے کی۔اوراس کے بعد وہ سنجیدہ شاعری کی طرف راغب ہوئیں۔فرمان فتح پوری ان کی شاعری کے بارے میں گویا ہیں:

شعروادب کا میدان ان کا گھر آنگن ہے۔ان کے کلام کی روانی اور بیان کی شگفتگی صاف ظاہر کرتی ہے کہ ان کی شاعری ذہنی ریاضت کا نتیجہ نہیں درونِ خانہ کے ہنگاموں کے دباؤ کا حاصل ہے۔اورنہایت سادگی وخوبصورتی سے

لفظوں میں ڈھل گیا ہے۔

رکتا بھی نہیں ٹھیک سے چلتا بھی نہیں ہے
یہ دل کہ تیرے بعد سنبھلتا بھی نہیں ہے
اک عمر سے ہم اس کی تمنا میں ہیں بے خواب
وہ چاند جو آنگن میں اترتا بھی نہیں ہے7

ان کی ایک نظم ''میری آواز سنتے ہو'' سے چند اشعار:

میں تنہائی کے ہجر کے جنگل کے غاروں میں
جلاتی ہوں
سخن کے وہ دیے جن کو
ابھی باہر کی زہریلی ہوائیں اجنبی محسوس کرتی ہیں
ابھی یہ روشنی جو سچ کی خوشبو کی حفاظت کے لیے
تاریکیوں سے لڑ رہی ہے، نا آشنائی کے
غبار آلود رستوں سے گزرتی ہے۔(میری آواز سنتے ہو)

10۔ثمینہ راجہ۔

موجودہ عہد کی پاکستانی شاعرہ ہیں۔ان کی پیدائش 1961 اور وفات 2012 میں ہوئی۔ان کے گھر میں عورتوں کی تعلیم کا کوئی تصور نہیں لیکن پھر بھی ثمینہ نے کسی طرح ایم۔اے کی ڈگری حاصل کی۔لیکن انہیں شعر و ادب کا بچپن سے ہی لگاؤ تھا۔اور انہوں نے کم عمری میں شاعری کی ابتدا کر دی تھی مگر ان کا کلام بہت بعد میں لوگوں تک پہنچ سکا کیوں کہ ابتداء ان کا کلام ادبی جرائد تک محدود رہا۔اب تک ان کے گیارہ مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ 1995 میں ان کا پہلا شعری مجموعہ ''ہویدا'' کا نام سے شائع ہوا۔اس کے بعد ''شہر صبا، اور وصال، خوابنائے، باغ شب، باز دید ہفت آسماں، پری خانہ، عدن کے راستے پر، دلِ لیلیٰ اور عشق آباد منظر عام پر آ چکے ہیں۔

تنہا ،سر انجمن کھڑی تھی   میں اپنے وصال سے بڑی تھی

اک پھول تھی اور ہوا کی زد پر   پھر میری ہر اک پنکھڑی تھی

کچھ بڑی بات نہیں دادِ ہنر چاہتے ہیں

ہم تو اہلِ نظر ذوق نظر چاہتے ہیں 8

11۔شفیق فاطمہ شعریٰ۔

کلاسیکی روایت کی پاسدار کہی جانے والی شفیق فاطمہ شعریٰ خواتین شاعرات میں نمایاں اہمیت کی حامل ہیں۔ان کا مزاج کلاسکی روایت کا پاسدار تھا۔انہیں اردو، فارسی اور عربی زبان پر عبور حاصل تھا۔اور شعروادب سے غیر معمولی دلچسپی تھی۔پہلی نظم 1953 میں ''فصیل اورنگ آباد'' کے نام سے شائع ہوئی۔انہوں نے ہندی گیتوں کی زبان کو بھی بڑی خوبی کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ان کا لہجہ دھیمہ اور درد وکرب میں ڈوبا ہوا تھا۔اس کے علاوہ ان کے یہاں ماضی وحال کی جیتی جاگتی تصویریں اور جدیدیت میں ماضی کی گم گشتہ فضاؤں کا بیان اظہار نظر آتا ہے۔ان کا فکری اور تاریخی شعور بھی پختہ ہے۔جو ان کی پہلی نظم ''فصیل اورنگ آباد'' سے ہی واضح ہوجاتا ہے جس میں انہوں نے ایک تاریخی سماں باندھ کر تاریخی حسیت سے کام لیا ہے۔خود زاہدہ زیدی نے ان کا شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ شفیق فاطمہ شعری کی شاعری میں سنجیدگی بھی ہے فلسفیانہ تفکر بھی اور تاریخی شعور بھی،اور کہیں کہیں اخلاقی تصورات کا عکس بھی ملتا ہے۔لیکن ان کی زبان فارسی اور عربی آمیز ہے۔اوران کے شعری اظہار میں ایک بوجھل پن بھی ہے۔9

لیکن شفیق فاطمہ کا تاریخی اور فکری شعور پختہ ہے اوروہ علامتی انداز میں اپنی بات پیش کرنے کا ہنر بھی جانتی ہیں۔یادنگر،افتادگاہیں نجوم،صدا بصحرا،زوال عہد تمنا،بازگشت،ارض موعود یا شفیع الامم اور چراغ تہ داماں ان کی بہترین نظمیں میں شمار کی جاتی ہیں۔جو کلاسکی لب و لہجے کے ساتھ بھی فکر وفن کے نئے زاویوں سے آشنا ہیں:

آج فولاد پگھلا

بھڑکتے رہے سرخ بھٹی میں

ارمان،اسرار،جوشِ جنوں

جانکی کا ادھورا نشہ جب بھی ٹوٹا

تو پسیے گیا ہوش واحساس کو بے دریغ

دور بکھرے دھوئیں کو نگلتے ہوئے

کھردرے اورنم آلود پتھر کا لمس

جذب ہوتا رہا جسم میں ___ نہیں!

___ نہیں، قلب چیخا

زباں ''ہاں'' کا انگارہ بن گئی

جہاں جل بجھی

نہیں!___ اوراقتصائے کون ومکاں

خون سے بھر گئے (شفیع الرحمان)

زاہدہ زیدی نظم نگاری:

زاہدہ زیدی کی شاعری کے تعلق سے ہمیں اس بات کا بخوبی علم ہے کہ انہوں نے شعری اصناف نظم اورغزل دونوں میں طبع آزمائی کی ہے۔وہ نظم اورغزل دونوں میں یکساں قدرت رکھتی ہیں۔اورنظم وغزل دونوں میں ان کی بے شمار بہترین تخلیقات موجود ہیں۔باوجوداس کے ان کی نظم نگاری کا پلہ بھاری نظر آتا ہے۔زاہدہ زیدی کی نظموں میں حمد،نعت اور قطعات وغیرہ بھی شامل ہیں۔ان کا پہلا شعری مجموعہ''زہر حیات1975''ہے۔جس میں آٹھ غزلیں ہیں جب کہ نظموں کی تعداد چالیس کے قریب ہے۔اسی طرح دوسرا مجموعہ''دھرتی کا لمس1975''ہے۔اس میں کل نظموں کی تعداد35اور12غزلیں شامل کی گئی ہیں۔نظموں اور غزلوں کے علاوہ اس مجموعے میں زاہدہ زیدی نے 4منظوم ترجمے بھی شامل کئے ہیں۔''سنگ جاں1989''ان کا تیسرا شعری مجموعہ ہے۔اس میں 37 نظمیں ہیں جس میں4نثری نظمیں بھی ہیں۔علاوہ ازیں ان کی8غزلیں اوراٹلی کے مشہور شاعر یوجنیو کی 5 نظمیں بھی ترجمہ کی گئی ہیں۔اس کے بعد ان کا چوتھا شعری مجموعہ''شعلۂ جاں2000''منظرعام پرآیا۔اس میں بھی نظموں کی تعداد غزلوں کے مقابلے میں زیادہ نظر آتی ہے۔کل نظمیں 38 ہیں جس میں 6نثری نظمیں بھی ہیں۔جب کہ غزلوں کی تعداد صرف 12 ہے۔زاہدہ

زیدی کا آخری شعری مجموعہ ''شام تنہائی2008''میں شائع ہوا۔جس میں دوسرے شعری مجموعوں کے برعکس اچھی خاصی تعداد میں غزلیں نظر آتی ہیں۔اس میں کل غزلیں26اور22 نظمیں ہیں۔

زاہدہ زیدی کی ان تخلیقات کی روشنی میں جب ہم ان کی شاعری کا جائزہ لیتے ہیں۔تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے تجربات ومشاہدات کی روشنی میں اپنی فکر کو شعری تخلیقات کی شکل میں پیش کیا۔انہوں نے اپنے ماحول اور سماج سے ہی اپنی شاعری کا مواد اخذ کیا۔اور سماج میں ہونے والے ظلم، جبریت ،بربریت،فرسودہ رسم و رواج اور زندگی کے مختلف مسائل کا انہوں نے اپنی شاعری میں ذکر کیا ہے۔شعری مجموعہ''زہرحیات''میں اپنی شاعری کے متعلق لکھتی ہیں:

> میری شاعری کو سمجھنے اوراس سے لطف اندوز ہونے کے لیے آپ کو ڈکشنری،کلید،تعریفی مضامین،مغربی اور مشرقی نقادوں کے اقوال زریں،کسی خاص سیاسی، مذہبی یا نظریاتی مکتب خیال سے تعلق اور کسی مخصوص ادبی گروہ سے وابستگی کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔۔۔ہاں شدت احساس،تخیل،تفکر، ذوق آگہی،احساس حسن،دروں بینی،ادب اور فنون لطیفہ سے واقفیت،زندگی کے گونا گوں اور تہ دار تجربات،اپنی ذات اور ماحول سے گہرا اور ذمہ دار تعلق اور دور حاضر کے مخصوص تجربات اور مسائل کا عرفان آپ کو شاعری کی تہ تک پہنچنے اوراس سے لطف اندوز ہونے میں مدد دے سکے گا۔10؎

مجموعہ زہرحیات کی بیشتر شاعری خارجی ماحول اوراس میں رونما ہونے والے واقعات پر مشتمل ہے۔لیکن اس خارجی ماحول میں ان کے اپنے ذاتی تجربات ومشاہدات بھی شامل ہیں۔جس کو انہوں نے شدت احساس کے ساتھ شاعری کے قالب میں ڈھالا ہے۔اس مجموعے کی نظموں میں اندھیرا،ساحل،تخریب،موت، تنہائی،شکست وریخت،خزاں،بند کمرہ،دن کا کرب، بازدید،زہرحیات،تخلیق، دیوار، خامشی، اجنبی، جنگل، چٹانوں کے بدن،شکست،لمحۂ حال، پیمان وفا، فیصلہ اور نذر محبت وغیرہ نظمیں شامل ہیں۔ان نظموں میں ہمیں مادی زندگی کی چکا چوند،تنہائی، احساس کے پژمردہ ہوجانے کا ڈر، ناامیدی،آرزو کے ختم ہوجانے ،تیز رفتار زندگی،عمرِرواں کا بے شوق گزرجانے کا غم اور ذات کے شکست وریخت جیسے موضوعات نظر آتے ہیں۔

بجھ گئے عشق کی بستی میں امیدوں کے دیے　　　آرزو دست جنوں سازمیں آوارہ ہے

دل ویراں کی اڈتی ہوئی تاریکی میں   عقل خا موش ہے، پیان وفا تنہا ہے
راستے یاس کی تاریکی میں سرگرداں ہیں   نہ کوئی قافلۂ شوق، نہ منزل کے نشاں
سحرو شام کے سلگتے ہوئے ویرانے میں   بس چلی جاتی ہے پابستۂ غم عمر رواں 11؎

دورتک ذہن کے تپتے ہوئے صحراؤں میں
نہ کوئی نخل امید، اور تمنا کے سراب
نہ کوئی نغمۂ گل
اور نہ صدائے ناقوس
نہ کسی قافلۂ شوق کے قدموں کی صدا
نہ کہیں دور
بہت دور
تخیل کی کسی وادی میں
مست وسرشار سبک بر ہواؤں کا خوام   12؎

اس طرح کی اور بہت سی بے شمار نظمیں ان کے اس مجموعے میں مل جاتی ہیں۔خاص کر نظم ''اندھیرا'' میں انہوں نے اپنے عہد کی تاریکی اور ناامیدی کے گہرے ہوتے ہوئے سائے کو موضوع بنایا ہے۔وہ کہتی ہیں:

رات تاریک ہے
اور ذہن کی پنہائی میں
نہ کہیں شدت احساس کے
تابندہ نجوم
نہ کہیں فکر جہاں تاب کا
وہ ماہِ تمام
نہ کہیں وقت کی لہروں ہی پہ
امید کی کرنیں رقصاں
نہ کہیں کیفیت بزم طرب کے جگنو

ہر طرف گونجتی انجان صداؤں میں

نہ کھو جائے کہیں نغمۂ روح

کہیں بے ربطی ماحول میں

دب نہ جائے نہ آہنگِ حیات 13؎

ان نظموں کے عنوان سے ہی ناامیدی کے گہرے سائے ، ماحول کی تاریکی ،احساس سے عاری ذہنیت اور اقدار کی شکست وریخت کا المیہ نظر آتا ہے۔

مجموعہ زہر حیات کے برعکس ''دھرتی کا لمس'' کی نظمیں زاہدہ زیدی کے داخلی جذبات واحساسات کی عکاسی کرتی ہیں۔اس دور میں چونکہ جدیدیت کی تحریک اپنے شباب پر تھی۔لاشعوری طور پر زاہدہ زیدی بھی اس تحریک سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں اگرچہ انہوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ ان کی شاعری کو کسی تحریک یا نظریہ کے چوکھٹے میں نہ دیکھا جائے۔مگر پھر بھی ہمیں ان کے اس مجموعے میں وہ تمام خصوصیات دیکھنے کو ملتی ہیں۔جو جدیدیت کا اہم رجحان رہی ہیں۔تنہائی، ذات کا کرب، مایوسی، جدوجہد،نفسیاتی وذہنی کشمکش وغیرہ خاص طور سے اس مجموعے کی شاعری کا حصہ رہی ہیں۔نجمہ رحمانی مجموعہ ''دھرتی کا لمس'' کے بارے میں لکھتی ہیں:

''دھرتی کا لمس'' زاہدہ زیدی کے داخلی جذبات واحساسات کے اظہار پر مشتمل ہے۔''دھرتی کا لمس'' میں جتنی نظمیں ہیں ان پر جدیدیت کی گہری چھاپ ہے۔ ہر نظم اداسی اور اندھیرے کی دبیز چادر اوڑھے قنوطیت کی الجھی راہوں میں بھٹکتی محسوس ہوتی ہے۔ان نظموں میں کہیں بھی امید وجدوجہد کی کوئی کرن نہیں۔اپنے آپ کو سمجھنے کی کوشش اور دردوالم اور یاس کی کیفیت نے ان کے اس مجموعے پر یکسانیت طاری کردی ہے۔زبان سہل ہونے کے باوجود استعارے اتنے ذاتی اور مبہم ہیں کہ کبھی کبھی کوشش کے باوجود بھی تفہیم کی منزل نہیں پہونچا جا سکتا۔مجموعی طور پر ان نظموں میں ذہنی انتشار کا احساس ہوتا ہے۔جس میں حال اور مستقبل کے سکون اور امید کے بجائے ایک ناامیدی کا احساس ابھرتا ہے۔14؎

نجمہ رحمانی کی اس بات کی صداقت پر اس وقت مہر لگ جاتی ہے۔جب ہم نظم وصل، یاد ایک سمندر، یہ لمحہ، سفر طویل ہے،انتشار، ویرانہ،تخریب کے بعد، حصار،تصویر، تکمیل بے مایہ، مرا فن۔۔ مرا درد،

لہولہان دائرے، جھینگر، وہاں کون تھا اور دلدل وغیرہ کا مطالعہ کرتے ہیں۔

تلاطم کا مرکز___ سمندر
بھی قطرہ تھا
تھی جس کو
اک بیکراں بحر کی آرزو
سمندر نے قطرے کو گوہر بنایا
اپنی گہرائیوں میں چھپایا
اور____
بیتاب موجوں کے پہلو میں
وہ منجمد جسم
تنہا رہا 15؎

شکست کے آئینے کو
توڑ کر
بھی کیا ملے گا، اب
شکست کے حصار سے
یہ کارواں
نکل نہ پائے گا 16؎

پھیپھڑے___ پسلیاں___ دانت___ آنکھیں
کاسنی ہونٹ
اکڑی ہوئی انگلیاں___ زرد
مسلے ہوئے جسم
سوکھی ہوئی چھاتیوں سے

ٹپکتا لہو

گشت کرتی ہوئی ____

بے دلی 17ؔ

ان نظموں میں ہمیشہ بیشتر جگہ زاہدہ زیدی کی ناامیدی اوران کا منفی رویہ دیکھنے کو ملتا ہے۔اور یہ داخلی تجربات کی شدت، گہرائی اور معنویت کا اشارہ ہیں۔لیکن یہ کیفیت ہمیں تکرار کی صورت میں ہر نظم کا حصہ معلوم ہوتی ہے۔

''دھرتی کا لمس'' کی نظموں پر یہ الزام عائد ہے کہ ان نظموں میں زاہدہ زیدی نے اپنی ذات کے کھول میں بند اپنے داخلی جذبات واحساسات کو زیادہ اہم دی ہے کہ استعارے اور مفاہیم مبہم معلوم ہوتے ہیں۔لیکن ''سنگ جاں'' کی نظموں کا مطالعہ کرنے کے بعدہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس دور کی نظموں میں زاہدہ زیدی خارجی ماحول کی طرف زیادہ متوجہ نظر آتی ہیں۔یہاں وہ عام انسان کے دکھ درداور زندگی کی مٹتی ہوئی قدروں پر غم زدہ ہیں۔آل احمد سرور مجموعہ ''سنگ جاں'' کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> فطرت کی بوقلمونی، زندگی کی سرشاری، اضطراب اور جستجو کی پیہم خلش اس دور کے آشوب، قدروں کے زوال اور افراد کی بڑھتی ہوئی بے حسی کا زاہدہ زیدی کو احساس ہے۔جس کی وجہ سے ان کی شاعری میں ایک حزنیہ لے بھی آ گئی ہے۔اور کہیں کہیں ایک طنزیہ لہر بھی، لیکن انسانیت پر ان کا اعتماد انہیں تلخی سے بچا لیتا ہے۔اور ان کی شاعری کو آج کے دردمند انسان کا دلدوز نغمہ بنا دیتا ہے۔18ؔ

زاہدہ زیدی کے اس مجموعے میں ہمیں ایک پختہ سماجی شعور نظر آتا ہے۔جو ترقی پسند تحریک اور مارکسزم کی دین تھا۔کیوں کہ اس وقت کا ادیب شعوری نہ صحیح لاشعوری طور پر اپنے زمانے کی اس تحریک سے متاثر ضرور تھا۔لیکن زاہدہ زیدی براہ راست اس تحریک کا حصہ نہیں تھیں۔اور نہ ہی انہوں نے اپنی شاعری میں اس کو براہ راست استعمال کیا بلکہ ان کی شاعری ایک گہرے وجودی تجربے کا اظہار ہے۔ان کی شاعری میں عرفان ذات سے عرفان کائنات تک تمام مسائل یکجا ہو جاتے ہیں۔نجمہ رحمانی ''سنگ جاں'' کی شاعری کے متعلق لکھتی ہیں:

سنگ جاں میں زاہدہ زیدی نے ذات کے خول سے نکل کر خارجی دنیا پر بھی نگاہ ڈالی ہے۔ یہاں ان کے لاشعور پر شعور غالب آ گیا ہے۔ان کا قلم انسان کی انسانیت سوز حرکات پر نوحہ کناں ہے۔اپنے سامنے زندگی کی قدروں کو مٹتا دیکھ کر ایک زندہ انسان جن کیفیات سے گزرتا ہے ''سنگ جاں'' کی نظموں میں ان کی پوری تفصیل ملتی ہے۔19؎

سنگ جاں میں انسانیت کے دکھ درد پر نوحہ کناں کی بہترین نظم وہ ہے جو زاہدہ زیدی نے بھوپال ٹریجڈی پر ''زہر کی لہر'' کے نام سے لکھی ہے۔ یہ سات نظموں پر مشتمل ایک طویل نظم ہے جسے انہوں نے ''بحیرۂ روم'' کا عنوان دیا ہے۔

وہ زہر کی لہر تھی کہ سفاک سازشوں کا کوئی ثمر تھا
جو ظلم کی شاخ پر اگا تھا
کہ تھا کوئی طفیل شیطنیت
جو آہنی کوکھ میں پلا تھا
یا فقط، وہ ان کور ذہن، بے روح اہل ثروت کی غفلتوں کا
اک ادنیٰ سا نشان تھا
کہ جن کے نزدیک خون انسانیت کی قیمت
ہر ایک شے سے حقیر تر تھی 20؎

اور آگے انہوں نے مل میں کام کرنے والے غریب مزروں، عورتوں، بچوں اور پھر پورے بھوپال شہر کی ان دل فگار چیخوں کا ذکر کیا ہے جو اس زہر آلود گیس حادثہ میں فلک تک پہونچ گئی تھیں۔

جواں بدن ضعف سے جھکے ہیں
لبوں پر مہر سکوت ہے
حسیں آنکھیں بے بصارت
نوائیں معذور ہو گئی ہیں
ادائیں مفلوج ہو گئی ہیں
مکان اجڑے ہوئے ہیں
شمشان گھاٹ آباد ہیں

قطار اندر قطار قبروں کے سلسلے ہیں 21؎

اس طرح زاہدہ زیدی نے اس خونی واقعہ کی تصویر کشی کر کے مادی مفاد پرستوں کے ظلم کی نشان دہی کی ہے۔اسی طرح کی ایک اور نظم ’’یہ کیا ترا انظام ہے‘‘ ہے۔

کہیں تری ہری بھری زمین پر ہے
قتل وخون کا سماں
کہیں ہوا کے دوش پر
تباہیوں کی داستاں
کہیں سمندروں کی گود میں
پیام مرگ لاتی آبدوز کشتیاں
کہیں بے اماں زلزلوں کی زد میں
شہر ہائے نغمہ وطرب
فصیل سنگ وخشت میں دبے ہوئے
ہزاروں نیم جاں بدن
کہیں ہیں شیر خوار خاک خون میں اٹے ہوئے
کہیں ہیں فاقہ کش دکھوں کے بوجھ سے دبے ہوئے 22؎

ان نظموں کے علاوہ اس مجموعے کی بہترین نظموں میں صرف وصوت وصدا، ہوا۔۔اے ہوا،عشرت قطرہ ہے،رات بھر،داخلی منظر،طائر خوش نوا،داخلی منظر،سنگ جاں،آتش فشاں،شہر گمشدہ،ہزاروں رنگ تھے،موت،آسمان دور ہے اور درد کا کالا سمندر وغیرہ ان کی اہم نظمیں میں ہیں۔جو ان کی فکر کی گہرائی کا ثمرہ ہیں۔

زاہدہ زیدی کی شاعری میں ہمیں عشق،شاعری،زندگی،موت،وقت،فطرت کی عکاسی اور زندگی کے دوسرے گوناگوں مسائل کا احاطہ ملتا ہے۔جس کی اہم وجہ یہ تھی زاہدہ زیدی کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔انہیں شاعری،موسیقی،مصوری،تھیٹر اور دوسرے فنون لطیفہ سے بھی دلچسپی تھی۔ان کی تخلیقی کاوشوں میں ان کے وسیع ومعنی خیز تجربات اور فکرواحساس شامل ہیں۔مجموعہ ’’شعلۂ جاں‘‘ میں شامل نظمیں،وہ اک نحیف سی صدا، یہ

لمحہ،شعلۂ جاں، یہ وقت کا بے کراں سمندر،حسن ازل ___ بے زباں، جذبۂ بیکرانہ،درد کی سرحدوں سے پرے،سرمایۂ جاں اور تلاش ایسی نظمیں ہیں۔جن کے موضوعات تخیل،معنویت،تخلیقی تجربہ،وقت کے تصور کی تجسیم اور عشق کا تجربہ وغیرہ ہیں جو ہماری ذہن اور فکر واحساس کو متاثر کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

سچ تو یہ کہ ہر رنگ میں
اور ہر موڑ پر
وقت کے سائے کی مانند ہر دم میرے ساتھ تھا
میری سانسوں میں لرزاں تھا
میرے رگ وپے میں پیوست تھا
میری ہر نقل وحرکت پہ سایہ فگن تھا
کسی طائرِ تند خو کی طرح
اس کی پرواز لیکن میری دسترس میں نہ تھی 23؎

یہ وقت کا بیکراں سمندر
جو میرے اطراف موجزن ہے
یہ تند وسفاک محشر بدوش دھارا
کہ جس کی زد میں ہیں
عہد ماضی کی وارداتیں
ہزاروں جلوہ طراز دن، سوگوار راتیں
گزشتہ ادوار کے سلگتے ہوئے سفینے
حیات نو کے کئی قرینے
مری تمام تر کاوشوں کا ایک موہوم سا سہارا
اسی کی شعلہ زبان لہروں پہ چل کے شاید ملے کنارہ
کہ اب فنا کے تاریک غار
خود میرے منتظر ہیں 23؎

یہ لمحہ نہیں

وقت کا منجمد ایک نقطہ

یہ لمحہ تو ہے ایک گہرا سمندر

کہ جس میں

کئی سمت سے آ کے ملتے ہیں پر شور دھارے 25؎

اس مجموعے کی اور بھی اہم نظمیں ہیں جن میں ہمیں زندگی کی کشاکش، شب و روز پیش آنے والے مسائل، انسان کی نفسیاتی الجھنیں اور داخلی و خارجی پریشانیوں کے ہجوم میں گھرے ذہن و دماغ کے تجربات کی رونمائی نظر آتی ہیں۔ جو زاہدہ زیدی کے تخلیقی شعور اور ان کی کاوشوں کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ کربلا، فردوس گمشدہ، یہ جنگ سفاک سازشوں کا کوئی ثمرہ ہے، محشر، آگ، سچائی، تنہائی، سیاہ سوراخ وغیرہ اسی قبیل کی نظمیں ہیں۔

زاہدہ زیدی کی شاعری کی یہ خصوصیات آخر تک برقرار رہیں۔ اور ''زہر حیات'' سے آخری مجموعہ ''شام تنہائی'' تک ان کی سرگرمیوں میں کوئی تبدیلی رونماں نہیں ہوئی۔ حقیقی زندگی کے آشوب، گرد و پیش کی دنیا، سیاسی مکاریوں، وقت کی سفاکی اور انسانیت کے زوال پر نوحہ کشی کے ساتھ وجودی نظریہ کی پیش کش، اپنی ذات کے عرفان اور داخلی تجربات و احساسات کا بیان ''شام تنہائی'' میں بھی جا بجا نظر آتا ہے۔ غرض کہ ان کی شاعری میں ذات اور کائنات کا تعلق ہر جگہ نمایاں ہے۔ ''شام تنہائی'' پر اظہار خیال کرتے ہوئے شمیم حنفی لکھتے ہیں:

> ادبی نظریات کی آپا دھاپی کے دور میں بھی، وہ نہ تو کسی بے معنی بحث میں الجھیں، نہ ان کے تخلیقی انہماک میں کبھی فرق آیا۔ ان کی شاعری جسے ان کی تخلیقی سرگرمی کا بنیادی حوالہ اور ان کے مجموعی مزاج کی پہچان سمجھنا چاہیے، وقت کے کسی بھی مرحلے میں، یکسانیت اور تکرار کا شکار نہیں ہوئی۔ ان کی فکر ایک واضح وجودی سطح رکھنے کے باوجود، اپنے گرد و پیش کی دنیا اور ماحول کی تخلیقی دستاویز بھی ہے۔ جدیدیت کے انتہائی پسندی کے دور میں بھی انہوں نے حقیقی زندگی کے آشوب، سیاسی اور نظریاتی اساس رکھنے والے واقعات پر مطالبات کا احساس مدھم نہ ہونے پایا۔ ''شام تنہائی'' پر نظر ڈالی جائے تو صاف پتہ چلتا ہے کہ زاہدہ زیدی کے تخلیقی شعور میں آج بھی وہی حرارت اور تب و تاب ہے۔ جس سے ان کی ابتدائی دور کی شاعری پہچانی جاتی ہے۔ طنز اور متانت آمیز مزاح کی ایک خلقی لہر نے زاہدہ زیدی کے انتہائی سنجیدہ شعور کو ایک نئی جہت سے ہم کنار کیا ہے۔ 26؎

شمیم حنفی کے اس قول سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ان کی شاعری میں شروع سے آخر تک ہر مسئلے پر ان کی فکر اور ان کے موقف کا اظہار کسی نہ کسی شکل میں ہوتا رہا ہے۔''شام تنہائی'' پر ہی نظر ڈالیں تو اس میں حمد و نعت سے لے کر سانحہ گجرات، جس میں گجرات میں آنے والے نہ صرف زلزلے سے متاثر ہو کر غزل لکھی بلکہ گجرات میں ہونے والے فسادات پر بھی نظم تخلیق کی، اس کے علاوہ عراق و امریکہ کے درمیان ہونے والی خلیجی جنگ اور اپنے عزیزوں کی یادوں کی یاد میں کہی گئیں غزلیں اور نظمیں شامل ہیں جس سے کی وسیع فکر، حساس دل اور اپنے گرد و پیش کے ماحول سے بھی وابستگی نظر آتی ہے۔ سانحۂ گجرات کے زلزلے پر اپنے دلی جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہتی ہیں:

فنا ماناں یہ کیسا زلزلہ ہے　　قیامت ہے کہ یہ قہر خدا ہے
ہلاکت خیز ہے لرزش زمیں کی　　کہ ہر سو فتنۂ محشر بپا ہے
زمیں کی قدر کیوں ہم نے نہ جانی　　زمیں اب نسل آدم سے خفا ہے[27]

اور پھر گجرات کے شہیدوں اور کے نام لکھتی ہیں:

خدائے برتر
کہ تو ہے رمز آشنائے احوال روز محشر
بتا یہ تیری ہی دنیا کا ایک حصہ ہے
یا جہنم کا کوئی منظر
مکان ملبے کا ڈھیر ہیں
دکانیں جلتی ہوئی ہیں
سیاہ شعلوں سے ڈھک گیا آہ نیلا امبر
ہزاروں مرد و زن اور اطفال بے سہارا
پڑے ہیں کیمپوں میں کب سے مایوس و دل گرفتہ
نہ سر پہ سایہ نہ سائبان ہے
نہ صاف کپڑے ہی ہیں بدن پر
نہ ساز و سامان، نہ آب و دانہ

اداس نظروں میں

قتل انسانیت کے آتش نوا مناظر 28؎

اسی طرح امریکہ کے عراق پر حملے کے بعد لکھی ہوئی نظم ''کربلا پھر کربلا'' ہے:

کربلا پھر کربلا ہے

ظلم اور بیداد کا اک

روح فرسا سلسلہ ہے

جبر و دہشت خندہ زن ہیں

نغمہ حق بے نوا ہے

کربلا پھر کربلا ہے

جلتی رہتی پر ہزاروں

بے کفن لاشے پڑے ہیں

اور یزیدی فوج کے پاگل درندے

ہر طرف اکھڑے کھڑے ہیں

سر بریدہ___ خوں میں غلطاں

اک حسینی قافلہ ہے

کربلا پھر کربلا ہے 29؎

اور اپنی عزیزہ شہناز ہاشمی کی یاد میں کہتی ہیں'

ایک عرصہ ہوا نظروں سے نہاں ہے شہناز کیسے ڈھونڈوں اسے افسوس کہا ں ہے شہناز

پھر نظر آؤگی شاید کسی محفل میں کہیں تم بہت دور ہو پھر کیوں یہ گماں ہے شہناز 30؎

اس کے علاوہ ایک غزل رام چندر گاندھی (گاندھی جی کے پوتے) کی یاد میں بھی ہے:

اٹھ گیا کون کے لرزاں ہیں دل زار کے تار بزم تنہائی میں یادوں کے بھنور رقص کناں

غم یہ کیسا ہے کہ الفاظ میں ڈھلتا ہی نہیں نالہ کش سوز دروں، اشک فشاں درد نہاں

وہ غریبوں کا مسیحا تھا، ضعیفوں کا رفیق کون اٹھائے گا اب اس دور میں یہ بار گراں 31؎

زاہدہ زیدی کی تمام شاعری ان کے ذاتی تجربات ومشاہدات پر مشتمل ہیں۔ان کی شاعری میں بیسویں صدی کے ایک پختہ اور باشعور انسان کی تصویر صاف نظر آتی ہے۔علاوہ ازیں ایک عورت ہونے کی حیثیت سے انہوں نے عورت کے دلی جذبات واحساسات اوراس کے مسائل کا بھی اپنی شاعری میں کھلے طور سے ذکر کیا ہے۔لیکن ان کی شاعری صرف تانیثیت تک محدود نہیں،وہ اس بارے میں لکھتی ہیں؛

> عورتوں کی شاعری کا مقصد یہ ہرگز نہیں ہے کہ وہ عورتوں کے مخصوص جنسی مسائل اور بچوں کی پیدائش وغیرہ کے تجربات پر روشنی ڈالیں یا عورتوں کے مسائل پر آنسو بہائیں یا نعرہ لگائیں۔شاعری خواہ عورتوں کی ہو یا مردوں کی،جو خصوصیات اور خوبیاں اسے عظیم بناتی ہیں،وہ دونوں میں مشترک ہیں،اور یہ خصوصیات ہیں،شدت فکرواحساس،تجربے کی وسعت اور گہرائی،تخیل کی فراوانی،تخلیقی عمل کی شدت اور گیرائی،والہانہ جذبوں کی فراوانی ،آرزو،تمنا،شوق،حیرت اور مسرت کے جذبات سے آشنائی،علامتی اظہار اور استعاراتی نظام کی انفرادیت اور معنویت۔32

لیکن پھر بھی ان کی شاعری میں عورت کی ایک اہم تصویر دیکھنے کوملتی ہے۔وہ عورت کی آزادی کی حمایت کرتی ہیں لیکن وہ آزادی ذہنی آزادی ہے۔جس کی بنا پر عورت اپنے حق اور مستقبل کے لیے آواز اٹھا سکتی ہے۔وہ نظم ’’فکرواظہار سے ماورا‘‘ میں کہتی ہیں؛

سنا ہے___ ہزاروں برس سے___ خموشی کے ساگر میں ہے__ کوئی خزینہ
اگر ہو سکے تو کوئی جال ڈالو__ وہ نایاب موتی نکالو__ وگرنہ
اسی بحرِ ذخار میں ڈوب جاؤ__ کہ بے دست و پا___ فکرواظہار سے ماورا
زیست کرنے کا___ یہ بھی تو ہے اک قرینہ
خموشی کی لہروں پہ___ لرزاں ہے__ احساس کا اک سفینہ 33

انہوں نے دوسری خواتین کی طرح عورتوں کی آزادی کے لیے نعرہ بازی اورغم وغصہ کا اظہار کرنے کے بجائے خودعورت کو اپنے اندر ہمت،حوصلہ اورعزم پیدا کرنے کی ترغیب دیتی ہیں تا کہ عورت کسی دوسرے کی محتاج نہ رہے۔نظم ’’فردوس گمشدہ میں کہتی ہیں:

اس تشدد کی یلغار میں___ سب شکاری ہیں___ کوئی مسیحا نہیں__ جو باندازِ لطف وکرم

اس کے زخموں پہ مرہم رکھے__ اس کو کھوئی ہوئی__ اس کی دوشیزگی اور عصمت کی سوغات دے

اس کے کچلے ہوئے حوصلوں کو__ گراں بار ملبے سے باہر نکالے___ اور نیلی فضاؤں میں پرواز کے خواب کو__ اذن تعبیر سے____ کوئی ایسا نہیں___ کوئی ایسا نہیں 34

جب کہ کشور ناہید کچھ اس طرح کہتی ہیں:

یہ سب رشتے ___ کچے رنگوں کے کچے دھاگے ہیں ___ سب پتھر ہیں ___ ان کے اوپر چلو تو سبھی لہولہان____ پر اپنے لیے جینا کیوں ممکن نہیں

میری بنو! سورج مکھی کی طرح___ گھر کے حاکم کی رضا پر__ گردن گھماتے گھماتے

میری ریڑھ کی ہڈی چٹخ گئی ہے___ (نظم جاروب)

کشور ناہید کی دوسری سی نظمیں نیلام گھر اور گھاس بھی مجھ جیسی ہے، اسی قبیل کی نظمیں ہیں۔ جس میں انہوں نے عورت کی گھٹن، مجبوری اور بے بسی کی تصویر کشی کی ہے۔ اسی طرح فہمیدہ ریاض، سارہ شگفتہ، بلقیس ظفیر الحسن، شاہدہ حسن اور پروین شاکر وغیرہ نے بھی اپنی بیشتر نظموں میں مرد اساس معاشرے اور نظام پر طنز کیا ہے۔

لیکن ان خواتین کے برعکس زاہدہ زیدی کی نظموں میں بلند آہنگ یا تحریک حقوق نسواں نہیں ملتی۔ ان کے بارے میں پروفیسر عتیق اللہ لکھتے ہیں:

زاہدہ زیدی کا مرغوب موضوع نیستی اور بے معنویت کے پہلو بہ پہلو تخلیق اور تخلیق کا کرب ہے۔ ان کے شعر کے موضوعی مضمرات اصلاً وجودی تجربات ہی سے عبارت ہیں۔ وہ اس معنی گریز کی تلاش میں سرگرداں رہتی ہیں، جو رگِ حیات میں مخفی ہے۔ اور اس رمز کے کشود کی متمنی ہیں جو بطن کائنات میں نہاں ہے۔ اکثر ایک صوفیانہ جذب و کشف کی لہر سی ان کی نظموں کو باطنی دھند میں لپیٹ لیتی ہے۔ زاہدہ زیدی عورتوں کی اس مخصوص زبان اور موضوعات کی قائل نہیں ہیں جنہیں تانیثیت کے تحت فروغ دیا گیا ہے۔ 35

فروفیسر عتیق اللہ اپنی اس بات کی دلیل میں زاہدہ زیدی کی ایک نظم ''حسن ازل۔۔۔ بے زباں'' کا حوالہ دیتے ہیں:

آسماں سے پرے___ آسماں ___ آسماں، ایک آتش بکف، ایک شعلہ بجاں___ آسماں، حد احساس تک، اک خلا بیکراں، اک فضا بے اماں

چاک کی طرح ہر دم رواں، اک سنگ گراں، روز شب کی جنوں خیر چکی میں پستا ہوا
ہر تراشیدہ احساس ـــــ ہر کاوش جسم وجاں
ہر سرنگوں دور تک، جام و مینائے فکر و نظر محفل شوق، نا آشنائے رموز دگر، گرمئی فکر واحساس ـــــ جی کا زیاں
زرد ماحول میں پیچ کھاتا، تن آسانیوں کا دھواں، ہر طرف شور کرتے ہوئے، رنگ آلود، نادر الفاظ
حسن ازل ـــــ بے زباں 36؎

نثری نظم:

زاہدہ زیدی نے اگرچہ آزاد نظم کو اپنا پیرائے اظہار کے لیے منتخب کیا۔ اور اپنا پیشتر نظم کا سرمایہ آزاد نظم میں ہی پیش کیا ہے۔ لیکن انہوں نے نثری نظم میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ آزاد نظم کے برخلاف نثری نظم میں روایتی عروض و پابندیوں کے برخلاف ایک واضح بغاوت ہے اور نثری نظم کا پہلا اصول ہی یہی ہے کہ وہ روایتی اور عروضی سانچوں سے بالکل آزاد ہو۔ گوپی چند نارنگ نے اپنی کتاب ''ادبی تنقید اور اسلوبیات'' میں نثری نظم کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

نثری نظم وزن و بحر پر مبنی عروضی نظام کی نفی ہے۔ جو چیز عروضی نظام میں کسی طرح بھی مصنوعی موزونیت کی جان ہے۔ وہ نثری نظم کی نفی ہے اور جو چیز نثری نظم کی جان ہے یعنی زبان کا فطری آہنگ، وہ باوزن شاعری کی نفی ہے۔ نثری نظم کی تکنیک کی بنیاد نثری آہنگ پر ہے۔ نثری آہنگ تجزیاتی نوعیت رکھتا ہے اور اس کی شناخت کی جا سکتی ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ یہ زبان کے فطری آہنگ کی آزادی کو بروئے کار لانے کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔ نثری نظم میں زبان کے تخلیقی استعمال یعنی شعری استعمال کی بڑی اہمیت ہے۔۔۔ معنی کی ترسیل کے باوصف زبان قائم بالذات ہو۔ نثری نظم میں شدت احساس، ارتکاز اور وحدت تاثر کی وہ جملہ خصوصیات ہونی چاہئے جو پابند نظم یا آزاد نظم میں پائی جاتی ہیں۔ نثری نظم میں لفظوں کی ترتیب اس طرح فطری اور سادہ ہوتی ہے جس سے عام بول چال یا تکلم میں ہوتی ہے۔ نثری نظم کا ڈھانچہ اگرچہ اکثر و بیشتر واقعاتی ہوتا ہے اور اس میں کہانی کی سی کیفیت ہوتی ہے لیکن اس کا معنیاتی تفاعل تمثیلی، علامتی، استعاراتی، رمزیہ ہوتا ہے جو اپنی وسعت کے اعتبار سے غیر واقعاتی ہوتا ہے اور آفاقی نوعیت رکھتا ہے۔ 37؎

محمد حسن نثری نظم کے تعلق سے لکھتے ہیں کہ ''نثری شاعری صرف بحروں کو رد کرنے کا نام نہیں ہے۔ نہ وہ محض نثری ترتیب کی بازیافت ہے۔اس کی کامیابی ان دونوں شرائط کو پورا کرنے کے بعد اپنی شعری اور جمالیاتی استناد کو ثابت کرنے میں مضمر ہے۔''38؎

محمد حسن نے نثری نظم کی بنیاد پانچ عناصر پر قائم کی ہے۔1۔بحر و وزن سے اجتناب،2۔نثری ترتیب،3۔آرائش اور تصنع سے پاک زبان کا استعمال،4۔شدت تاثر اور حسیاتی بیداری،5۔تہ داری اور دبازت۔

نثری نظم کی مذکورہ تعریف سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ نثری نظم میں عروض و وزن سے انحراف کے ساتھ اس میں لہجہ نثر کا سا اور گفتگو کے قریب ہونا چاہیئے۔اس میں الفاظ کا جدلیاتی استعمال، اجمال اور ابہام جیسی خوبیاں موجود ہیں۔شعر میں موزونیت نہیں ہوتی بلکہ اس کے حسن کا دارومدار ہی غیر موزونیت ہے اور ہر مصرعہ، سطر، بند یا پیراگراف میں مختلف وزن کو تلاش کیا جاسکتا ہے۔

اردو میں نثری نظم کی بات کی جائے تو ہمیں سجاد ظہیر کا مجموعہ'' پگھلا نیلم'' 1964 میں نثری نظم کے نمونے اور اس کی شعری واسالیب کے متعلق گفتگو مل جاتی ہے۔اس میں سجاد ظہیر نے نثری نظم کے حوالے سے بہت جامع گفتگو کی تھی۔انہوں نے نثری اور پابند دونوں طرح کی شاعری کی تھی۔ان کے بعد حسن شہیر، وزیر آغا، ابرار احمد خورشید الاسلام، شہریار، زبیر رضوی، ندا فاضلی، اعجاز احمد، احمد ہمیش، سلیم الرحمان، بلراج کومل، عادل منصور، مبارک احمد، عباس اطہر اور پھر مبارک احمد، مخدوم منور، قمر جمیل اور سارا شگفتہ وغیرہ نے باضابطہ طور پر نثری نظم کی تحریک چلائی۔بعد کے شعراء میں باقر مہدی، انیس ناگی، خلیل الرحمان اعظمی اور محمد حسن وغیرہ نام لیے جاسکتے ہیں۔محمد حسن تو نثری نظم کے شاعر ہونے کے ساتھ نقاد بھی ہیں۔

خواتین شاعرات جنھوں نے نثری نظم کی صنف میں طبع آزمائی کی۔سارا شگفتہ، عذرا عباس، یاسمین حمید، تنویر انجم، کشور ناہید، نسرین انجم، پروین شاکر، فہمیدہ ریاض، شاہین مفتی، بلقیس ظفیر الحسن، شبنم عشائی، صفیہ اریب، رفیعہ شبنم عابدی، شہناز نبی، ساجدہ زیدی اور زاہدہ زیدی کے نام شامل ہیں۔

جہاں تک زاہدہ زیدی کا تعلق ہے تو ان کی نثری نظموں کی تعداد آزاد نظم کے مقابل بہت کم

ہے۔شعری مجموعہ ''شعلۂ جاں'' میں ''خزاں رسیدہ، سرود رفتہ، سچائی، تاروں کی محفل، آخری دعا، نیلا چاند، چھ نظمیں اور ''سنگ جاں'' میں ''اے تندرفتار ہوا، اے سرکش تمنا، جوالا مکھی، کبھی دیکھو' چار نظمیں شامل ہیں۔یعنی ان کی کل نثری نظموں کی تعداد دس ہے۔

غزل گوئی:

غزل کو اردو کی مقبول ترین صنف ہونے کا شرف حاصل ہے مختلف زمانے میں غزل پر مختلف قسم کے اعتراضات ہوئے ہیں۔کبھی اس کی ہیت پر نقادوں نے اعتراض کیا تو کبھی اس کے موضوعات پر، لیکن غزل اپنی شناخت قائم کرنے میں ہمیشہ پیش پیش رہی ہے، اوراس نے ہر دور کے فنکاروں سے اپنی اہمیت کا لوہا منوایا ہے۔جن حضرات نے اس کی ہیت پر اعتراضات کیے خاص طور کر قافیہ کے سلسلے میں انہیں کچھ ایسے شعراء کا کلام ضرور ملا جو صرف غزل میں قافیہ پیمائی میں ہی سر دھنتے رہے، لیکن باشعور شعراء نے یہ بھی باور کرا دیا کہ قافیہ پیمائی بھی ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں، یہ بھی ایک فن ہے۔

ہیئت کے برعکس غزل کے موضوعات پر بھی اعتراضات ہوئے ہیں، کلاسکی غزل کے بیشتر موضوعات عشق و عاشقی تک محدود تھے۔غالب کے دور میں غزل کو نئی فکر ملی اور غالب نے اس کے دامن کو وسعت معنی اور فکری جہت سے مالا مال کیا اور آج تک غزل میں اتنی وسعت موجود ہے کہ اس نے ہر طرح کے موضوعات کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا ہے۔اس نے خارجی و داخلی اور عصری و مقامی ہر طرح کے رنگ و آہنگ سے خود کو ہمکنار کر لیا ہے۔یہ الگ بات ہے کہ اب بھی غزل میں عشق و عاشقی اور حسن و جمال کے بے شمار اشعار ملتے ہیں۔

غزل کے اندر اپنے زمانے سے مطابقت پیدا کرنے کی طاقت موجود ہے، اس نے ہمیشہ اپنے زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ دیا ہے۔اور بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ اپنے اندر تبدیلی پیدا کی اور یہ بات ترقی پسند تحریک کے دور میں بھی صادق آتی ہے۔اس تحریک نے نظم کی صنف کو فروغ دیا اور اس تحریک سے وابستہ بیشتر شاعروں نے غزل کی مخالفت کی، اس کے باوجود کچھ شاعر ایسے بھی تھے جنہوں نے اس

دور میں بھی اپنے خیالات اور اشتراکی مسائل کے اظہار کا وسیلہ نظم کے ساتھ غزل کو بھی بنایا۔ یہ بات فیض احمد فیض اور معین احسن جذبی پر صادق آتی ہے۔

اس کے بعد جدیدیت، مابعد جدیدیت اور موجودہ دور کی غزل کا مطالعہ کریں تو یہاں بھی غزل میں زمانے کی رنگارنگی اور داخلی وخارجی موضوعات نظر آتے ہیں۔ موجودہ عہد کا خوف، بربریت، ظلم، فرقہ وارانہ فساد، تنہائی، معاشرتی وتہذیبی انتشار، جنگل اور قدرتی وسائل کی بربادی، بے چینی، ذاتی وروحانی غم اور داخلی کرب وغیرہ کو غزل کے اندر پیش کیا جاتا رہا ہے۔ ان کے اظہار کے لیے فنکاروں نے علامت نگاری، پرانی علامتوں کے ساتھ نئی علامتوں کو وضع کیا۔ غرض کہ ہم کہ سکتے ہیں غزل زمانہ قدیم سے آج تک شاعروں کی محبوب ترین صنف سخن رہی ہے۔ اور زمانہ قدیم کی طرح موجودہ عہد میں بھی غزل کے شعراء کی ایک طویل فہرست موجود ہے جو اپنی تخلیقی ذہن اور گہرے مطالعہ ومشاہدہ کے ذریعہ اس کے دامن کو وسیع کر رہے ہیں۔

زاہدہ زیدی کا شمار بھی موجودہ عہد کے ان فنکاروں میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنے ذاتی وداخلی تجربات واحساسات اور خارجی وعصری ماحول سے غزل کی روایت کو آگے بڑھانے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ زاہدہ زیدی کو نظم اور غزل دونوں میں یکساں دلچسپی تھی اور جس طرح انہوں نے نظموں میں باریک بین، لطیف، ذاتی، عصری اور لافانی موضوعات کے ساتھ ساتھ نظم کی موجودہ فکری وفنی خصوصیات کو استعمال کر کے اپنی شاعری کو وسعت وگہرائی عطا کی اسی طرح انہوں نے غزل کو بھی نہ صرف ذاتی فکر واحساسات کے ساتھ بلکہ غزل کی خارجی خصوصیات کو برتتے ہوئے انہوں نے دنیاوی مسائل والم، عصری تقاضوں اور اپنی تخلیقی کاوشوں سے غزل کے دامن کو وسیع کیا ہے۔

موجودہ عہد کی شاعری پر اگر نظر ڈالی جائے تو ہمیں مرد اور خواتین دونوں حضرات کی شاعری میں ایسے موضوعات کی بھر ملے گی جن میں موجودہ عہد کے خوف، ہراس، تشدد، تنہائی اور ذاتی غم میں تمام انسانوں کے دکھ درد کی عکاسی وغیرہ۔ اور پھر ان موضوعات کو پیش کرنے کے لیے شاعروں کا گنجلک اور پیچیدہ تشبیہات واستعارات اور علامتوں کا استعمال کرنا کلیدی اہمیت رکھتا ہے۔

حالیہ غزل پر روشنی ڈالتے ہوئے زاہدہ بھی لکھتی ہیں:

اس دور کی غزلوں میں موضوعات اور شعری اسلوب دونوں اعتبار سے کافی تنوع ہے۔موضوعات کے اعتبار سے بھی حالیہ غزل پرانی روش کو خیر آباد کہہ کرنئی راہوں پر گامزن ہونے کے لیے کوشاں ہے۔مثلاً اس میں انقلابی لہجے کی جھنکار اب کم سنائی دیتی ہے۔جو ترقی پسند دور کی ایک نمایاں خصوصیات تھی لیکن ظلم ،ناانصافی ،ریاکاری اور مصنوعی اقدار کے خلاف پروٹیسٹ کا جذبہ جابجا محسوس کیا جاسکتا ہے۔39؎

اگرزاہدہ زیدی کی غزلوں کی بات کی جائے تو ان کے یہاں داخلی تجربات اور بصیرتوں کے ساتھ ساتھ ہمیں خارجی ماحول اور مسائل بھی انہیں متاثر کرتے ہیں۔ان کے یہاں بھی گنجلک اور مہمل انداز بیان اور مخصوص شعری پیکرواستعارے نظر آتے ہیں۔اوران کی ذاتی کیفیات واحساسات اور شدید جذبات کے اظہار اور داخلی سوزوگداز کا نتیجہ ہے۔ان کی غزلوں کے موضوعات میں فرقہ وارانہ فسادات کے علاوہ سماجی ظلم وناانصافی ،کربلا،تنہائی ،آزادی ،داستان حسن وعشق کے ساتھ ،وقت ،موت ،فطرت انسانی اورتخلیق شعروغیرہ ان کے محبوب موضوعات ہیں۔یہ کہا جائے تو بجا ہوگا کہ زاہدہ زیدی نے خارجی اور داخلی دونوں جذبات کی بھرپور عکاسی کی ہے۔زاہدہ زیدی نے فرقہ وارانہ فسادات اور دہشت گردی کے واقعات پرتو نہ صرف ڈرامے لکھے بلکہ نظم اور غزل میں بھی انہوں نے ان موضوعات پر قلم اٹھایا اور سانحہ گجرات وعراق پر نظم اور غزل دونوں لکھیں مجموعہ ’’شام تنہائی‘‘ میں شامل غزلیں اور نظمیں اس بات کا واضح ثبوت ہیں۔سانحہ گجرات (زلزلہ) سے متعلق غزل لکھتی ہیں؛

فنا ساماں یہ کیسا زلزلہ ہے — قیامت ہے کہ یہ قہر خدا ہے
ہلاکت خیز ہے لرزش زمیں کی — کہ ہر سو فتنۂ محشر بپا ہے
ہیں سڑکوں پر ہراساں غم کے مارے — نہ سر پر چھت نہ بستر نے غذا ہے
وہ بچے دب گئے ملبے کے اندر — کہ خود معصومیت جن پر فدا ہے
زمیں پر ہر طرف بکھریں ہیں لاشیں — فضامیں نالۂ غم گونجتا ہے 40؎

اسی طرح انہوں نے سانحہ عراق اورعراق میں ہونے والے ظلم وانصافی اور بربریت سے متعلق غزل ’’نغمۂ حق بے نوا ہے‘‘ لکھی:

جنس الفت رائیگاں ہے — ظلم ودہشت کامراں ہے

شعلہ زن جلتی زمیں ہے — خون روتا آسماں ہے
آسمانوں سے زمیں تک — ظلم کا دریا رواں ہے
جبر کی آندھی کی زد پر — درد دل کا کارواں ہے
تشنگی زاد سفر ہے — اسپ ہمت نیم جاں ہے
دشت مایوسی میں تنہا — دل جلوں کا کارواں ہے
ان سلگتی بستیوں سے — یاس کا اٹھتا دھواں ہے
آدمیت سر بزانو — بربریت شادماں ہے
روح انساں کو کچل کر — نسل شیطاں حکمراں ہے
شور باطل خندہ زن ہے — نغمۂ حق بے زباں ہے 41

اس طرح کے بہت سے اشعار ان کے مجموعہ کلام میں جاتے ہیں۔

مری پیاری زمیں شیطانوں نے ہتھیالی
جہاں تک دیکھئے یلغار شہر ہے اور میں ہوں 42

اور پھر ان ظلم و دہشت اور بربریت بپا کرنے والے شیطانوں کے خلاف حق کا اظہار کرنے کا اعلان کرتی ہیں:

ظلم و بیداد پہ ہو جن کی خدائی کی اساس — ان خداؤں سے تو انکار ضروری ہوگا
ہم تو عیسیٰ ہیں نہ منصور ہیں لیکن پھر بھی — حق کا اظہار سردار ضروری ہوگا
جب بھی مقتل میں حسین ابن علی آئیں گے — لشکر کفر سے تکرار ضروری ہوگا 43

زاہدہ زیدی نے موجودہ عہد کی فرقہ وارانہ سازش، ظلم، خوف و دہشت گردی پھیلانے اور انسانیت کو تباہ کرنے والوں کو نمرود اور اس دنیا کو کربلا کا میدان کہا ہے۔

کون ڈھائے گا ظلم کی دیواری — دیکھنا ہے کہ کس میں دم خم ہے
دشت ظلمت میں کاروانِ حیات — کربلا تیرا فاصلہ کم ہے
کس کی چادر چھنی ہے کس کے گہر — کس کی بے چارگی کا ماتم ہے
کس کا کومل بدن ہے خون میں تر — کس کے غم میں ہر آنکھ پر نم ہے 44

چارسو کوچہ وبازار میں محشر ہے بپا
خوف سے لوگ نکلتے نہیں اپنے گھروں سے45ؔ

عشق جو شاعری کا محبوب ترین موضوع ہے،شاعر کا اپنا ذاتی تجربہ بھی ہوتا ہے اور داخلی طور پر انسانی جذبات سے وابستہ بھی ہوتا ہے اس کو زاہدہ زیدی نے مختلف طریقے سے بیان کیا ہے۔مگر عشق کا یہ تصور ان کے یہاں خوشی ونشاط،وصل اور محبوب کا دیدار پانے سے زیادہ یاد ماضی سے وابستہ ہے۔اور اب ان کے حصہ میں صرف انتظار،جدائی اور زمانے کی تبدیلی کے ساتھ محبت کے بدل جانے پر منحصر ہے۔وہ کہتی ہیں؛

کہیں ہیں رفاقت کی دلبری ہے،کہیں محبت کی دل نوازی
کہیں ہیں نزدیکیاں فروزاں کہیں سمٹتے ہیں فاصلے سے 46ؔ

وہ وقفِ ناز نہیں،میں بھی وفا شعار نہیں
ہمارا عہد محبت بھی استوار نہیں 47ؔ

متاع عشق ترا اعتبار کیوں کر ہو خزاں کی رت میں یقیں کیوں کر ہو 48ؔ

کبھی عشق ساز حیات تھا کبھی سوز دل نے جلا دیا
کبھی وصل میں بھی کسک رہی کبھی دردوغم نے مزہ دیا
وہ وصال یار کی برکتیں،یہ شب فراق کے حوصلے
مرا دل نشاط سے بھر دیا مجھے درد حد سے سوا دیا 49ؔ

وصال یار کی ساعت میں یہ ہوا معلوم کہ جسم و جاں کا یہ پیرہن بھی میلا تھا 50ؔ

اور عشق کے اس رنج والم کے ساتھ انہوں نے اپنے خوابوں کے ٹوٹنے کا بھی بارہا ذکر کیا ہے۔

نگر ہے آباد دل کا اب بھی،مگر ہے اک وسوسوں کی بستی
کبھی اس راہ سے گزرتے تھے مست وپرشور قافلے سے51ؔ

سنا رہی ہیں وفا کی راہیں شکستِ پرواز کا فسانہ
کہ دور تک وادیٔ طلب میں پڑے ہیں ہر سمت خواب ٹوٹے52ؔ

ہر ساز نغمہ ریز تھا جب دل کی تال پر عشق فسوں طراز کے وہ مشغلے کہاں 53ؔ

ریزہ ریزی ہیں جسم خوابوں کے   ٹکڑے ٹکڑے بکھر گئی ہے رات 54

وقت کی اہمیت سے کسے انکار ہے اسے تو وقت سیل رواں کہا جاتا ہے جو اپنے ساتھ ہر چیز کو بہا لے جاتا ہے۔زاہدہ زیدی نے اسی وقت کو مجسم بنا کر پیش کیا ہے۔انہوں نے اپنی نظموں اور غزلوں دونوں میں وقت کے تصور کی تجسیم پیش کی ہے۔اور اسے گہرے سمندر کا استعارہ بنا کر پیش کیا ہے اور برق رفتار بتایا ہے تو کبھی اسے رنگین تتلی سے بھی تشبیہ دی ہے جسے وہ اپنی مٹھی میں قید کرنا چاہتی ہیں۔مگر وقت جو کسی کے ہاتھ نہیں آتا بلکہ اپنے ساتھ یہ ہر چیز کو بہا کر لے جاتا ہے۔وقت کے بارے میں انہوں نے کچھ اس طرح اظہار خیال بھی کیا ہے:

وقت، جو نہ صرف ایک فلسفیانہ تصور ہے بلکہ ایک گہری پر اسرار اور بے پایاں حقیقت بھی ہے۔جسے میں نے گہرے طور پر محسوس بھی کیا ہے۔اور جس نے مجھے فکر و تامل کی دعوت بھی دی ہے یہ بھی میری شاعری کا ایک تکراری موضوع ہے جسے میں نے مختلف انداز سے شعری اظہار میں ڈھالا ہے۔

ہے وقت سیل رواں تیز گام لمحوں کا
جو کھو گیا ہے وہ لمحہ مگر ملے نہ ملے 55

زاہدہ زیدی نے یاد ماضی، تہذیب کی شکست و ریخت اور دور حاضر میں بدلتی ہوئی اقدار پر اپنے ذاتی تجربات و احساسات کا اظہار کیا ہے۔اور شاید یہ موضوع عہد حاضر کی شاعری کا تکراری موضوع ہے۔جہاں ہمیں انسانی اقدار کے اتھل پتھل ہو جانے کا عکس نظر آتا ہے۔

ماضی کے مزاروں کی طرف سوچ کے بڑھنا
ہو جاؤ گے مایوس نہ کھودو یہ دفینے 56

اداس، اداس سے وہ بے نوا در و دیوار   اجاڑ، اجاڑ سی وہ محفل شناسائی 57

گریز ناوابستگی سے کیوں ہے، اسی کو بڑھ کر گلے لگا لو
یہی رفیق نشاطِ ساماں، کہ جو تھے اپنے ہوئے پرائے 58

اور اسی کے ساتھ ان کے یہاں مایوسی، ذات غم، ناامیدی اور تنہائی چھا جاتی ہے اور انہیں اس بھری دنیا میں بھی کوئی اپنا دکھائی نہیں دیتا۔

امیدوبیم کے صحرا میں یہ طویل سفر　　تپش یہ سوز دروں کی یہ آبلہ پائی ہے59

سب امیدوں کے بجھ رہے ہیں دیے　　شہر صد آرزوباقی نہیں 60

سکوت شب ،ہجوم ناامیدی　　شمار داغ ہائے زیست اور ہم 61

یہ سیل روز وشب میں کھونہ جائے　　سفینہ زیست کا بے بادباں ہے 62

سنائیں کس کو یہ روداد کاوش ناکام　　کہ یہ فسانۂ غم تو کہا سنا ہوگا 63

ناساز دل کو تم خاموش جانو　　کہ پردے میں فغاں اندر فغاں ہے 64

ناامیدی اور دردوغم کے علاوہ زاہدہ زیدی کے یہاں تنہائی کا احساس بیشتر جگہ دیکھنے کو ملتا ہے۔اور اس احساس کو انھوں نے اسی شدت جذبات کے ساتھ بیان بھی کیا ہے:

ہماری بزم بصیرت،ہماری شمع خیال　　وہ ہم نہیں جنہیں اوروں کا آسرا ہوگا 65

یہ راہ سخت،یہ دشت الم کی پہنائی　　قدم قدم پہ ہمیں ڈس رہی ہے تنہائی 66

لیکن وہ جس تنہائی کے خوف سے مایوس اور اداس ہیں اسی تنہائی کو ذات عرفان اور خودی کے لیے کارگر بھی سمجھتی ہیں۔کیوں یہ وہ تنہائی نہیں جہاں انسان خودکوغم زدہ اورتن تنہا سمجھتا ہے بلکہ یہ وہ تنہائی ہے جو انسان کواس کی ذات کی آ گاہی کا شرف بخشتی ہے۔

فشار زیست سے فرصت اگر دیتی ہے اگر تنہائی　　تو اپنے خانہ زادوں کو خبر دیتی ہے تنہائی

خرد کے فاصلے مٹتے ہیں پرواز تخیل سے　　فضائے زندگی میں بال وپر دیتی ہے تنہائی

شعاع نور ربانی شعور وحدت ہستی　　بہت نایاب تحفے ہیں مگر دیتی ہے تنہائی

یہ بحر عشق سے نایاب موتی چن کے لاتی ہے　　شعور غم،نگاہ معتبر دیتی ہے تنہائی 67

زاہدہ زیدی نے ذات کے کرب وغم کا بھی جگہ جگہ اظہار کیا ہے۔

خشک ویرانوں میں کھوجائے نہ جوئے غم ذات　　اس میں گھلنے دو ابھی گنگ وجمن کی آواز 68

تہذیب الم کہیے کہ عرفان غم ذات　　کہنے کوتو دولفظ ہیں پر بات بڑی ہے 69

دور حاضر کی غزل میں ''موت'' بھی ایک اہم موضوع رہا ہے۔اور زاہدہ زیدی نے بھی اس موضوع کو اپنی شاعری میں مختلف انداز سے پیش کیا ہے۔جہاں اس مختصر زندگی کا وقفہ انہیں کم نظر آ تا ہے۔

یہ خواہش ہے کہ اپنے ذہن میں صدیاں سمیٹوں　　پہ عرصہ زندگی کا مختصر ہے اور میں ہوں 70

کس اہتمام سے پڑھتے رہتے ہیں صحیفۂ زیست چلیں کہ ختم ہوئی اب وہ کہانی بھی 71

حیات کی جوئے دردوغم میں سفینے امیدوآرزو کے

بہ شکل موجِ نسیم ابھرے، برنگ جسم حباب ٹوٹے72

ایک زنداںِ حوادث میں ہے پابستہ حیات فکر آوارہ سے پوچھوتو کدھر جائے گی 73

مڑکر دیکھا تو ہمیں چھوڑ کر جاتی تھی حیات ہم نے جانا تھا کوئی بوجھ گرا ہے سر سے 74

انہیں موت کی حقیقت سے انکار نہیں مگر ان کے اندر زندگی جینے کی امنگ بھی ہے اور وہ زندگی کے دکھ درد اور مصیبت و پریشانی سے مقابلہ کرنے کا عزم وحوصلہ بھی رکھتی ہیں۔

ہم نے طوفانوں سے پیمانِ وفا باندھا ہے کہ دو ہر موج تلاطم سے مقابل ہوجائے 75

کاٹ کرموج آب،موج سراب بزم انجم میں جانکلتے ہیں 76

مجھے معلوم نہ تھا خدایا،یہ تیری دنیا حسیں ہے اتنی

حسیں نظاروں کے گلستاں میں،حسیں چہروں کے گل کھلے سے77

اور یہی وجہ ہے کہ وہ ہر جگہ پر امید نظر آتی ہیں۔

دکھوں کے اک بحر بیکراں میں امید کی شمع جل رہی ہے

شکستہ پائی کی بے نوائی میں زندگانی کے ولولے سے 78

اور اب ہم ان اشعار کی طرف بھی نظر ڈالیں گے جہاں زاہدہ زیدی نے فطرت کے گونا گوں مظاہر کی عکاسی کی ہے۔اور جن کا استعمال موجودہ غزل میں وسیع تر معنی میں کیا گیا ہے۔

سرخ مٹی کی ردا اوڑھے ہے نیلا آکاش نہ شفق پھولے نہ رم جھم کہیں بادل برسے 79

جہاں جنگل، شجر، کوہسار، آسمان، زمین، خزاں، بہار، صحرا، سمندر، پانی، کشتی، پتھر، کنکری، زلزلہ، صبح، شام، اندھیری رات وغیرہ کو معنی خیز انداز میں استعمال کیا گیا ہے۔

غموں کے بحر میں جب دل کی کشتی ڈگمگاتی ہے

تو پوشیدہ جزیروں کی خبر دیتی ہے تنہائی 80

اندھیری رات کا لمبا سفر ہے اور میں ہوں

دل سوزاں چراغ رہگزر ہے اور میں ہوں81

صبا اشکوں سے دامن دھورہی ہے   اداسی بال کھولے سورہی ہے 82

شاید آئے سحر گئی ہے رات   زہرغم پی کے مرگئی ہے رات 83

ہری اب نہ شاخِ عنایات ہوگی   نہ غنچے کھلیں گے نہ برسات ہوگی 84

قطرۂ آب کو کب تک مری دھرتی ترسے
آگ لگ جائے سمندر میں تو پانی برسے85

زاہدہ زیدی نے اپنی شاعری میں ایک چیز جس کا بار بار ذکر کیا ہے وہ تخلیق شعراور تخلیقی تجربہ ہے۔جس کے لیے انہوں نے شدت فکرواحساس،سوزوساز،احساس حسن،تخیل،تجسس،تلاش،پیہم خلیش ،بے چینی، پرشکوہ الفاظ اورمعنی آفرینی کوضروری بتایا ہے۔اور جسے انہوں نے تخلیق کار کی شخصیت کا ایک معنی خیز خاکہ بھی ہے۔جس کے ذریعہ ایک فنکارنادر تشبیہوں،ترکیبوں اوراستعارات کا استعمال کرکے اپنے معاصرشعراء میں انفرادیت قائم کرتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ زاہدہ زیدی نے شعروادب کی دنیا میں ہونے والی سیاست ،جھوٹ،بے ایمانی اورخوشامد کے خلاف ڈرامہ’’کیوں کے اس بت سے رکھوں جان عزیز‘‘ لکھا اور اس کے علاوہ اپنے بہت سے اشعار میں بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

لٹادی فن کی دولت بے حسوں میں   مرے حصے میں احساس زیاں آیا 86

جل اٹھے ذہن کے ایوانوں میں لفظوں کے چراغ
آج پھر گرمیٔ انداز بیاں رقص میں ہے 87

بدلتے جا رہے ہیں رفتہ رفتہ زیست کے عنوان
متاع فکرودانش داؤں پر ہے اور میں ہوں 88

زر پرستوں سے جو ٹھنتی ہے تو ٹھن جانے دو
تم نہ زنہار مگر حرمت فن جانے دو 89

فن تو متروک ہوا اور سیاست غالب
ورنہ ہر ذرہ یہاں میرا ثنا خواں ہوتا 90

فکر، ادراک، ہوش، جوش جنوں
درد کی سرحدوں میں پلتے ہیں 91

مذکورہ اشعار کے حوالے سے ہمارے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ زاہدہ زیدی کی شاعری کا میدان کس قدر وسیع اور گہرا ہے۔انہوں نے خارجی وداخلی مسائل کے ساتھ حیات وکائنات کے ہر اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے جو ایک حساس فنکار کو متاثر کرسکتا ہےاور زاہدزیدی ایک ایسی ہی فنکار تھیں
جن کو دنیا رنج وغم ،خوشی وشادمانی ،ناامیدی ،مایوسی ،زندگی کے ہنگامے ،موت کی حقیقت تک کو اپنی شاعری میں سمیٹ لیا ہے۔

زاہدہ زیدی کے کلیات میں ہمیں ایسی غزلیں بھی کثرت سے مل جاتی ہیں جو انہوں نے اپنے محبوب اور پسندیدہ شخصیتوں کی نذر کی ہیں۔ان شخصیتوں میں میرتقی میر ،غالب ،حالی ،اقبال ،فیض احمد فیض اور فراق گورکھپوری پر انہوں نے غزلیں لکھی ہیں۔

پروفیسر عتیق اللہ ان کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنی کتاب ''ترجیحات'' میں لکھتے ہیں:

زاہدہ زیدی کا مرغوب موضوع نیستی اور بے معنویت کے پہلو بہ پہلو تخلیق اور تخلیق کا کرب ہے۔ان کے شعر کے موضوعی مضمرات اصلاً وجودی تجربات ہی سے عبارت ہیں۔وہ اس معنئ گریز کی تلاش میں سرگرداں رہتی ہیں ،جو رگِ حیات میں مخفی ہے۔اوراس رمز کے کشود کی متمنی ہیں جو بطن کائنات میں نہاں ہے۔92

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان کی شاعری میں متضاد ،المناک اور پریشان کن تاثرات کے ٹکراؤ اور تصادم سے ایک نئی تصویر ابھرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ان کے یہاں داخلی کیفیات کو علامتی پیکر یا ایک مربوط استعاراتی نظام کی مدد سے شعری اظہار میں ڈھالا گیا ہے۔جسے انہوں نے مختلف طریقے سے پیش کیا ہے۔اور چونکہ زاہدہ زیدی نے عالمی ادب ،نفسیات ،تاریخ ،فلسفہ ،تصوف اور مذہب کا وسیع مطالعہ کیا تھا اس لیے ان کی شاعری میں ذاتی زندگی کے مسائل کے علاوہ فطری ،سماجی ،سیاسی ،اقتصادی ،معاشرتی اور معاشی ہر طرح کے موضوعات کا استعمال ملتا ہے۔اور یہی سب خصوصیات ان کی شاعری کو عظیم بناتی ہیں۔انہوں نے خود عظیم شاعری کی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا ہے:

شاعری خواہ عورتوں کی ہو یا مردوں کی ،جو خصوصیات اور خوبیاں اسے عظیم شاعری بناتی ہیں وہ دونوں میں مشترک ہیں اور یہ خصوصیات ہیں ،شدت فکر واحساس ،تجربے کی وسعت اور گہرائی ،تخیل کی فراوانی ،تخلیق عمل کی شدت اور

گیرائی، والہانہ جذبوں کی فراوانی اور آرزو، تمنا، شوق، حیرت اور انسانوں کے مسائل اور انسان کے مقدر سے گہری وابستگی، تاریخی شعور، وقت کی بیکرانی اور موت کی ہمہ گیری کا ایک گہرا تصور، احساس حسن اور فطرت سے والہانہ وابستگی، آفاقی وژن اور ماورائی احساس، انکشاف ذات اور عرفان کائنات، تجربے کو بصیرت اور فکر کو فکر محسوس میں ڈھالنے کی صلاحیت، زبان اور اس کے تخلیقی وسائل پر غیر معمولی دسترس، شعری اظہار میں تہ داری رمز و آہنگ کی ندرت، پیکر تراشی کی ندرت اور تنوع، علامتی اظہار اور استعاراتی نظام کی انفرادیت اور معنویت، روایت کا گہرا شعور۔93؎

ان تمام خصوصیات کو زاہدہ زیدی نے ایک عظیم شاعری کے لیے ضروری قرار دیا ہے۔اور یہ وہ خصوصیات بھی ہیں جن کو انہوں نے خود اپنی شاعری میں بھی استعمال کیا ہے۔

حوالے:

1۔ زاہدہ زیدی؛لذتِ آشنائی، علی گڑھ، آبشار پبلیکیشنز، 2003ء، ص، 190

2۔ نجمہ رحمانی، آزادی کے بعد اردو شاعرات، نئی دہلی: ایم۔آر۔پبلی کیشنز، 2017ء، ص، 109

3۔ ایضاً، ص، 68

4۔ ایضاً، ص، 147

5۔ مسعودہ حیات، بوئے سمن، مکتبہ جامعہ لیمیٹڈ، دہلی، 1981ص، 05

6۔ ساجدہ زیدی، آتش سیال، مکتبہ جامعہ، دہلی، 1972ص، 13

7۔ فرمان فتح پوری، صرف شاعرات، گنج شکر پریس، لاہور، 2009ص، 159

8۔ ثمینہ راجہ، ہویدا، مستقبل پبلیکیشنز، اسلام آباد، 1995ص، 26

9۔ زاہدہ زیدی؛لذتِ آشنائی، علی گڑھ، آبشار پبلیکیشنز، 2003ء، ص، 182

10۔ زاہدہ زیدی، زہر حیات، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، 1970ص، 127

11۔ ایضاً، مال آرزو، ص، 15

12۔ ایضاً، ص، 24

13۔ ایضاً،اندھیرا،ص،17/18

14۔ ایضاً،اندھیرا،ص،17/18

15۔ ایضاً،وصل،ص،9/10

16۔ ایضاً،حصار،ص،49

17۔ ایضاً،تکمیل بے مایہ،،ص60

18۔ زاہدہ زیدی؛ سنگ جاں،نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ،1989ء،ص،129

19۔ نجمہ رحمانی،آزادی کے بعد اردو شاعرات،نئی دہلی: ایم۔آر۔پبلی کیشنز،2017ء،ص135

20۔ زاہدہ زیدی؛ سنگ جاں،نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ،1989،زہر کی لہر،ص85

21۔ ایضاً،زہر کی لہر،ص89

22۔ ایضاً،یہ کیا ترا نظام ہے،ص77

23۔ زاہدہ زیدی؛شعلہ جاں،علی گڑھ: آبشار پبلی شرز،2000ء،وقت کی سرحدوں سے پرے،ص61

24۔ ایضاً،یہ وقت کا بیکراں سمندر،ص65

25۔ ایضاً،یہ لمحہ،ص66

26۔ زاہدہ زیدی؛لذتِ آشنائی،علی گڑہ،آبشار پبلیکیشنز،2003ء،صفحہ 190

27۔ ایضاً،زلزلہ،ص73

28۔ ایضاً،جشن بربریت،ص74/75

29۔ ایضاً،کربلا پھر کربلا،ص83/84

30۔ ایضاً،ص،95

31۔ زاہدہ زیدی؛ شامِ تنہائی،نئی دہلی: انجمن ترقی اردو ہند،2008ء،ص97

32۔ زاہدہ زیدی؛شعلہ جاں،علی گڑھ: آبشار پبلی شرز،2000ء،،ص,34

33۔ ایضاً،فکر و اظہار سے ماورا،ص50

34۔ زاہدہ زیدی؛شعلہ جاں،علی گڑھ: آبشار پبلی شرز،2000ء،فردوس گمشدہ،ص97

35۔ پروفیسر عتیق اللہ، ترجیحات، ایم، آر، آفسٹ پرنٹرز، دہلی، 2002)

36۔ زاہدہ زیدی؛ شعلہ جاں، علی گڑھ: آبشار پبلی شرز، 2000ء، حسن ازل۔۔۔بے زباں، ص، 73

37۔ ادبی تنقید اور اسلوبیات، دہلی ایجوکیشنل بک ہاؤس، دہلی، 1989 ص، 69-368

38۔ محمد حسن، شاعر (نثری اور غزل نمبر)، جلد 54 شمارہ 7/8 ص 16-15

39۔ زاہدہ زیدی؛ لذتِ آشنائی، علی گڑھ، آبشار پبلیکیشنز، 2003ء، ص، 95-194

40۔ زاہدہ زیدی؛ شامِ تنہائی، نئی دہلی: انجمن ترقی اردو ہند، 2008ء، ص، 73

41۔ ایضاً، ص، 87-86

42۔ ایضاً، ص، 60

43۔ ایضاً، ص، 121

44۔ ایضاً، ص، 66

45۔ زاہدہ زیدی؛ سنگ جاں، نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، 1989ء، ص، 123

46۔ ایضاً، ص 128

47۔ زاہدہ زیدی؛ دھرتی کا لمس، علی گڑھ: لیتھو کلر پرنٹرس، 1975ء، ص 118

48۔ زاہدہ زیدی؛ شعلہ جاں، علی گڑھ: آبشار پبلی شرز، 2000ء، ص 112

49۔ ایضاً، ص 122

50۔ زاہدہ زیدی؛ شامِ تنہائی، نئی دہلی: انجمن ترقی اردو ہند، 2008ء، ص 64

51۔ زاہدہ زیدی؛ سنگ جاں، نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، 1989ء، ص، 129

52۔ زاہدہ زیدی؛ زہرِ حیات، انجمن ترقی اردو ہند، 1970ء، ص 122

53۔ زاہدہ زیدی؛ شامِ تنہائی، نئی دہلی: انجمن ترقی اردو ہند، 2008ء، ص 53

54۔ زاہدہ زیدی؛ دھرتی کا لمس، علی گڑھ: لیتھو کلر پرنٹرس، 1975ء، ص 121

55۔ زاہدہ زیدی؛ شامِ تنہائی، نئی دہلی: انجمن ترقی اردو ہند، 2008ء، ص 56

56۔ ایضاً، ص، 59

57۔ زاہدہ زیدی؛شعلہ جاں،علی گڑھ: آبشار پبلی شرز،2000ء،ص124،

58۔ زاہدہ زیدی؛ زہرِ حیات،انجمن ترقی اردو ہند،1970ء،ص124،

59۔ زاہدہ زیدی؛شعلہ جاں،علی گڑھ: آبشار پبلی شرز،2000ء،ص124،

60۔ زاہدہ زیدی؛ زہرِ حیات،انجمن ترقی اردو ہند،1970ء،ص115،

61۔ ایضاً،117

62۔ زاہدہ زیدی؛ شامِ تنہائی،نئی دہلی: انجمن ترقی اردو ہند،2008ء،57

63۔ ایضاً،55

64۔ ایضاً،47

65۔ ایضاً،55

66۔ زاہدہ زیدی؛شعلہ جاں،علی گڑھ: آبشار پبلی شرز،2000ؒ،124

67۔ زاہدہ زیدی؛ شامِ تنہائی،نئی دہلی: انجمن ترقی اردو ہند،2008ء،ص51،

68۔ زاہدہ زیدی؛ سنگ جاں،نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ،1989ء،ص122،

69۔ ایضاً،117

70۔ زاہدہ زیدی؛ شامِ تنہائی،نئی دہلی: انجمن ترقی اردو ہند،2008ء،60

71۔ زاہدہ زیدی؛ دھرتی کالمس،علی گڑھ: لیتھوکلر پرنٹرس،1975ء،124

72۔ زاہدہ زیدی؛ زہرِ حیات،انجمن ترقی اردو ہند،1970ء،ص122،

73۔ ایضاً،120

74۔ زاہدہ زیدی؛ سنگ جاں،نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ،1989ء،ص123،

75۔ زاہدہ زیدی؛ زہرِ حیات،انجمن ترقی اردو ہند،1970ء،ص110،

76۔ زاہدہ زیدی؛ سنگ جاں،نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ،1989ء،ص119،

77۔ ایضاً،128

78۔ ایضاً128

79۔ ایضاً،123

80۔ زاہدہ زیدی؛ شامِ تنہائی ،نئی دہلی: انجمن ترقی اردو ہند،2008ء،52

81۔ ایضاً،60

82۔ ایضاً،65

83۔ زاہدہ زیدی؛ زہرِ حیات ،انجمن ترقی اردو ہند،1970ء،ص،121

84۔ ایضاً،122

85۔ زاہدہ زیدی؛ سنگ جاں ،نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ،1989ء،ص،123

86۔ زاہدہ زیدی؛ شامِ تنہائی ،نئی دہلی: انجمن ترقی اردو ہند،2008ء،47

87۔ ایضاً،50

88۔ ایضاً،60

89۔ ایضاً،67

90۔ زاہدہ زیدی؛ شعلہ جاں ،علی گڑھ: آبشار پبلی شرز،2000ء،ص، 129

91۔ زاہدہ زیدی؛ سنگ جاں ،نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ،1989ء،ص،119

92۔ عتیق اللہ،ترجیحات،ایم۔آر۔آفسیٹ پرنٹر،دہلی،2002

93۔ زاہدہ زیدی؛ شعلہ جاں ،علی گڑھ: آبشار پبلی شرز،2000ء،ص،34

☆☆☆

باب سوم

زاہدہ زیدی کی ڈراما نگاری اور ناول نگاری

ڈرامے کا فن:

جیسا کہ ہمیں معلوم ہے کہ ڈرامے کی صنف سب سے قدیم ہے۔ جسے تمام فنون لطیفہ کا مجموعہ بھی کہا جاتا ہے۔ دنیا میں سب سے پہلے اس صنف نے یونان اور ہندوستان میں جنم لیا۔ یونان میں چھٹی صدی قبل مسیح سے اس کے نمونے منتشر شکل میں ملتے ہیں لیکن ہندوستان کی بات کی جائے تو یہاں ڈرامہ ''بھرت ناٹیہ شاشتر'' کے منظّم فنی قانون کی شکل میں ملتا ہے۔ یونانی ڈراما اور ہندوستان میں سنسکرت ڈرامے کی روایت کو دنیا کی قدیم ترین روایت میں شامل کیا جاتا ہے۔

اردو اسٹیج اور ڈرامے کی روایت پر نظر ڈالی جائے تو اس کی کا ابتدا امانت لکھنوی ''اندر سبھا1852'' سے مانی جاتی ہے۔تب سے اب تک اردو ڈراما اور اسٹیج نے کافی ترقی کی ہے۔ جو خاص کر مغربی ڈراما کے زیر اثر پروان چڑھی۔لیکن جدید مغربی ڈراما کے اثرات ''اندر سبھا'' کے بعد ہی نظر آتے ہیں۔اس سے پہلے ڈراما کو 'واجد علی شاہ'' کی رنگین طبیعت نے اودھ میں خاصا فروغ دیا تھا۔اس سلسلے میں واجد علی شاہ کا ''رادھا کنہیا'' اہم ہے۔واجد علی شاہ نے اودھ میں باقاعدہ رہس بنوایا اور پری خانہ قائم کیا جس کے ساز وسامان کے لیے واجد علی شاہ نے کئی ہزار روپے بھی خرچ کیا۔اس نے نقالوں اور کئی حسین وجمیل عورتوں کو بھی رکھا۔جن سے واجد علی شاہ ڈرامے پیش کرواتا۔امانت لکھنوی کا ''اندر سبھا'' جس کو اردو کا پہلا منظوم ڈراما کہا جاتا ہے وہ بھی واجد علی شاہ کی فرمائش پر لکھا گیا تھا۔اندر سبھا نے نہ صرف لوگوں کی دلچسپی کا سامان فراہم کیا تھا بلکہ اس میں اردو زبان کا صاف وسلیس استعمال بھی ملتا ہے۔اور ساتھ ہی ساتھ لکھنؤ کی تہذیب ومعاشرت کی عکاسی بھی نظر آتی ہے۔

اندر سبھا کے بعد ڈراما ترقی کی راہ پر گامزن ہو چکا تھا۔اندر سبھا کے بعد بہت سے ڈرامے لکھے گئے۔اور تھیٹر کمپنیاں بھی قائم ہوئیں۔جن میں ممبئ کی وکٹوریہ کمپنی اور الفریڈ تھیٹر یکل کمپنی وغیرہ ممبئ میں قائم ہو چکی تھیں۔بہرام جی فریدوں کا ڈراما''خورشید'' کو اردو کا پہلا اسٹیج ڈراما مانا جاتا ہے۔جو وکٹوریہ تھیٹر یکل کمپنی کی طرف سے پیش کیا گیا تھا۔ڈرامے کی اس مقبولیت کو دیکھتے ہوئے دوسرے مصنفین بھی اس کی طرف متوجہ ہوئے۔اس دور کے ڈراما نگاروں میں احسن لکھنوی،جنہوں نے شیکسپیئر کے ڈراموں کا اردو میں ترجمہ کیا،رونق بنارسی،ویا نک پرساد،طالب بنارسی،فضا علی خنجر،حکیم احمد شجااور پنڈت نرائن پرساد بیتاب بنارسی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

اور پھر اس کے بعد اردو ڈراما اور اسٹیج اپنے عروج پر گامزن ہوا اس کے بعد آغا حشر کاشمیری نے اس صنف کی طرف توجہ کی۔انہوں نے اپنا پہلا ڈراما'' آفتاب محبت 1897 '' لکھا۔وہ الفریڈ کمپنی سے وابستہ تھے۔اس کے علاوہ انہوں نے دوسری کمپنیوں کے لیے بھی مختلف ڈرامے لکھے تھے۔آغا حشر نے''خواب ہستی،خوبصورت بلا،سلور کنگ،یہودی کی لڑکی،بلوامنگل،ترکی کی حور،پہلا پیا،رستم وسہرا،بھارت منی،آنکھ کا نشہ،بھیشم پرتگیا،سیتا بنواس اور دل کی پیاس جیسے بہترین اور بے شمار ڈرامے لکھ کر اردو ڈراما اور اسٹیج کو وسیع سے وسیع تر کر دیا۔آغا حشر کے عہد میں کتابی ڈرامے لکھنے والوں میں محمد حسین آزاد،عبدالحلیم شرر،عبدالماجد دریا بادی،برج موہن دتاتریہ کیفی،چکبست اور مرزا رسوا نام اہم ہیں۔

آغا حشر کے بعد اردو ڈراما نگاروں کی ایک طویل فہرست نظر آتی ہے۔جنہوں نے نہ صرف اردو ڈرامے کے دامن کو وسیع کیا بلکہ ڈرامے کی فکری وفنی خصوصیات میں بھی اہم اضافے کئے ہیں۔حکیم احمد شجاع،کرشن چندر،بیدی،منٹو،عابد حسین،اشتیاق حسین قریشی،محمد عمر نور الٰہی،امتیاز علی تاج،محمد مجیب،حبیب تنویر،ابراہیم یوسف،محمد حسن اور خواجہ احمد عباس کے نام شامل ہیں۔

مردوں کے قدم بقدم خواتین ڈراما نگاروں نے بھی اس صنف میں اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے۔اور مردوں کی طرح انہوں نے بھی اردو ڈراما اور اسٹیج کو ترقی کی راہ پر گامزن کیا۔ان خواتین ڈراما نگاروں میں رشید جہاں،عصمت چغتائی،حجاب امتیاز علی،قدسیہ زیدی،ہاجرہ مسرور،قدسیہ بانو،صالحہ عابد حسین،خدیجہ مستور،ساجدہ زیدی اور زاہدہ زیدی کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

ڈرامہ نگار خواتین:

1۔حجاب امتیاز علی۔

اردو ادب کی مشہور و معروف رومانی افسانہ نگار حجاب امتیاز علی 1915 میں حیدر آباد میں پیدا ہوئیں۔ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کرنے کے بعد انہوں انگریزی اسکول میں تعلیم پائی۔انہیں انگریزی کا بہت شوق تھا۔اور انگریزی ادب کا انہوں نے مطالعہ بھی گہرائی سے کیا۔انہیں انگریزی زبان پر بھی قدرت حاصل تھی۔وہ ہندوستان کی پہلی خواتین تھیں جنہوں نے 1936 میں لاہور کے ناردن فلائنگ کلب سے پائلیٹ کا لائسنس حاصل کیا تھا۔اس طرح وہ پہلی پائلیٹ خاتون بنیں۔حجاب امتیاز علی کی شادی معروف ڈرامہ نگار امتیاز علی تاج سے ہوئی تھی۔

حجاب امتیاز علی کو مضمون نگاری،افسانہ نگاری،ڈرامہ نگاری اور خط وکتابت کا بے حد شوق تھا۔انہوں نے ابتداء میں اپنے والد سید ممتاز علی کے رسالے ''تہذیب نسواں'' کے لیے بہت سے مضامین لکھے۔افسانہ نگاری میں وہ سجاد حیدر یلدرم کی ''رومانی تحریک'' سے متاثر تھیں۔انہوں نے متعدد افسانے لکھے۔جن میں میری ناتمام محبت،نادیدہ عشق،صنوبر کے سائے،لاش،شیطان،مردے نے کیا کہا اور شامت اعمال۔ان کے ناولوں میں متعدد ناول ملتے ہیں۔اندھیرا خواب،ظالم محبت،پاگل خانہ اور وہ بہاریں یہ خزائیں۔وغیرہ اہم ناول ہیں۔

جہاں تک ان ڈراموں کا تعلق ہے۔تو حجاب امتیاز علی نے دو ڈرامے تخلیق کئے ہیں۔پنجرہ اور دعوت نامہ ملتے ہیں۔پنجرہ حجاب کا ایک تمثیلی ڈرامہ ہے۔جس میں باپ بیٹے کے نازک جذبات واحساسات کو دکھایا گیا ہے۔جب کہ ''دعوت نامہ''ایک مزاحیہ ڈراما ہے۔ان ڈراموں میں امتیاز علی نے گھریلو زندگی کی تصویر کشی کی ہے۔حجاب افسانہ نگار کی حیثیت سے زیادہ کامیاب نظر آتی ہیں۔وہ زیادہ بڑی اور اہم ڈرامہ نگار تو نہیں لیکن یہ ان کی ابتدائی دور کی کوشش ہے۔اگر چہ انہوں نے ڈرامہ کے فن کو خاص طور سے نہیں برتا لیکن انہیں زبان و بیان پر قدرت حاصل تھی انہوں نے سادہ زبان میں کردار نگاری اور مکالمہ نگاری کی اچھی مثالیں پیش کی ہیں۔

2۔رشید جہاں۔

رشید جہاں 1905 میں علی گڑھ میں پیدا ہوئیں۔ان کے والد شیخ عبداللہ تعلیم اپنے زمانے کے مصلح

قوم ،سماجی خیر خواہ اور تعلیم نسواں کے اہم کارکن اور علی گڑھ میں گرلز کالج اور ویمینس کالج کے بنیاد گزار تھے۔اس زمانہ میں جب کہ لڑکیوں کے تعلیم حاصل کرنے کا کوئی تصور نہیں تھا انہیں صرف مذہبی تعلیم دینا کافی سمجھا جاتا تھا ایسے میں شیخ عبداللہ نے لڑکیوں کے لیے اعلی تعلیم کی حمایت کی اور تعلیم نسواں کے لیے انتھک کوششیں کیں۔شیخ عبداللہ کے ان کی بیوی وحید جہاں بیگم نے بھی تعلیم نسواں کی نہ صرف حمایت کی بلکہ لڑکیوں کے والدین کی تشفی کے لیے وہ لڑکیوں کی دیکھ بھال کے لیے بورڈنگ ہاسٹل میں بھی رہیں۔

ایسے ماحول میں رشید جہاں کی پرورش ہوئی جہاں تعلیم نسواں کے لیے بڑی بڑی تحریکیں چل رہی تھیں۔ظاہر ہے وہ بھی اسی ماحول کا حصہ تھیں انہیں بچپن سے ہی تعلیم کی طرف حاص رغبت تھی۔انہوں نے ابتدائی تعلیم علی گڑھ کے گرلز کالج سے کی۔اس کے بعد لکھنؤ سے سائنس میں انٹرمیڈیٹ پاس کرنے کے بعد لیڈی ہارڈنگ میڈیکل کالج نئی دہلی سے میڈیکل کی تعلیم مکمل کی۔تعلیم مکمل ہونے کے بعد ان کا پہلا تقرر کانپور میں ہوا۔اس کے بعد بلند شہر اور پھر لکھنؤ میں۔

رشید جہاں کی ادبی زندگی کا کالج کے زمانہ سے ہو گیا تھا۔جہاں وہ مختلف میگزین کے لیے مضامین لکھتی تھیں۔انہیں بچپن سے ہی اپنے والدین کی صحبت میں سماجی مسائل سے دلچسپی تھی۔انہیں لکھنے کا شوق بھی اپنے والدین سے ملا۔لیکن ان کی باقاعدہ ادبی زندگی لکھنؤ میں سجاد ظہیر،احمد علی اور محمود الظفر سے ملاقات کے بعد ہوا۔وہ ان کے ترقی پسند خیالات سے اس قدر متاثر ہوئیں کہ جب 1932 میں رسالہ ’’انگارے‘‘ کی اشاعت ہوئی تو اس میں سجاد ظہیر،محمود الظفر اور احمد علی کے ساتھ رشید جہاں کے بھی دو افسانے ’’پردے کے پیچھے‘‘ اور ’’دلی کی سیر‘‘ شامل تھا۔اسی دوران وہ اور محمود الظفر ایک دوسرے کے قریب آئے۔اور 1934 میں انہوں نے شادی کر لی۔

رشید جہاں مارکسزم اور کمیونسٹ خیالات سے کی حامی تھیں۔یہیں 1936 میں جب لکھنؤ میں ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس ہوئی تو رشید جہاں اور محمود الظفر دونوں نے اس میں شرکت کی۔یوں وہ پیشہ سے ایک ڈاکٹر تھیں لیکن وہ ادبی کاموں سے بھی وابستہ رہیں۔1937 رشید جہاں نے بہت سے افسانے،مضامین اور ڈرامے لکھے۔ان کی نو کہانیوں کا مجموعہ ’’عورت اور دیگر افسانے کے نام سے شائع ہوا۔ان کا پہلا

افسانہ ''سلمیٰ'' کے نام سے انگریزی میں شائع ہوا تھا۔جس میں مسلمان متوسط طبقے کی کہانی ہے۔اسی طرح ان کا ایک افسانہ ''بے زبان'' میں ایک ایسی عورت کی کہانی ہے جو سماج کی فرسودہ اور قدیم رسم و روایات میں جکڑی ہوئی ہے۔ان کے علاوہ ''افطاری،سودا،اندھی لاٹھی اور ساس بہو'' بھی سماج کی حقیقی اور پس ماندہ زندگی پر مشتمل افسانے ہیں۔

ان کے ڈرامے بھی افسانوں کی طرح سماج کی بیلاگ حقیقت کو بیان کرتے ہیں۔مثلاً ان کا ڈرامہ ''پردے کے پیچھے'' ایک گھٹے ہوئے ماحول میں عورت کی المناک داستان کو بیان کرتا ہے۔ڈرامہ ''عورت'' مرد کی جنسی خواہش اور اس کی بوالہواسی کو دکھایا ہے۔اپنی اس خواہش کی تکمیل کے لیے وہ مذہب کی آڑ میں چار شادیوں کا جواز پیش کرتا ہے۔لیکن اس کی بیوی فاطمہ بار بار اس کی مخالفت کرتی ہے۔اور اس کی مخالفت میں کسی طرح کمزور نہیں پڑتی۔اس میں رشید جہاں نے اس وقت کی عورتوں کی رہنمائی کی ہے تا کہ ان میں اتنی ہمت پیدا ہو سکے۔جب کہ ڈرامہ ''ہندوستانی'' اور ''پڑوسی'' میں ہندو مسلم اتحاد کو دکھایا گیا ہے۔جو ان کے ترقی پسند خیال کی بھی وضاحت کرتا ہے۔جس میں انہوں نے ہندوستانی ایک قوم کا نعرہ دیا ہے۔ان کا ایک ڈرامہ ''بچوں کا خون'' چین کا جاپانیوں پر ظلم ستم کی داستان ہے۔اسی طرح ''نفرت'' روسیوں کے خلاف جرمن فاشزم کے ظلم کی کہانی ہے۔

ان کے زیادہ تر ڈرامے ہندوستان کی متوسط طبقے کی کہانی ہے۔جن کے فرسودہ رسم و رواج اور عورت پر بے جا پابندیوں کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ان ڈراموں کو رشید جہاں نے آسان زبان میں پیش کیا ہے۔ان کے ڈراموں میں فن کے تقاضوں کا بھی پورا خیال رکھا گیا ہے۔پلاٹ،زبان و بیان اور مکالمہ نگاری برجستہ اور موقعہ محل نظر آتی ہے۔ان کے یہاں ہمیں خیالی یا رومانی باتیں نظر نہیں آتیں۔بلکہ انہوں نے زندگی کی حقیقتوں کو آشکار کیا ہے۔وہ بہت عظیم افسانہ نگار یا ڈرامہ نگار تو نہیں لیکن انہوں نے جتنا بھی لکھا وہ اردو ادب میں ایک بیش بہا اضافہ ہے۔

3۔صالحہ عابد حسین۔

صالحہ عابد حسین کے کارنامے مختلف ہیں،انہوں نے ناول،ڈراما،ترجمہ اور سوانح نگاری کے میدان

میں گراں خدمات انجام دی ہیں،انہوں نے پچاس سے زیادہ کتابیں لکھیں ہیں۔حتیٰ کہ مذہبی موضوعات پر بھی ان کی کتاب ''سلک گوہر'' کے نام سے منظر عام پر آ چکی ہے۔

جہاں تک ڈراموں کا تعلق ہے، ان کے ڈراموں میں ''زندگی کے کھیل، عفت، امتحان، بنیادی حق، حالی جھلک، بڑے میاں، آنکھ کا ڈاکٹر، ایک پیسہ، تارہ، رومانی شادی وغیرہ ہیں۔ان کے یہ ڈرامے عام زندگی کے موضوعات پر مشتمل ہیں۔ان میں ہماری تہذیب و معاشرت اور گھریلو زندگی کے کے مسائل نظر آتے ہیں۔اس کے علاوہ عام لوگوں کی نفسیاتی اور ذہنی کشمکش، ہنسی وغم اور دکھ درد کی بھی تصویر کشی کی گئی ہے۔انہوں نے ریڈیو کے لیے بھی کافی کام کیا۔ان کا بہت سارا ریڈیائی فیچر اور ریڈیائی تقاریر پر مشتمل ذخیرہ موجود ہے۔جو ''بات چیت'' کے عنوان سے شائع بھی ہو چکے ہیں۔اس میں ''میں نے لکھنا کیسے سیکھا، استانی، عورت کے فرائض، موجودہ عہد، تیمارداری، بدمزاج بیوی، میل جول اور ہمارا اخلاق'' وغیرہ کئی مضامین شامل ہیں۔

ان کی تحریروں میں متانت، سادگی اور علمی و ادبی مسائل کو صاف اور سلجھے ہوئے انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ان کا اسلوب دلچسپ ہے اور انہیں بیان پر پوری قدرت حاصل تھی۔انہیں مطالعہ کا بہت شوق تھا۔انہوں نے اس دور میں لکھنا شروع کیا جب کہ عورتوں کی تعلیم کو بھی معیوب سمجھا جاتا تھا۔صالحہ عابد حسین نے بھی روایتی طریقے سے تعلیم حاصل نہیں کی تھی مگر چونکہ ان کے گھر ماحول علمی تھا لہذا ان کا علم و مطالعہ سے شغف فطری تھا۔انہوں نے مشرقی گھرانوں کے طور طریقے کا مشاہدہ کر کے اپنی تحریروں میں بیسویں صدی کی ہندوستانی تہذیبی و سیاسی اور معاشرتی زندگی کو پیش کیا۔

4۔بانو قدسیہ۔

بانو قدسیہ اردو کی ایک اہم فکشن نگار خواتین ہیں۔ان کا ذکر ناول کے حوالے بھی آئے گا۔ناول نگاری کے میدان میں بھی ان کی بیش بہا خدمات ہیں۔وہ اپنے ناول ''راجہ گدھ'' کی وجہ جانی جاتی ہیں۔ان کے ناولوں میں ایک دن، حاصل گھاٹ، شہر لازوال، آباد ویرانے، پروا، پروا اور ایک دن، موم کی گلیاں، شہر بے مثال، توبہ شکن شامل ہیں۔ناولوں کے علاوہ انہوں نے بے شمار افسانے بھی لکھے ہیں۔ان کے افسانوں

میں،ہجرتوں کے درمیاں،دستہ بستہ،آتش زیر پا،امر بیل،دوسرا دروازہ،بازگشت،ناقابل ذکر، سامان وجود،توجہ کی طالب، کچھ اور نہیں۔

ناول اور افسانے کی طرح انہوں نے ڈرامے کے میدان میں بھی اہم خدمات انجام دی ہیں۔ڈراما ''پیا نام کا دیا'' ایک طویل ڈرامہ ہے۔اس کے علاوہ ان کے ڈراموں میں چھوٹا شہر بڑے لوگ، پھر اچانک یوں ہوا،لگن اپنی اپنی،ایسے پیسے،تمثیل، ہوا کے نام،دوسرا قدم،سدھارن،آدھی بات،سورج مکھی اور پیا نام کا دیا، ہیں۔بانو قدسیہ کے ڈرامہ آدھی بات کو کلاسکی ڈرامہ کہا جاتا ہے۔علاوہ ازیں مجموعہ ''فٹ پاتھ کی گھاس ''میں بھی تیرہ ڈرامے'' چٹان پر گھونسلا،سراب،زرد گلاب،انجانے میں،شکایتیں حکایتیں،کھل سم سم،سانول موڑ مہاراں،آنکھ میں چولی،فٹ پاتھ کی گھاس،رات گئے،علی بابا اور قاسم بھائی،اچھے دن کا انتظار اور یہ جنوں نہیں تو کیا ہے،شامل ہیں۔

5۔ہاجرہ مسرور۔

ہاجرہ مسرور کا شمار بھی پاکستان کی مشہور فکشن نگاروں میں ہوتا ہے۔1930 کو وہ لکھنؤ میں پیدا ہوئی لیکن تقسیم ہند کے وقت وہ پاکستان منتقل ہوگئی تھیں،انہوں نے ناول،افسانہ اور ڈراما ہر میدان میں طبع آزمائی کی ہے۔ان کے چھ افسانوی مجموعوں میں ''چرکے،ہائے اللہ،چوری چھپے،تیسری منزل،چاند کے دوسری طرف اور اندھیرے اجالے، ہیں۔ان کا کلیات ''سب افسانے میرے ہیں1991 '' بھی منظر عام آچکا ہے۔ہاجرہ مسرور کے افسانوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے شروع میں عصمت چغتائی کی تقلید میں لکھنا شروع کیا مگر آہستہ آہستہ وہ اس اثر سے باہر بھی نکل آئی تھیں اور انہوں نے اپنا افسانوں میں الگ انداز بھی قائم کیا انہوں نے زیادہ علمیت اور فلسفہ بگھارنے بجائے سیدھے سادے اور عام موضوعات پر لکھا ہے۔ان کے افسانوں میں کافی تنوع پایا جاتا ہے۔

افسانوں کے علاوہ ان کے ڈراموں پر نظر ڈالی جائے تو ان کے ڈراموں میں وہ لوگ،نوری خالہ،دستک وغیرہ شامل ہیں۔ہاجرہ مسرور بنیادی طور پر ایک افسانہ نگار تھیں اور افسانے سے ان کی طبیعت پوری طرح آشنا تھی،یہی وجہ ہے کہ ان کے ڈراموں میں بھی افسانوں کی سی جھلکیاں ملتی ہیں۔ان کے ڈراموں

کے بارے ممتاز شیریں نے لکھا ہے کہ ہاجرہ مسرور بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں، ایک فطری افسانہ نگار۔ یہ بات ان کے ڈراموں کا مجموعہ ''وہ لوگ'' پڑھ کر اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔ان ڈراموں میں بھی وہ ایک افسانہ نگار ہی نظر آتی ہیں۔ ہاجرہ مسرور کو فطری اور چست مکالے لکھنے پر خاصی قدرت حاصل ہے۔ یہ ایک ایکٹ کے ڈرامے مکالمے کی حیثیت سے اچھے ہیں ۔لیکن ڈرامے کی حیثیت سے کہاں تک کامیاب ہیں۔اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ کیوں کہ ڈرامے کے لیے اسٹیج کی پیش کش اہم ہے۔اور ڈرامے کی کامیابی کا یہی امتحان ہے۔

6۔قدسیہ زیدی۔

ڈرامہ نگار قدسیہ زیدی علی گڑہ میں 1914 کو پیدا ہوئیں۔انہوں نے ہندوستانی تھیٹر کے لیے اہم خدمات انجام دی ہیں۔ ہندوستانی تھیٹر میں قدسیہ زیدی کی خدمات کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ یہ ایک نئے دور کے آغاز کی علامت تھی جب قدسیہ زیدی نے ہندوستانی تھیٹر کی کمان سنبھالی۔انہوں نے نہ صرف سنسکرت بلکہ مغربی ڈراموں بھی کے آزاد ترجمے کیئے۔قدسیہ زیدی نے سنسکرت ڈراموں کا ترجمہ کر کے بڑے بنیادی انداز میں پیش کیا۔ان ڈراموں میں شکنیلا اور مٹی کی گڑیا وغیرہ شامل تھے۔کالی داس ڈرامہ'' شکنتلا ''اردو میں بہت مقبول ہوا۔ یہ ڈراما سنسکرت زبان میں پہلے سے موجود تھا۔ہے۔قدسیہ زیدی کا یہ ترجمہ ڈراما ہندوستان میں خوب مقبول ہوا۔ جب کہ'' گڑیا کا گھر''ابسن اور'' آزر کا خواب'' برنارڈ شو کے ڈراموں کا ترجمہ ہے۔ان کے دوسرے ڈراموں میں'' بھول بھلیاں، گڑیا کا گھر، خالد، چچا چھکن کے کارنامے، آزر کا خواب، گلابی چوہیا اور غبارے، گاندھی بابا، جانباز سپاہی، بھن بھن بانو اور ان تھک شامل ہیں۔

ساجدہ زیدی۔موجودہ عہد میں ساجدہ زیدی کا نام نہ صرف ایک شاعرہ کے طور پر لیا جاتا ہے بلکہ انہوں نے مختلف میدان میں اپنی صلاحیتوں کا اظہار کیا ہے وہ ایک شاعرہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ڈرامہ نگار، ناول نگار، نقاد اور مترجم کی حیثیت سے بھی جانی جاتی ہیں۔ان کا ذکر شاعری کے حوالے سے بھی اس مقالے میں ہو چکا ہے۔شاعری کے علاوہ فکشن میں بھی ان کی بہت سی اہم تخلیقات موجود ہیں۔ان کے ناول ''مٹی کے حرم'' اور'' موج ہوا پیچاں'' نہ صرف ساجدہ زیدی کے بلکہ ارد کے بھی اہم ناول ہیں۔

زاہدہ زیدی کی طرح ساجدہ زیدی کو بھی ڈرامہ کی صنف سے لگاؤ تھا۔انہوں نے بھی نہ صرف

ڈرامے تخلیق کیئے بلکہ مغربی ڈراموں کو اردو میں منتقل کیا۔ چونکہ ساجدہ زیدی انگریزی ادب سے متاثر تھی اور مغربی ادب کا گہرا مطالعہ ومشاہدہ رکھتی تھیں، لہذا انہوں نے مغربی اردو میں مغربی طرز کے ڈرامے تخلیق کیئے اور مغربی ڈراما نگار'' آرنلڈ بیسکر، لورکا اور پراندیلو وغیرہ کے ڈراموں کو اردو میں منتقل کیا۔ مجموعہ'' چاروں موسم'' ان کے انگلش ڈراموں کا ترجمہ ہے۔

ساجدہ زیدی کے طبع زاد ڈراموں کا مجموعہ'' سرحد کوئی نہیں'' تین ڈراموں پر مشتمل ہے۔ جس میں ڈرما'' سرحد کوئی نہیں'' ایک منظوم ڈراما ہے۔ جو عورت مرد کے عشق اور ہجر ووصال کی کہانی ہے۔ دوسرا ڈراما'' حسرت تعمیر'' بھی عورت ومرد کے رشتے پر منحصر ہے۔ اور میاں بیوی کے مبہم رشتے کی کشاکش کو دکھاتا ہے، جب کہ تیسرا ڈراما'' مجھے ڈرائیونگ'' سکھادو بھی میاں بیوی کے رشتے پر مشتمل ہے۔ جو ایک دوسرے سے بے انتہا محبت بھی کرتے ہیں، دونوں ایک دوسرے کے بغیر رہ بھی نہیں سکتے، مگر ایک دوسرے کو چین وسکون کا سانس بھی نہیں لینے دیتے۔ ان ڈراموں بھی ساجدہ زیدی نے زندگی کے فلسفیانہ، نفسیاتی اور زندگی کے مختلف نکتوں کی وضاحت کی ہے۔

سرحد کوئی نہیں، مکتبہ جامعہ لیمیٹڈ، نئی دہلی، 1991

چاروں موسم (مغرب کے شاہکار ڈرامے، نصرت پبلیکیشنز، لکھنؤ، 1984

زاہدہ زیدی کی ڈرامہ نگاری:

'' مجموعہ دوسرا کمرہ'' جو کہ زاہدہ زیدی کے تخلیقی ڈراموں کا مجموعہ ہے اس مجموعے میں شامل ڈراموں میں چٹان، دل ناصبور ارم، دوسرا کمرہ، وہ صبح کبھی تو آئے گی اور'' اور جنگل جلتا رہا'' وغیرہ شامل ہیں۔

1۔ چٹان:

چٹان زاہدہ زیدی کا مختصر ڈرامہ ہے، جس میں ابسرڈ ڈرامے کے عناصر شامل ہیں یہ ڈرامہ'' ڈرامہ در ڈرامہ'' کی تکنیک میں لکھا ہے، اس کا مرکزی کردار جاوید ہے، جو ایک تخلیق کار ہے اور ایک ڈرامے کو پیش کرنے کا خواہش مند ہے جس کو وہ اپنے دوست فانی کی مدد سے اسٹیج کرنا چاہتا ہے، لیکن جاوید اور فانی ایک ایسی جگہ پر کھڑے ہیں جہاں چٹانوں اور پتھروں کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا، نہ تو کرداروں کی پیش کش کے لیے

کوئی انسان ہے نہ اسٹیج اور نہ اسٹیج کے باقی دوسرے سامان۔اسی اثناء میں جاوید کو فانی کی بھابی نادرہ اپنے دو بیٹوں بیلو اور مونو اور اپنے شوہر کمال کے ساتھ نمودار ہوتی نظر آتی ہے۔جاوید نادرہ سے اپنے ڈرامے کا رول ادا کرنے کے لیے کہتا ہے جسے سن کر نادرہ خوش ہو جاتی ہے۔نادرہ 32-31 سال کی خاتون ہے رنگ گورہ اور نقش مناسب ہیں،لیکن وہ اپنی گھر کی محدود زندگی اور گھٹن سے مایوس اور خانگی الجھنوں سے بیزار منظر آتی ہے۔ وہ اپنے شوہر کمال جو کہ تقریباً 60 سال کے موٹے تازے مرد ہیں،اور جنہیں مے نوشی سے خاصی دلچسپی ہے۔ ان کے ساتھ کھانے پینے کا بھی کچھ سامان ہے۔لہذا جاوید اب اپنے ڈرامے کی پوری کاسٹ سوچ کر خوش ہوتا ہے اور ڈرامہ اسٹیج کرنے کی تیاری میں لگ جاتا ہے۔اس ڈرامے میں فانی اور نادرہ کے علاوہ کمال اور بیلو کو بھی کچھ ڈائلاگ لکھ دیتا ہے۔اس میں فانی ہیرو اور نادرہ ہیروئن کا کول کرتی ہے۔بیلو اپنا رول بیچ میں چھوڑ کر اپنے دوست کے ہمراہ چلا جاتا ہے جبکہ کمال صاحب شراب کے نشے میں بدحواس ہو کر سو پڑتے ہیں۔فانی جوں ہی ڈائلاگ بولنا شروع کرتا ہے اور اپنی محبت کا اظہار نادرہ کے سامنے کرتا ہے اچانک چٹان سے ایک پتھر ان کی طرف آ کر گر جاتا جس سے نادرہ گھبرا جاتی ہے،اسی اثناء میں پہاڑوں کے درمیان سے دو بڑے گینڈے چٹان کی طرف آتے ہوئے نظر آتے ہیں نادرہ چیخ مار کر جاوید سے لپٹ جاتی ہے،فانی پیچھے ہٹ جاتا ہے،لیکن ان میں سے ایک گینڈے نے مونو کو اٹھا لیا ہے اور اسے چشمے کی طرف لے کر جا رہا ہے۔نادرہ چیخ مارتی ہوئی اس کے پیچھے بھاگتی ہے اور اسی درمیان پتھروں کی بارش بھی تیز ہو جاتی ہے۔فانی جاوید سے ہ کہہ کر کہ تمہارا ڈرامہ پیچیدہ ہوتا جا رہا ہے چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے۔جاوید نادرہ اور فانی کے پیچھے بھاگتا ہے اور انہیں پکڑتا ہے،لیکن وہ اس کی نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔دوسری طرف کمال صاحب میں بھی کوئی حرکت نظر نہیں آتی،وہ بے حس و حرکت پڑے تھے۔جاوید تینوں کو پکارتا ہے اس کی آواز گونجتی جاتی ہے۔نادرہ____ فانی____ کمال صاحب____ اور جاوید بالکل ساکت کھڑا رہ جاتا ہے۔

چٹان ایک استعاراتی و علامتی ڈرامہ ہے۔اس ڈرامے میں بھی ڈرمہ ہے،جو زندگی کا استعارہ ہے اور جسے ڈرامہ در ڈرامہ کہا جاتا ہے۔اس میں زاہدہ زیدی نے یہ باور کرایا ہے کہ انسان کس طرح اس دنیا میں اپنی زندگی کا رول ادا کرتا ہے اور اس رول کو ادا کر کے وہ ایک دن اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔اس دنیا

میں اس کا ایک مخصوص کردار ہے جس کو انسان کو ادا کرنا ہے۔ زاہدہ زیدی لکھتی ہیں ؛

چٹان زندگی کے اسٹیج یا رنگ منچ کا استعارہ ہے جس پر ایک انسان اپنا مخصوص رول ادا کرتا ہے۔ اس ڈرامے کے دوسرے کرداران محدود اور مخصوص حالات، عناصر اور امکانات کی نشاندہی کرتے ہیں۔ جس کی مدد سے ایک حساس ذہن اپنے زندگی کے ڈرامے کی تشکیل کرتا ہے۔ فانی اس مرکزی شخصیت کا وہ پہلو ہے جو سہل پسند اور سطحی ہے۔ اس لیے وہ ندرت خیال اور نئی حسیّت کی کاوش سے مخالف ہے، اور بار بار روایتی طرز فکر اور اظہار کی مائل ہوتا ہے، لیکن جاوید اسی شخصیت کا وہ حساس اور تخلیق ذہن ہے جو محدود امکانات اور ناسازگار حالات کے باوجود زندگی کو ایک منفرد اور بامعنی پیکر میں ڈھالنے کے لیے کوشاں ہے۔[1]

زاہدہ زیدی کا یہ ڈرامہ وجودی نظریہ کا حامل ہے، ڈرامہ در ڈرامہ تکنیک کے علاوہ اس میں ابسرڈ ڈرامے کے اجزاء بھی موجود ہیں ابسرڈ ڈرامے کے اجزاء میں اظہاریت، سریلزم اور علامتی طرز اظہار شامل ہیں، یہ تمام عناصر ہمیں اس ڈرامے میں بھی نظر آتے ہیں۔ جس میں جاوید ڈرامہ در ڈرامہ تکنیک کو پورا کرتا ہے، جب وہ اپنے ڈرامے کے لیے فانی کا کردار تخلیق کرتا ہے کو کہ اس کا ہی ہمزاد اور اس کی تخلیق ہے، جہاں وہ خود کو ہدایت کار کے رول میں پیش کرتا ہے۔ دوسری طرف نادرہ ہے جو ایک ہیروئن کا رول ادا کرتی ہے، جس کے ذریعے اس کی داخلی الجھنوں کو بھی نمایاں کیا گیا ہے، اور زندگی کے فطری اور جذباتی پہلوؤں کی نمائندگی کرتی ہے، وہ جاوید کے ڈرامے کے ذریعے اپنی خواہش کا اظہار بھی کرنا چاہتی ہے جبکہ اسے اس کی دلی خواہش پوری کرنے کا موقع ملتا ہے، اور وہ کچھ دیر کے لیے اپنی خانگی الجھنوں سے چھٹکارے کی امید کرتی ہے جبکہ اس کم عمر لڑکا بیلو بے ساختگی ،حرکت اور زندگی کی تازگی کا استعارہ ہے، وہیں چھوٹا لڑکا مونو بے حسی و بے طاقتی کا نمائندہ ہے جو ایک گینڈے کی نظر ہو جاتا ہے جس کے لیے نادرہ اپنا ڈرامہ چھوڑ کر گینڈے کے پیچھے دوڑتی ہے، اور اپنی جان کی پرواہ کئے بغیر اس چھوٹے بچے کی سلامتی کے لیے اپنی جان کی بازی لگا دیتی ہے وہیں اس کا شوہر کمال ایک ایسی طرز زندگی کا نمائندہ ہے جو مشینی انداز میں کام کاج کرنے کے بعد تعطل اور بے حسی کی تصویر کشی کرتا ہے۔

ان تمام کرداروں کی مدد سے جاوید نے اپنے ڈرامے کی تشکیل بڑے فنکارانہ انداز میں کی ہے، جس میں زندگی کو ایک ایسے اسٹیج پر پیش کیا ہے، جہاں سب اپنا اپنا رول ادا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس ڈرامے

میں دوسری چیزیں جیسے پتھر، کنکر اور چٹان وغیرہ کو بھی استعاراتی و علامتی معنی میں پیش کیا ہے جن سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ یہ زندگی کی وہ مشکلات اور پیچیدگیاں ہیں جو ہمیں زندگی کے مختلف مراحل پر نظر آتی ہیں۔ بقول زاہدہ زیدی:

> اس ڈرامے کے باقی عناصر مثلاً وہ کنکر جو چٹان پر گرنا شروع ہوتے ہیں ان خارجی اور مخالف قوتوں کا استعارہ ہیں جو زندگی کی بامعنی تشکیل میں حارج ہوتے ہیں اور اس کے بعد دھند، گینڈے اور طوفان ان غیر یقینی اور hostile cosmic forces یا انسان دشمن فطرتی عناصر کو پیش کرتے ہیں جو آن کی آن میں زندگی کی نامکمل کہانی کے اوراق بکھیر سکتے ہیں یا اس کے تخلیق کردہ ڈرامے کی عمارت کو ریزہ ریزہ کر سکتے ہیں۔ 2ے

اس بات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ چٹان زاہدہ زیدی کا ایک علامتی انداز میں لکھا ہوا ایسا ڈرامہ ہے جو جدید مغربی اصولوں خاص کر ابسرڈ ڈرامے کے طرز پر ہے، اور مغربی ڈرامہ نگاروں کی طرح زاہدہ زیدی نے اس میں ان تمام عناصر کی شمولیت کی ہے خاص کر انھوں نے سٹرنڈ برگ اور پراندیلو کی طرح اس میں ڈرامہ در ڈرامہ کی تکنیک سے فائدہ اٹھایا ہے، اور چٹان کو زندگی کے پیکر میں پیش کیا ہے، جس میں جاوید کا کردار مخصوص حالات، عناصر اور ایک حساس ذہن کی نمائندگی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

2۔ دلِ ناصبودارم:

دل ناصبودارم ''دوسرا کمرہ'' میں شامل زاہدہ زیدی کا دوسرا ڈرامہ ہے اس ڈرامے میں ایک پہاڑی علاقہ کی کہانی بیان کی گئی ہے جہاں پہاڑی کے چاروں طرف پہاڑ، درخت اور سڑک کا منظر ہے جھونپڑی کے در و دیوار پر نقش و نگار بنے ہیں اندر مٹی کے پیالوں میں رنگ بھرا ہوا رکھا ہے اور ساتھ میں ایک برش بھی ہے جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جھونپڑی میں رہنے والا کوئی مصور ہے ان رنگ و برش کے علاوہ کچھ کتابیں، مٹی کے برتن، گھڑے، گلاس، دو تین بکریاں اور ایک چھوٹا بکری کا بچہ بھی ہے۔ جھونپڑی میں رہنے والوں کی تعداد دو ہے ایک کا نام راز ہے جو مصور ہے اور اسکے پاس ایک ستار بھی ہے اور دوسرے کا نام ہمراز ہے وہ کچھ صحت مند بھی ہے جبکہ راز کا چہرہ سنجیدہ حساس اور خواب آلود معلوم ہوتا ہے دونوں کی عمر تقریباً تیس سال ہے ان میں کچھ مشترک اور متضاد خصوصیات ہیں۔

راز مصوری کرنے ،ستار کی ریاض کرنے اور وہ کسی نامعلوم خواب آلودہ لڑکی کے انتظار میں وقت صرف کرتا ہے وہ اس لڑکی کی راہ تکتا رہتا ہے جسے اس نے خواب میں دیکھا تھا بلکہ راز اور ہم راز دونوں اس لڑکی کا انتظار کرتے ہیں اور خیالوں میں اس کی تصویر اور اس کے عکس کا نقشہ کھینچتے رہتے ہیں اور اس کے استقبال کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں اور اس خیال نما لڑکی کے لیے ہر طرح کا انتظام بھی کرتے ہیں ایک مرتبہ انہیں پتھریلی سڑک سے ایک پہاڑی عورت لکڑیوں کا گٹھا اٹھائے نمودار ہوتی نظر آتی ہے جسے راز اور ہمراز اپنے خیالوں کی ملکہ سمجھنے لگتے ہیں اور اس کے قریب جا کر اس کی مدد کے لیے بھی تیار ہو جاتے ہیں لیکن وہ ایک دیہاتی عورت تھی جو ہر روز اسی راستے سے لکڑیاں لینے جاتی ہے کچھ دیر آرام کرنے کے بعد وہ عورت چلی جاتی ہے ہمراز راز سے اسے روکنے کے لیے بھی کہتا ہے لیکن راز اسے بتاتا ہے کہ وہ اس کے خیالوں کی ملکہ نہیں اور راز ہمراز کو اپنے خوابوں کی ملکہ کا پورا نقشہ بتاتا ہے جس طرح راز نے اسے خواب میں دیکھا تھا۔

> راز: مجھے وہ منظر پوری طرح یاد ہے جب میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا وہ ایک پہاڑی کے زینے پر چڑھ رہی تھی جس کے دونوں طرف پھولوں کی کیاریاں تھیں وہ زینی پھولوں کے ایک کنج میں جاتا تھا جس کے دروازے پر گلاب کی بیلیں چڑھی تھیں اس کا سفید لباس ہوا میں لہرا رہا تھا اس کے بالوں میں ایک سفید گلاب کا پھول تھا اور اس کی لمبی چوٹی پتلی کمر پر بل کھا رہی تھی اس کے فید آویزے کانوں میں لرز رہے تھے اور اس کے چمپئی رنگ میں ہلکی سی سرخی دوڑ گئی تھی عقب میں نیلے آسمان پر نرم بادل آہستہ آہستہ کروٹیں لے رہے تھے شفق کی گدگدی سے ان کے جسم گلابی ہو رہے تھے اور ہر طرف دھوپ چھاؤں کا رقص تھا وہ آہستہ آہستہ چڑھ رہی تھی اور میں پہاڑی کے نیچے کھڑا تھا ــــــ میں محو تھا۔3

اور پھر راز اپنی ملکہ کو دانتے کی ہیروئن سے تشبیہ دیتا ہے جس طرح دانتے کی محبوبہ اس کی روح کی گہرائیوں میں اتر گئی تھی اسی طرح اس لڑکی نے بھی راز کے دل کی گہرائیوں کو چھو لیا تھا اور اب وہ اس کے خیال میں زندگی بسر کر رہا تھا کہ وہ کبھی تو حقیقت میں اس کے روبرو ہوگی ۔ کچھ دن بعد ایک اور عورت اپنے شوہر اور بچے کے ساتھ اس پہاڑی راستے سے گزرتی ہے اس کی بھی راز و ہم راز اسی طرح مدد کرتے ہیں کہ شاید یہ وہی لڑکی ہو لیکن راز اس بار بھی ہمراز کو یقین دلاتا ہے کہ یہ وہ لڑکی نہیں جس کا لمس اس نے خواب میں محسوس کیا

تھا۔اور پھر دوبارہ وہ دونوں اس لڑکی جسکا نام راز نے روحی بتایا تھا کا بے صبری سے انتظار کرنے لگتے ہیں اس یقین کہ ساتھ کہ وہ انہیں دیکھ کر فوراً پہچان لے گی۔

حتیٰ کہ انہیں ایک دن اسی راستے پر ایک نیا شادی شدہ جوڑا نظر آتا ہے جن کی گاڑی خراب ہو چکی تھی اور جو پانی تلاش میں سرگرداں تھے راز و ہمراز ان دونوں کو اپنی جھونپڑی میں لے آتے ہیں اور ان کی جی جان سے خاطر مدارات کرتے ہیں جب کہ وہ دونوں شوہر بیوی بڑی بے رخی اور طنزیہ لہجے میں ان کا مذاق اڑاتے ہیں ان کی کتابیں، ستار اور مصوری پر ہنستے ہیں بلکہ عورت راز کی بدنیتی کی شوہر سے شکایت بھی کرتی ہے اور پھر وہ دونوں راز و ہمراز کی خدمت گزاری کا شکریہ کئے بغیر ناگواری سے رخصت ہو جاتے ہیں۔

ان کے جانے کے بعد ہمراز راز سے گاؤں چلنے کے لیے کہتا ہے لیکن راز منع کر دیتا ہے اور جب راز ہم راز سے بلند پہاڑیوں پر جانے کے لیے کہتا ہے تو ہمراز منع کر دیتا ہے وہ راز سے بڑی بے بسی سے کہتا ہے کہ وہ اب اس کے ساتھ نہیں چل سکتا وہ تھک چکا ہے اور باقی کا سفر راز کو خود تنہا کرنے کو کہتا ہے اسی درمیان طوفان تیز بجلی کے ساتھ جھونپڑی کو اپنی زد میں لے لیتا ہے اور وہاں کی ہر چیز غائب ہو جاتی ہے یاں تک کہ ہمراز بھی راز میں سما جاتا ہے۔

پھر دوسری کہانی اس پہاڑی علاقہ اور اس جھونپڑی سے شروع ہوتی ہے یہ ہے روحی اور صبوحی کی کہانی جو بالکل راز اور ہمراز کی طرح جھونپڑی میں رہتی ہیں اور راز و ہمراز کی طرح ایک نامعلوم اور خواب آلودہ شخص کا انتظار کر رہی ہیں کبھی رقص کرتیں اور کبھی ستار اٹھا کر مدھم سروں میں ایک دلنواز دھن بجاتی ہیں ان کی بے چینی اور انتظار بھی اسی طرح کا ہے جس طرح راز و ہمراز اپنے خواب کی ملکہ سے ملنے کے لیے بے چین اور بے تاب تھے اسی شدت اور والہانہ پن میں اس ڈرامے کا اختتام ہو جاتا ہے۔

دراصل اس ڈرامے کے سرورق پر ہی لکھا ہے کہ یہ ایک سریلسٹ ڈرامہ ہے جس سے ہم نداز ہ لگا سکتے ہیں کہ زاہدہ زیدی کا یہ ڈرامہ بھی ابسرڈ ڈرامے کی تکنیک میں لکھا ہوا ایک علامتی ڈرامہ ہے جس میں ایک ہی شخص کے دو روپ کو پیش کیا گیا ہے جس کی عکاسی راز و ہمراز اور روحی وصبوحی کرتی ہیں۔جس کے ذریعہ زاہدہ زیدی نے داخلی تجربات اور خارجی محرکات دونوں کو ایک ساتھ ڈرامہ کی شکل میں پیش کیا ہے اور ان سب کی

داخلی، خارجی ذہنی و روحانی تلاش و جستجو کو پیش کیا ہے۔ زاہدہ زیدی لکھتی ہیں:

''دل ناصبودارم'' علامتی ڈرامہ ہے جس میں داخلی تجربات اور محاکات کو خارجی ایکشن اور حسیاتی منظر نامے کی مدد سے پیش کیا گیا ہے اور روحانی کش مکش اور اندرونی مکالمے کو ڈرامائی شکل دی گئی ہے راز اور ہمراز ایک شخصیت کے دو روپ ہیں اور اس کی تلاش جستجو اور کش مکش کو پیش کرتے ہیں راز روح و ذہن کی گہراؤں کا اشاریہ ہے اور ہمراز جسمانی پہلو اور حسیاتی تجربے کا۔ راز کے وژن میں روحانیت، فطرت پرستی اور حسن کاری کے عناصر نمایاں ہیں اور وہ اسے فن کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے۔ ہمراز کے وژن میں نشاط، سرشاری اور لذت کوشی کے عناصر نمایاں ہیں اور وہ جنسی وجدان میں اس کی تکمیل ڈھونڈتا ہے اپنی وحدت کو پانے کے لیے انہیں ایک طوفان سے گزرنا پڑتا ہے جو بظاہر انہیں ختم کر دیتا ہے لیکن ان کے وژن کی تکمیل کا پیش خیمہ بھی ثابت ہوتا ہے۔ اس ڈرامے کے دوسرے عناصر پس منظر، برف پوش پہاڑ، گاؤں، مناظر فطرت۔ طوفان بجلی، کڑک اندھیرا، روشنی موسیقی، رقص، مرکزی درخت، راز کا ستار وغیرہ بھی علامتی معنویت کے حامل ہیں اور ان کے استعمال اور پیش کش میں شاعرانہ کیفیت کو برقرار رکھنا ضروری ہے۔ 4

راز اور ہمراز کے علاوہ روحی اور صبوحی کے کردار کو بھی زاہدہ زیدی نے انہیں دونوں کی طرح پیش کیا ہے۔ اور اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ڈرامے کے مرکزی کردار راز و ہمراز، روحی صبوحی ہیں جو سب علامتی ہیں اور ڈرامے میں ان کرداروں کی داخلی اور روحانی کیفیت کو خارجی عوامل اور ایکشن کی مدد سے بیان کیا گیا ہے۔ ان کرداروں کے علاوہ دوسری چھوٹی چھوٹی چیزیں بھی اس ڈرامے کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں جیسے طوفان بجلی کا چمکنا انسان کی اندرونی حالت کو بتاتا ہے ستار اور رقص و سرور وغیرہ اس کے علاوہ ڈرامے میں فلیش بیک کی تکنیک کا استعمال نہ صرف راز و ہمراز کے وژن کو دکھانے کے لیے کی گئی ہے جب راز ہمراز کو اس خواب آلودہ لڑکی کے سراپا سے روبرا کراتا ہے بلکہ روحی صبوحی کے وژن کو دکھاتے وقت بھی ڈرامے میں اس تکنیک کا استعمال کیا گیا ہے۔ اس طرح زاہدہ زیدی نے ڈرامے میں ان کرداروں کی داخلی اور روحانی کیفیت کو خارجی عوامل اور ایکشن کی مدد سے پیش کیا ہے۔

3۔دوسرا کمرہ:

یہ ڈرامہ ایک فلیٹ کے منظر کو پیش کرتا ہے جس کا ''دوسرا کمرہ'' خاص طور سے اہم ہے فلیٹ دو کمروں اور ایک باورچی خانہ پر مشتمل ہے جس میں سونیا جس کی عمر تقریباً چالیس سال ہے اور اس کے ساتھ اس کا عاشق سورج رہتا ہے سونیا ایک کمپنی میں جاب کرتی ہے سورج کی عمر بھی چالیس کے قریب ہے یہ دونوں ایک ساتھ اسی فلیٹ میں رہتے ہیں۔فلیٹ کے ایک کمرے میں سارا سامان پڑا ہے جو سونے، کھانے پینے اور لکھنے پڑھنے کے لیے استعمال ہوتا ہے لیکن گھر کا دوسرا کمرہ جو خالی ہے سونیا کبھی اس کو ہاتھ نہیں لگاتی جب کہ سورج سامان کی بے ترتیبی کو دیکھ کر کئی مرتبہ اس دوسرے کمرے کو بھی صاف کرنے کے لیے کہتا لیکن سونیا ہمیشہ اس بات کو ٹال جاتی ہے کیونکہ ان کے گھر کا دروازہ اکثر و بیش تر بند رہتا ہے لیکن پھر نہ جانے کہاں سے اس دوسرے کمرے میں لاشیں اکٹھی ہوتی رہتی ہیں دونوں اسی کشمکش میں رہتے ہیں کہ لاشیں کہاں سے ان کے کمرے میں جمع ہورہی ہیں اپنے اس ڈر کو SHARE کرنے کے لیے سونیا اپنی دوست شبانہ کو بھی بلاتی ہے، لیکن وہاں آکر شبانہ اس کو عجیب وغریب خواب سناتی ہے کہ اس کے ایک عزیز داؤد اور شیریں کا بچہ ٹنکو اچانک اس کے گھر میں نظر آیا، جبکہ اس کا فلیٹ بند تھا اور چابی بھی اس کے پاس تھی تو ٹنکو اس کے گھر کیسے پہنچا۔ٹنکو کو دیکھ کر شبانہ نے کچھ حیرت کا اظہار کیا، پھر ٹنکو کھیلتا رہا اور شبانہ اپنے کام میں مشغول ہوگئی، اور ٹنکو کی آمد کی اطلاع دینے کے لیے وہ شیریں اور داؤد کو تار بھیجنے کے لیے باہر چلی گئی، لیکن جب وہ واپس آئی تو اس نے دیکھا کہ ٹنکو بے حرکت زمین پر پڑا ہے وہ مر چکا تھا جبکہ وہ گھر کو لاک کر کے گئی تھی ہر جگہ کھڑکی اور جالی دار پردے تھے پھر ٹنکو کو کیا ہوا تھا آخر کار شبانہ پھر اس کے ماں باپ کو تار دینے گئی اور جلد پہنچنے پر اصرار کیا، لیکن ڈر اس بات کا تھا کہ ٹنکو کہ لاش سڑ نہ جائے جسے اس نے احتیاط سے فریج میں رکھ دیا، اب اس پر خوف و دہشت طاری ہو چکا تھا کہ کسی طرح ٹنکو کے والدین پہنچے انھوں نے کچھ کہنے کے بجائے شبانہ کو انعام دینے کی بات کہی جس سے وہ گھبرا گئی اور چیکھنے لگی لیکن اسی درمیان اس کی آنکھ کھل جاتی ہے۔

یہ محض شبانہ کا ایک خواب تھا اس خواب کی تعبیر سونیا اس طرح کرتی ہے کہ شبانہ داؤد سے عشق کرتی ہے جسے اس نے اپنی دوست شیریں کے لئے قربان کردیا تھا، اور داؤد کے بچے کی ماں بننے کی خواہش میں شبانہ

کو اس طرح ٹنکو کا مردہ ہونا دکھائی دیتا ہے۔ شبانہ کے اس خواب سے اس کی داخلی کیفیت اور اس کی نفسیاتی کشمکش کا اندازہ ہوتا ہے، جسے سونیہ بڑے بے تکلف انداز میں شبانہ کو اس کے دلی خواہش کے مر جانے کا سبب بتاتی ہے اور آخر کار شبانہ اپنی اس دلی خواہش پر ایک سرد آہ بھر کر رہ جاتی ہے۔

وہیں سونیا بھی اپنے اس کمرے سے پریشان ہے جس کے نام سے بھی اس کو وحشت ہوتی ہے۔ سورج اور سونیہ میں سے جب بھی کوئی اس کمرے کا رخ کرنے کی سوچتا ہے ان پر ایک عجیب قسم کا خوف طاری ہو جاتا ہے، اور عجیب بات یہ ہے کہ اس کمرے میں لاشوں کی تعداد روز بہ روز بڑھتی جاتی ہے۔ ڈرامے کے پہلے سین میں ایک لاش کا ذکر تھا لیکن دوسرے سین میں ایک لاش اور بڑھ جاتی ہے، جو سورج اور سونیہ دونوں کی حیرت میں اضافہ کرتی ہے کہ جب کمرہ کھڑکی اور دروازہ بند ہو جاتا ہے تو پھر یہ لاشیں کہاں سے گھر میں داخل ہوتی ہیں۔ ایک برہنہ لاش اس کمرے میں پچھلے بیس سال سے پڑی تھی لیکن اب ایک اور برہنہ لاش نظر آتی ہے۔ ایک مرتبہ وہ دونوں ہی لاشوں کو دفن کرنے کے منصوبہ بناتے ہیں اور انہیں ندی تک لے جانے کی سوچتے ہیں، لیکن وہ پولس کے ڈر سے کچھ نہیں کر پاتے۔ سونیا اکثر ان لاشوں کو شبانہ کے خواب کی طرح محض ایک بھیانک خواب بتاتی ہے، لیکن سورج اس سے کہتا ہے کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ ہم دونوں ایک ہی قسم کا خواب دیکھ رہے ہوں۔ بہر حال دونوں ہی لاشوں کو لوگوں کی نظروں سے چھپا کر رکھتے ہیں، لیکن وہ برہنہ لاشیں بڑھتی جاتی ہیں اور ہم تیسرے سین میں دیکھتے ہیں کہ ایک اور برہنہ لاش اس کمرے میں پڑی ہے، جواب تین ہو چکی ہیں آخر کار سونیہ اور سورج ان لاشوں کو اسی کمرے میں دفن کرنے کا ارادہ کرتے ہیں اور قبر کھودنے کی ترکیب نکالتے ہیں اور یہ طے کرتے ہیں کہ ہم میں سے کوئی ایک نوکری چھوڑ کر ہمیشہ اس بات کا خیال رکھے گا کہ کوئی اس کمرے میں داخل نہ ہو اس کے لیے ہمیشہ ہم میں سے کسی نہ کسی کا یہاں موجود رہنا ضروری ہوگا۔ اس کے لیے ہمیں لوگوں کی نظر میں اچھے اور مذہبی کام بھی کرنے ہوں گے تاکہ لوگوں کو ہم پر کبھی شک وشبہ نہ ہو، لیکن ڈرامے کے خاتمے پر سورج سونیہ سے کہتا ہے کہ یہ صرف ہمارا وہم اور خواب ہو، سونیہ اس بات سے اتفاق تو کرتی ہے لیکن ساتھ ہی اس کو یہ یقین بھی دلاتی ہے کہ اگر چہ یہ ایک خواب ہے لیکن اسے اب ہمیں زندگی بھر دیکھنا ہے۔

زاہدہ زیدی کا یہ ڈرامہ بھی وجودی نظریہ کا حامل ہے۔جس میں ابسرڈ ڈرامے کی خصوصیات زیادہ واضح طور پر نظر آتی ہیں۔ پورا ڈرامہ علامتی انداز میں پیش کیا گیا ہے شبانہ کا خواب اور گھر میں بڑھتی ہوئی برہنہ لاشیں گہرے علامتی طرزِ فکر کی نمائندگی کرتی ہیں۔ خاص کر انسان کے اندرونی وہم وخیال کو ظاہر کرتی ہے۔جس میں سونیا خود شبانہ کے خواب اور وہم کو نفسیاتی الجھنوں کا ہونا بتاتی ہے۔اس ڈرامے کے تمام کردار شبانہ، سورج، سونیہ سب نفسیاتی اور ذہنی کشمکش میں گرفتار اور اپنی دلی خواہشوں کو اپنے اندر چھپائے ہوئے ہے۔ان کی یہ دبی خواہشات اس ڈرامے میں بھی اس وقت ظاہر ہوتی ہیں جب شبانہ اپنا خواب سونیہ کو بتاتی ہے جسے سونیہ شبانہ کے اندر کی دبی خواہش کو خواب کی شکل میں ظاہر ہونا کہتی ہے۔زاہدہ زیدی لکھتی ہیں ؛

> اس ڈرامے کی مرکزی علامتیں دوسرا کمرہ اور اس میں نمودار ہونے والی لاشیں ہیں جو ڈرامے کے مرکزی تجربے اور وژن کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں، اس کے علاوہ شبانہ کا خواب بھی گہری علامتی معنویت کا حامل ہے، جو نہ صرف شبانہ کے داخلی تجربات اس کی تشویش اور اندیشوں کی تجسیم ہے، اور اقدار کی شکست وریخت کا المیہ ہے، بلکہ وہ ڈرامے کے مرکزی ایکشن پر بھی ایک نئے زاویے سے روشنی ڈالتا ہے۔ان ہمہ جہت علامتی عناصر کے علاوہ سونیہ اور سورج کا بے اولاد ہونا، مینا کا خالی پنجرا محلے کے نوجوان لڑکے کی خودکشی، دوسرے کمرے میں اور دیوان کے نیچے کوڑے کباڑ کے ڈھیر اور گلی میں گندی نالیاں اور کوڑے کے ڈھیر بھی کچھ ایسے عناصر ہیں جو حقیقی ہوتے ہوئے بھی علامتی معنویت کے حامل ہیں اور ڈرامے کہ تہ داری میں اضافہ کرتے ہیں۔5

اس ڈرامے کی بنیاد کسی کہانی یا واقعہ پر نہیں ہے بلکہ اس میں فکری اور حسیّاتی فضا پر زیادہ زور دیا گیا ہے اور اس کے ذریعے کرداروں کی داخلی کیفیت کو ابھارا گیا ہے۔اس ڈرامے میں حقیقت اور فینٹسی کی آمیزش ہے۔اس ڈرامے کو پڑھ کر ایک عجیب سا خوف طاری ہوتا ہے جو برہنہ اور روز بروز بڑھتی ہوئی لاشوں کی وجہ سے ہے۔ یہ انسان کے تحت الشعور میں چھپا ہوا ڈر، وسوسے اور خوف ہے یہ احساس جرم اور تہذیب واقدار کی شکست وریخت آج کے بحرانی دور میں ہر انسان کے اندر موجود ہے اس ڈرامے کے ذریعے انسان کے انہیں داخلی اندیشوں اور تشویش کو تجسیم دے کر ابھارا گیا ہے۔

4۔وہ صبح کبھی تو آئے گی:

اس ڈرامے کی کہانی ہندوستانی متوسط گھرانے کی اس ماحول کی عکاسی ہے جہاں عورت کو نہ صرف گھر کی چار دیواری میں قید کر کے اس کے حقوق کی پامالی کی جاتی ہے بلکہ اس پر جس طرح سے بھی ممکن ہوتا ہے ظلم وستم کرنے میں بھی کوئی کسر نہیں کی جاتی ۔ڈرامہ اس طرح شروع ہوتا ہے کہ ایک مرد اپنی بیوی کو رات کے وقت مار پیٹ کرتا ہوا نظر آتا ہے محلے کے لوگ اپنی اپنی چھتوں سے اس تماشے کو دیکھتے ہیں اور طرح طرح کی باتیں بناتے ہیں عورت ایک تین چار سال کے بچے کو گود میں لئے ہوئے گھر کے دروازے پر ہے جہاں اس کا شوہر جیٹھ اور ساس ظلم کرتے ہوئے نظر آتے ہیں شوہر کسی بات پر بیوی کو مارتا ہے اور عورت ہائے ہائے کرتی اسی جگہ بیٹھی رہتی ہے ساس شوہر اور جیٹھ تینوں چاہتے ہیں کہ عورت گھر کے اندر چلے جو کچھ بھی ہونا ہے گھر کے اندر ہوگا کیوں کہ انہیں اپنی جھوٹی ناموس کا بھی خیال ہے لیکن عورت اسی طرح بیٹھی رہتی ہے اور ان تینوں سے گالیاں بھی سنتی ہے۔

دوسرے منظر میں تین لڑکے نشے میں دت نظر آتے ہیں جو ایسا لگتا ہے کوئی فلم دیکھ کر آرہے ہیں اور آپس میں کچھ باتوں میں مشغول ہیں ان کے ساتھ ان کی محبوبہ بھی ہے جو کافی ماڈرن اور بولڈ ہے اور خود کو broad minded اور independent کہتی ہے وہ اپنی شادی اور دوسرے کاموں کا فیصلہ خود کر سکتی ہے کیوں کہ اب وہ قانونی طور پر بالغ ہو چکی ہے اسی لیے اسے اسکی مرضی سے جینے کا حق اور اپنے فیصلے خود لینے کی آزادی ہے۔

لیکن وہیں دوسری طرف uneducated اور مڈل کلاس طبقہ ہے جہاں اس معصوم عورت کو مارا پیٹا جاتا ہے سب اس ستم زدہ عورت کی ہائے پکار سنتے اور دیکھتے ہیں کہ کس طرح ایک شوہر اپنی بیوی کو مار پیٹ رہا ہے لیکن کوئی اس عورت کو بچانے کی ہمت نہیں کرتا سب اپنے کام سے چلے جاتے ہیں حتیٰ کہ محلے اور آس پاس کے لوگ رات بھر اس عورت کی مار پیٹ کا تماشا دیکھتے رہے بلکہ عورت کو ہی برا بھلا کہتے کہ شوہر سے زبان لڑانے کی وجہ سے مار کھاتی ہے لیکن کوئی اس سے ہمدردی نہیں رکھتا اس عورت کی ساس برابر اپنے بیٹے کا ساتھ دیتی ہے اور گالی گلوج بھی کرتی ہے عورت کے پاس ایک چھوٹے بچے کے علاوہ ایک لڑکی بھی ہے جو اپنی

ماں کے ساتھ لگے کھڑی ہے دونوں بچے مظلوم ماں کی طرف دیکھتے جاتے ہیں۔شوہراور ساس اس کو اندر گھسیٹنے میں لگے ہیں لیکن وہ عورت اندر جانے کا نام نہیں لیتی محلے والے بھی نیند خراب ہونے کی وجہ سے الٹا سیدھا بولتے ہیں عورت گیٹ کی طرف تیزی سے دوڑتی ہے اور کچھ دور جا کر چھپ جاتی ہے۔باہر کچھ آوارہ مرد اس کو دیکھ کر ندیدے پن کا مظاہرہ کرتے ہیں لیکن اس کے پیچھے اس کا شوہر آجاتا ہے ساتھ میں اس کی کم سن لڑکی بھی آجاتی ہے اور اسے گھر چلنے کے لیے کہتی ہے شوہر بیوی کو گھسیٹتا ہوا لے جاتا ہے، اتنے میں سپاہی آجاتا ہے اور اس عورت سے کہتا ہے کہ اگر یہ لوگ تجھ پر ظلم کرتے ہیں تو رپورٹ لکھوانے تھانے چل۔لیکن عورت اس کے ساتھ نہیں جاتی کچھ دیر بعد شوہر اس کو سمجھا بجھا کر گھر لے آتا ہے۔عورت بھی خاموشی سے اندر چلی جاتی ہے۔

صبح کا منظر کچھ اس طرح کا ہے عورت کے سر پر پٹی بندھی ہے اور بدن پر خون کے دھبے ہیں اس کی بیٹی آشا کی دوست زویا اس پٹی کے بارے میں پوچھتی ہے تو وہ مظلوم آنسو پونچھتے ہوئے کہتی کہ کوئی بات نہیں لیکن آشا زویا کہ سوال کا جواب دیتی ہے یہ ظلم اس وقت تک ہے جب تک کہ وہ بڑی نہیں ہو جاتی اور کبھی تو وہ صبح ہوگی جب وہ بڑی ہو کر اپنی ماں کے ہر ظلم کا جواب دے گی اور زویا اس کا ساتھ دینے کا وعدہ کرتی ہے مظلوم عورت خاموشی سے بیٹھی کپڑے دھوتی رہتی ہے اور سوچتی ہے''وہ صبح کبھی تو آئے گی''اور پھر اپنی ساری کے پلو سے آنسو پونچھ لیتی ہے

یہ کہانی ہمارے ہندوستانی معاشرے کی اس تصویر کو پیش کرتی ہے جہاں ہزارہا عورتیں ظلم وستم کو برداشت کرتی ہیں ان کے حقوق کا استحصال ہوتا ہے انہیں گھر کی چار دیواری میں قید رکھا جاتا ہے اور ان پر ظلم و ستم کی بھی انتہا نہیں کی جاتی عورتوں کی اسی بدترین حالت کو زاہدہ زیدی نے اس ڈرامے کی مدد سے پیش کیا ہے وہ اس کے بارے میں لکھتی ہیں:

> وہ صبح کبھی تو آئے گی ہمارے سماج میں عورت کے استحصال اور جبر کی جیتی جاگتی تصویر ہے جو اپنے سماجی،ثقافتی اور اخلاقی پس منظر کے ساتھ ہمارے سامنے کھلتی چلی جاتی ہے یہ صرف ایک عورت کی مظلومی کی داستان نہیں بلکہ اس میں سوسائٹی کی کھوکھلی اقدار،فرسودہ خیالات بھونڈے انداز فکر،تنگ نظری،بےحسی اور عورتوں کے متعلق بے ہودہ تصورات اور قابل اعتراض رویوں کی ایک جھلک ہے جو ایک مخصوص صورت حال میں قدرتی انداز سے ہمارے

سامنے آتی ہے۔۔اس ڈرامے کا مجموعی تاثر بھیانک اور کرب ناک ہے لیکن بعض کرداروں کے ردعمل میں فکر کی مدم لو مرتعش نظر آتی ہے لیکن یہ کمزور روشنی ماحول کی بھیانک تاریکی کو چیرنے میں ناکام اور اکثر مضحکہ خیز حد تک ناکافی نظر آتی ہے۔6

یہ ہمارے سماج کے ایک متوسط طبقے کی تصویر کشی کرتی ہے اس میں گھر کا ماحول بھی ناخواندگی کا اشارہ یہ ہے کردار، مکالمے میں اور آس پاس کے لوگ بھی ایک متوسط ماحول کی نمائندگی کرتے ہیں ڈرامے میں دو طبقوں کی ذہنیت کو بھی نمایا کیا گیا ہے ایک یہ جاہل اور متوسط طبقہ دوسرا تین لڑکوں اور ایک ماڈرن لڑکی اور ان کا ایجوکیٹیڈ ماحول جہاں نہ صرف تعلیم یافتہ لوگ ہیں بلکہ خود کو broad minded بھی کہتے ہیں اور لڑکیاں اپنا حق استعمال کرنا بھی جانتی ہیں اور اپنے فیصلے خود کر سکتی ہیں۔ان کے علاوہ ڈرامے میں عورت کی کم سن لڑکی آشا اور اس کی سہیلی زویا کا ردعمل جاندار ہے اور مثبت ہے یہ دونوں لڑکیاں مستقبل کے لیے پر امید نظر آتی ہیں اور ان کے لہجے میں انقلابی رویہ بھی ہے۔

5۔اور جنگل جلتا رہا:

نو مناظر پر مشتمل ایک طویل ڈرامہ ہے اس ڈرامے کے اہم کردار گھر کی بزرگ خیر النساء ان کا بیٹا عاشق علی اس کی بیوی شکیلہ دونوں کا بیٹا عرفان جس کی عمر تقریباً 21 سال ہے اس کا مزاج فلسفیانہ ہے جو صرف اپنے آپ میں گم رہتا ہے ان کی بیٹی شہناز جس کی عمر 24/25 سال ہے خوبصورت اور ماڈرن ہے خیر النساء کی نواسی ہے جس کی عمر 26/27 سال ہے اور جو اپنی ماں کے انتقال کے بعد اپنی ننھال میں رہتی ہے ان کا ایک ملازم بہادر بھی ان کے ساتھ اس خاندان کے علاوہ عاشق کا دوست عطاء الرحمن ہے جو یونیورسٹی کا پروفیسر ہے اس کی عمر تقریباً 59/60 سال ہے۔یہ شمالی ہند کے کسی پہاڑی شہر کے قریب ایک پرانی اور بوسیدہ کوٹھی میں رہتے ہیں جو اونچے پہاڑوں اور طویل درختوں سے گھری ہے اس گھر کی مالکن خیر انساء ہیں جس کی طبیعت اب ناساز ہے اور زیادہ وقت بیڈ پر گزارتی ہیں اس بیڈ کے قریب دوائیاں بھی رکھی ہیں گھر کی زیادہ تر چیزیں اور فرنیچر پرانا ہے گھر میں خیر انساء، عرفان، شاہدہ اور عاشق علی رہتے ہیں جب کہ شکیلہ اور شہناز لکھنؤ میں اپنی ایک پرانی کوٹھی میں رہتے ہیں شکیلہ کو سیاست میں دلچسپی ہے اور وہ کسی سیاسی پارٹی کا رکن بھی ہے اور اب وہ چاہتی

ہے کہ خیر انساء جائداداور کوٹھی شاہدہ کے نام کردیں اس لیے اس کوٹھی کو اپنے نام لکھوانے کی غرض سے لکھنؤ سے وہ اور اس کی بیٹی شہناز شملہ آئی ہوئی ہیں دوسرے یہ کہ شہناز کی شادی ہونے والی ہے اس لیے شکیلہ چاہتی ہے کہ خیر النساء زیورات بھی شہناز کو دے دیں وہ دونوں ماں بیٹی ہم خیال بھی نظر آتی ہیں شکیلہ کو سیاست کے علاوہ شاعری میں بھی دلچسپی ہے اور وہ خود بھی شاعری کرتی ہے۔

جب کہ اس کا بیٹا عرفان ایک ذہین حساس اور فلسفیانہ قسم کے خیالات رکھنے والا نوجوان ہے وہ اپنی دادی کے ساتھ اسی پہاڑی کوٹھی میں رہتا ہے اور اپنا زیادہ تر وقت تصویریں بنانے میں صرف کرتا ہے شاہدہ گھر کی دیکھ بھال کرتی ہے عاشق علی بھی اسی پہاڑی کوٹھی میں اپنی ماں کے ستاھ ہی رہتا ہے وہ اپنی بھانجی شاہدہ اور ماں سے محبت تو کرتا ہے لیکن اپنی بیوی کا غلام بلکہ مجبور نظر آتا ہے خیر انساء جس کمرے میں لیٹی ہے اس کمرے کی کھڑکی سے گھنے جنگل نظر آتے ہیں جن میں کچھ دنوں سے آگ لگی ہوئی ہے خیر انساء بار بار اس آگ کے بجھنے کا پوچھتی رہتی ہے ملازم بھی انہیں آ کر خبر دیتا رہتا ہے کہ پاس کے جنگلوں میں آگ لگ گئی ہے اسی لیے خیر انساء کو ڈر ہے کہ وہ آگ کہیں ان کے گھر کو بھی اپنی زد میں نہ لے لے جب کہ عاشق علی کا خیال ہے کہ گرمی کے موسم میں جنگل میں آگ لگ جاتی ہے۔

بہرحال گھر میں اس وقت کچھ دوسرے لوگوں کی بھی آمد نظر آتی ہے دلدار حسین جس کی عمر 60 سال ہے عاشق علی کے دوست اور دور کے رشتہ دار ہیں وہ بھی کچھ دن کے لیے شملہ آئے ہوئے ہیں ان کے علاوہ عطاء الرحمٰن بھی عاشق علی کے دوست ہیں وہ بھی آج کل یہیں تشریف لائے ہوئے ہیں یہ سب دوست شکیلہ اور شہناز ایک کمرے میں محو گفتگو ہیں جن کے لیے شاہدہ کھانے کا انتظام کرتی ہے۔ گفتگو کے بعد شکیلہ عاشق علی سے اصل مدعا پر بات کرتی ہے کہ وہ کوٹھی کو اس کے نام پر لکھوانے کی بات اپنی ماں سے کرے عاشق علی کچھ تذبذب میں مبتلا ہیں لیکن وہ شکیلہ کی ضد کے آگے ہار جاتے ہیں اور اپنی ماں سے اس سلسلے میں بات کرتے ہیں خیر انساء کوٹھی عرفان کے نام پر کرنا چاہتی ہیں لیکن پھر بھی کسی طرح عاشق علی کی بات پر راضی ہو جاتی ہیں اور کوٹھی شکیلہ کے نام پر کر دیتی ہیں اس کے علاوہ شکیلہ خیر انساء کے زیورات جو انہوں نے شاہدہ کے لیے رکھے ہیں اور اس کی ماں کی نشانی ہیں وہ بھی شہناز کو دے دیتی ہیں۔

عطاء الرحمٰن اور دلدار حسین کا کردار بھی ڈرامے کو آگے بڑھانے میں معاون ہے عطاء الرحمٰن اپنی گورنمنٹ جاب سے اب رٹائر ہو چکے ہیں اور اپنی تخلیقات میں خون جگر صرف کر رہے ہیں دلدار حسین پی۔ ایچ۔ ڈی کر رہے ہیں اور اپنی تھیسس جمع ہونے کے انتظار میں جو شاید ان کے ہیڈ ماسٹر کی ناراضگی کی وجہ سے رکی ہوئی ہے وہ شاہدہ کی طرف عاشقانہ نظر رکھے ہیں جب کہ شاہدہ ایک خاموش مزاج اور سنجیدہ لڑکی ہے وہ ہر وقت اپنے کام میں مشغول رہتی ہے عرفان بھی شاہدہ کے قریب ہے اور اپنی سگی بہن شہناز سے زیادہ شاہدہ کا ہم خیال ہے۔

خیر الانساء سے کوٹھی کے کاغذات پر دستخط اور زیورات لینے کے بعد شکیلہ اور شہناز لکھنؤ کے لیے روانہ ہو جاتی ہیں کیونکہ شکیلہ کو شہناز کی شادی کی تیاری بھی کرنی ہے اور اسمبلی کے الیکشن کی مصروفیات بھی ہوگی ان کے جانے کے بعد خیر انساء کی طبیعت زیادہ خراب ہو جاتی ہے ایک صبح جب شاہدہ خیر النساء کے پاس جا کر آواز دیتی ہے تو وہ کوئی جواب نہیں دیتیں ان کے چہرے پر کپڑا پڑا ہے شاہدہ ان کی پیشانی پر ہاتھ رکھتی ہے تو بالکل ساکت کھڑی رہ جاتی ہے اور پھر خیر انساء کی آنکھیں بند کرنے کے بعد وہ کپڑا ڈھک دیتی ہے باہر سے ملازم کی بھی آواز آتی ہے دیدی جنگل کی آگ بجھ چکی ہے دھواں ابھی دکھائی نہیں دیتا صرف راکھ بچی ہے جس کا مطلب صاف تھا اور جو خیر انساء کی موت کا اشارہ تھا۔

یہ ڈرامہ ایک متوسط گھرانے کی ماحول کی عکاسی کرتا ہے جس میں دس بارہ دن کی زندگی کی اتار چڑھاؤ کا دکھایا گیا ہے۔ اور اس گھر کے افراد کے ذریعہ اس گھر میں ہونے والی سیاسی، ثقافتی، علمی اور تہذیبی جھلکیاں نظر آتی ہیں اور اس کے علاوہ متوسط گھرانوں میں ہونے والی نوک جھوک اور رقابتیں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ زاہدہ زیدی کا خیال ہے:

> اور جنگل جلتا رہا بظاہر ایک متوسط خاندان کی زندگی میں دس یا بارہ دن کی داستان ہے جس میں اس خاندان کی تین نسلوں کے چھ افراد کے علاوہ دو دوست عطاء الرحمٰن اور دلدار حسین اور ایک کم عمر ملازم بہادر حصہ لیتے ہیں انتون چیخوف کے ڈراموں کی طرح یہ ڈرامہ بھی ہیرو و ہیرائن کے اردگرد نہیں گھومتا بلکہ اس کے سبھی کردار کم و بیش یکساں اہمیت کے حامل ہیں اور ڈرامے کے مرکزی خیال اور وژن کی تشکیل اور تجسیم میں معاون ثابت ہوتے ہیں جس طرح

ایک موسیقی کی محفل میں سازوں اور آواز کا سنگم ایک گہرے اور معنی خیز نغمے کو جنم دیتا ہے لیکن کسی حد تک یہ کہنا ممکن ہے کہ اس خاندان کے چھ افراد ڈرامے کے مرکزی کردار ہیں جب کہ عطاء الرحمٰن اور دلدار حسین مرکزی صورت حال پر مختلف زاویوں سے روشنی ڈالتے ہیں اور ایک ثقافتی ماحول کی تشکیل میں معاون ثابت ہوتے ہیں دوسری طرف بہادر اس خاندانی ڈرامے کا رشتہ باہر کی دنیا اور کائناتی نظام سے رشتہ جوڑتا ہے۔7

شاہدہ جو اس ڈرامے میں نیکی اور شرافت کا مجسمہ ہے وہ ایک صابر، شاکر لڑکی ہے جو اپنے حالات کو اچھی طرح سمجھتی ہے جب کہ شہناز ایک حساس بشاش اور زندہ دل لڑکی ہے اس کا بھائی عرفان ایک سنجیدہ اور ذہین نوجوان ہے عاشق علی نیک نیت ہیں لیکن ان کی بیوی شکیلہ ایک خودغرض اور قابل قدر صلاحیتوں کی مالک خود پرست عورت ہے ان کرداروں کے علاوہ جنگل کی آگ کو علامتی اظہار کے لیے بیان کیا ہے یہ زندگی اور موت کے فلسفیانہ تصور کو بھی پیش کرتا ہے جس میں سماج کی تخریب، اقدار تشدد اور المنا کی کا بھی اشارہ ہے کہ ڈرامے میں خیر النساء کا بار بار جلتے ہوئے جنگل کے بارے میں پوچھنا کہ یہ جنگل اگر اسی طرح جلتا رہا تو دوسرے معصوم لوگوں اور آس پاس کے علاقوں کو بھی جلا کر اپنی زد میں لے لیگا۔

بقول زاہدہ زیدی:

> اس کی مرکزی علامت جلتا ہوا جنگل ہے جو ایک تہ دار اور پیچیدہ علامت ہے اور مختلف تناظر میں اپنے مختلف معنوں اور کیفیات کو ظاہر کرتی ہے کہیں یہ زندگی کی پراسرار معنویت کا اشارہ ہے جو ابتدائی انسان کے تجربات میں سموئی ہوئی ہے کہیں یہ ایک وسیع تر کائنات اور اس کی تخریب کاری، تشدد اور المنا کی کا اشاریہ ہے جس کی طرف ہم طور سے آنکھیں بند کئے رہتے ہیں لیکن جو کبھی کبھی ہماری محفوظ زندگی میں بھی در آتی ہے کہیں یہ زندگی اور موت کے فلسفہ کا احاطہ کئے ہوئے ہے اور خیر النساء کی زندگی کی اس ٹمٹماتی ہوئی شمع کا روپ ہے جسے ہر رنگ میں سحر ہونے تک جلنا ہے اور کہیں یہ اس خاموش آگ کا اشارہ ہے جو اس خاندان کی زندگیوں اور باہمی تعلقات کی زیریں تہوں میں سلگ رہی ہے اور جس کا مرکز شکیلہ کی روح کی گہرائیوں میں سلگتی ہوئی نفرت اور انتقام کی آگ ہے۔ اس مرکزی علامت کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کی طرف مختلف کرداروں کا رویہ ان کی اصلیت کی شناخت کا وسیلہ بن جاتا ہے خیر النساء چاہتی ہیں کہ اس سلسلے میں کچھ کیا جائے کیونکہ یہ آگ معصوم لوگوں اور بستیوں کو جلا سکتی ہے، عاشق علی اس آگ کی طرف سے آنکھیں بند کرنے اور اسے بھلا دینے کا رویہ اختیار کرتا ہے شکیلہ اسے اپنے احساس جمال کی تسکین کا وسیلہ بناتی ہے۔عطاء

الرحمٰن اس رویے کی کڑی تنقید کرتا ہے لیکن اس سلسلے میں خود کچھ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ بہادر جو ایک ان پڑھ اور معصوم لڑکا ہے اسے پوری شدت اور پراسراریت کے ساتھ محسوس کرتا ہے۔8

اس ڈرامے میں ہمیں المیہ اور طربیہ دونوں عناصر کی آمیزش ملتی ہے کیوں کہ ایک طرف تو خیر النساء کی زندگی کا چراغ ٹمٹماتا دکھائی دیتا ہے جو اس ڈرامے کا المیہ ہے تو دوسری طرف شکیلہ کے الیکشن لڑنے، شہناز کی شادی کی اور شکیلہ کو کوٹھی اپنے نام لکھوانے کی خوشی ہے جس سے ڈرامے میں المیہ اور طربیہ دونوں عناصر کی شمولیت پیدا ہو جاتی ہے اس کے علاوہ ڈرامے میں شاعرہ انداز بیان سے بھی کام لیا گیا ہے جس کو شکیلہ کے ذریعہ پیش کیا گیا اس کی طبیعت میں شاعرانہ عناصر موجود ہیں جو بے تکلفی سے اپنے اشعار سناتی ہے علاوہ ازیں ڈرامے میں کرداروں کی اندرونی و داخلی کیفیات کو بھی نمایاں کیا گیا ہے جو وقتاً فوقتاً ہمارے سامنے ظاہر ہوتی رہتی ہیں۔

6۔صحرائے اعظم:

صحرائے اعظم زاہدہ زیدی کا ایک طبع زاد طویل ڈرامہ ہے جس کا انتساب عراق کے ان شہروں کے نام ہے جو خلیجی جنگ میں تباہ و برباد ہو گئے تھے یہ ڈرامہ پندرہ مناظر پر مشتمل ہے جو اس وقت لکھا گیا تھا جب خلیجی جنگ سے پورا عراق برباد ہو چکا تھا ڈرامہ گوگو اور دیدی کی آپسی گفتگو سے شروع ہوتا ہے جو لق و دق صحرا میں ایک سوکھے درخت کے نیچے کسی طرح جنگ کی تباہ کاری سے بچ کر بھاگ نکلے ہیں یہ دونوں شیطانی سازشوں، بادشاہ کی مکاریوں اور خونی واقعات کے شاہد ہیں دونوں خوف زدہ اس المناک حادثے کا شکار ہیں اور اس صحراء میں گودو کا انتظار کر رہے ہیں جو ان خطرناک طاقتوں سے لڑنے کی ہمت رکھتا ہے گوگو اور دیدی اسی کی راہ دیکھ رہے ہیں۔

گوگو اور دیدی کے علاوہ اس ڈرامے کا مرکزی کردار بادشاہ کیٹس بھی ہے جو تمام ملکوں کا سردار ہے جس کے حکم سے بے گناہ اور اس کے حکم کی تعمیل نہ کرنے والوں پر ظلم و ستم کے بادل چھائے ہیں وہ ان تمام ملکوں کو ختم کر دینا چاہتا ہے جو اس کے خلاف بغاوت کرتے ہیں اسی طرح کا ایک ملک اور اس کا بادشاہ بہرام ہے اپنے ملک کو دوسروں کی ماتحتی سے بچانا چاہتا ہے اور اپنے ملک کو صرف اپنا اور اپنی رعایا کا حق سمجھتا ہے اس کو

شہنشاہ کیٹس تباہ کرنے پر آمادہ ہے، کیٹس شاہ مزگان سے کہتا ہے کہ" بہرام۔ بہرام۔ بہرام کیا تم لوگوں کو یہ نہیں بتا سکتے کہ بہرام چور ہے، ڈاکو ہے، مغرور ہے، برتر قوموں کی برابری کرتا ہے اور چلا چلا کر کہتا کہ انہیں اپنے خزانوں اور سونے چاندی کی کانوں پر پورا حق ہے اس لیے ہمیں اسے اس کی سرکشی کا مزا چکھانا ہے۔" 9

اور پھر شہنشاہ کیٹس اس ملک کو توپوں اور جنگی ہوائی جہازوں کے ذریعہ تباہ کرتا ہے وہاں کی رعایا لاشوں کی انبار کی شکل میں پڑی ہے عورتیں بچے مرد سب ملبے میں دبے پڑے ہیں مردہ عورتوں کو ننگا کر کے شہنشاہ ہوس کا اپنی ہوس کا نشانہ بناتا ہے اور بہرام کے سر کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھنا چاہتا ہے تا کہ کوئی دوسرا اس کی طرح بغاوت کی ہمت نہ کر سکے۔ کیٹس کے اس شرمناک کام میں دوسرے ملک بھی اس کی پوری مدد کرتے ہیں اور اس سازش میں کیٹس کے ساتھ نظر آتے ہیں کیٹس تمام ملکوں کو اپنی طرف کئے ہوئے ایک غریب ملک پر ظلم و ستم کر رہا ہے اور دوسرے ملکوں کے خزانوں میں بھی حصہ کئے ہوئے ہے اس کے چاروں طرف حسین رقاصائیں گردش کرتی نظر آتی ہیں اور وہ طاقت کے نشے میں چور عیاشی کرتا رہتا ہے اور اپنے گرد و پیش کام کرنے والے سپاہی، فوجی سرداروں اور جاسوسوں کو کڑی سے کڑی کارباہی کرنے پر آمادہ رکھتا ہے اس نے ہر ایک ملک کو بہرام کا سر لانے کے عوض اپنا قریبی دوست بنانے کی پیش کش کی ہے جس کی وجہ سے ہر ملک اسی کوشش میں سرگرداں ہے کہ بہرام کا سر سب سے پہلے وہ لائے۔

اس لڑائی میں جیت حاصل کرنے اور بہرام کو قتل کرنے کی کیٹس ہر طرح سے کوشش کرتا ہے کئی طرح کے منصوبے بناتا ہے یہاں تک کہ دوسرے ملک کے بادشاہوں کو بھی حکم دیتا ہے کہ وہ اپنے شہروں میں بہرام کے خلاف مورچہ نکالیں اور لوگوں کو اس کا حمایتی اور بہرام کا دشمن بنائیں تا کہ لوگ بہرام کے نظریہ کی مخالفت کریں ساتھ ہی شہنشاہ کیٹس بہرام کے دیس میں بھی اس کے خلاف سازش کرنے کا منصوبہ بناتا ہے تا کہ لوگ اس کے خیالات سے بغاوت کریں کیٹس کو اپنا حمایتی جانیں اور اس کی ماتحتی قبول کریں۔ لیکن ڈرامے کے خاتمے تک کیٹس کو اپنے اس منصوبے میں کامیابی دکھائی نہیں دیتی اگر چہ وہ ظلم و ستم کی ساری حدیں پار کر دیتا ہے۔ تمام ملک اور اس کے شہروں کو برباد کر دیتا ہے ملک کی رعایا پر بم برساتا ہے ساری عوام کو کچل کر رکھ دیتا ہے۔

اس کی ساری سازشوں اور ظلم و ستم کے چونکہ گوگو اور دیدی شاہد ہیں جنہوں نے سب کچھ اپنی آنکھوں

سے دیکھا اور کانوں سے سنا تو وہ اس بات کا عہد کرتے ہیں کہ اگر چہ وہ کچھ نہیں کر سکتے کیوں کہ گوگو اور دیدی کو زاہدہ زیدی نے ڈرامے میں ناظرین کی حیثیت سے پیش کیا ہے اسی لیے اتنا تو وہ کر سکتے ہیں کہ اس ڈرامے کے ذریعہ شہر شہر اور ملک ملک کیٹس کے اس ظالمانہ چہرے کو پوری دنیا کے سامنے بے نقاب کریں گے۔ دیدی اور گوگو کہتا ہے؛

''دیدی۔ یہ ڈرامہ ہمیں دیش دیش اور شہر شہر دکھانا ہے۔

گوگو۔ اچھا تو پھر چلتے ہیں اب ہم یہی ڈرامہ ہر جگہ دکھائیں گو دو کا انتظار کسی اور اسٹیج پر کچھ اور ایکٹر کر سکتے ہیں ____

دیدی۔ ٹھیک ہے چلتے ہیں____ '' 10؎

اس طرح گوگو اور دیدی اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں ساتھ ہی دیدی یہ بھی منصوبہ بناتا ہے ہم بہرام کے دیس جا کر اس کی رعایا کو بتائیں گے کہ کیٹس کے کہنے میں آ کر وہ آپس میں خون خرابہ نہ کریں بلکہ شہنشاہ کی کوششوں کو ناکام بنائیں۔ شاید وہ لوگ ہماری بات سنیں۔ اور پھر یہ طویل ڈرامہ اختتام پذیر ہو جاتا ہے۔ ڈرامے کے آخر میں زاہدہ زیدی نے اس مضمون پر ایک نظم ''یہ جنگ سفاک سازشوں کا کوئی ثمر ہے'' کے عنوان سے قلم بند کی گئی ہے اس میں جنگ کی تمام ہلاکت خیزیوں کا ذکر ہے۔

یہ ڈرامہ زاہدہ زیدی نے اس وقت تخلیق کیا جب خلیجی جنگ جاری تھی اور امریکہ نے عراق پر حملہ کر کے پورے عراق کو تباہ و برباد کر دیا تھا زاہدہ زیدی اس جنگ سے اس درجہ متأثر ہوئی تھیں کہ ان کا ذہن و دماغ ایک کرب میں مبتلا ہو گیا تھا اور انہوں نے اپنی نفسیاتی اور ذہنی الجھن کو اپنی اس تخلیق کے ذریعہ پیش کیا وہ اس تخلیق کا سبب یوں لکھتی ہیں:

صحرائے اعظم کی تخلیقی کاوش کی ابتداء اس وقت ہوئی جب خلیجی جنگ اپنے پورے عروج پر تھی اور میں اس خونی ڈرامے سے اس قدر متاثر ہوئی اور اس قسم کے ذہنی اور روحانی کرب سے گزری کہ اگر میرے جذبات، مشاہدات اور غم و غصہ ایک فن پارے کو جنم دینے پر مائل نہ ہو جائے تو ان کی شدت میرے لیے ناقابل برداشت ہو جاتی۔ 11؎

اس ڈرامے کے ذریعہ زاہدہ زیدی نے امریکہ کی سچائی کا بھی پردہ فاش کیا ہے جس نے پورے عراق

کو برباد کردیا اور صدام حسین کے عزم و حوصلے کو بھی دکھایا ہے جنہوں نے امریکہ سے آنکھ ملانے اور مقابلہ کرنے کی جرأت کی اور اپنے قوت بازو پر بھروسہ کرتے ہوئے اس کے حملوں کا مقابلہ کیا اور صبر و استقلال کے ساتھ تمام مصائب اور ظلم و زیادتی کو برداشت کیا اس کے علاوہ جنگ سے پیدا ہونے والے عام لوگوں کے شدید خوف والم کو بھی دکھایا ہے یہ ڈرامہ ہمارے دور کا ایک دردناک اور بھیانک المیہ ہے جو جنگ کے نتیجے کے طور پر ہمارے سامنے آتا ہے۔

اس ڈرامے کا مرکزی کردار گوگو اور دیدی کو زاہدہ زیدی نے بیکٹ کے مشہور ڈرامے ''گودو کا انتظار (waiting for Gogot) سے لیے ہیں جس میں اصل کردار کا نام دیدی یعنی ولادی میر اور گوگو استراگوں ہیں یہ دونوں کردار بھی گوگو اور دیدی کی طرح ایک لق و دق صحراء میں گودو کا انتظار کرتے ہیں جو پورے ڈرامے میں کہیں بھی نمودار نہیں ہوتا۔ یہ صورت حال ہم دونوں ڈراموں میں دیکھ سکتے ہیں کہ یہ کردار ہمیشہ گودو کا انتظار کرتے ہیں لیکن وہ نہیں آتا یہ دونوں کردار ڈرامے میں ہیں اور ڈرامے کو پیش کرنے والے بھی ہیں یعنی دونوں ڈرامے کے کردار تو ہیں لیکن ڈرامے میں عمل کرنے سے قاصر ہیں پھر آخر میں یہی دونوں اس ڈرامے کو جگہ جگہ پیش کرنے کی بات کرتے ہیں تا کہ امریکہ کی اصلیت سب کے سامنے لا سکیں۔ان کا تعارف زاہدہ زیدی نے اس طرح کیا ہے:

> صحرائے اعظم میں دیدی اور گوگو کا رول کافی اہم اور تہہ دار ہے وہ اس ڈرامے کا کورس بھی ہیں اور ان شیطانی سازشوں اور خونی واقعات کے عینی گواہ بھی۔اور سب سے اہم بات یہ کہ وہ اس ڈرامے کے تناظر میں ایک عام انسان کا روپ ہیں جو ان المناک حادثات سے گذرتا ہے اور انہیں پوری شدت سے محسوس کرتا ہے لیکن حالات کے دھارے کا رخ بدلنے سے معذور ہے اور اس طرح ان کا ردعمل مصنف اور قاری یا مصنف اور ڈرامے کے ناظرین کے رشتے کی درمیانی کڑی بن جاتا ہے اور ان کے توسط سے ڈرامے کے گوناگوں واقعات اور آفاقی تناظر میں دیکھے جا سکتے ہیں۔12

اور اس طرح اس پورے ڈرامے کے ذریعہ زاہدہ زیدی نے اس جنگ کی نہ صرف ہلاکت خیزیوں پر روشنی ڈالی ہے بلکہ عراق اور اس کی تباہی و بربادی ،صدام حسین کی حوصلہ مندی، بہادری اور اس جنگ سے پیدا

ہونے والے نقصانات ،انسانیت کے خون ہو جانے ،امریکہ کی ظلم و زیادتی دوسرے ممالک کا امریکہ کا مددگار ہونا اور اس اس پوری جنگ سے طاری ہونے والے خوف و دہشت کا پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

7۔ بہت دور تک رات ہوگی:

زاہدہ زیدی نے یہ ڈرامہ گجرات میں ہونے والے فسادات سے متاثر ہو کر لکھا تھا یہ ڈرامہ تیرہ مناظر پر مشتمل ہے جس میں گجرات اور گوندرا میں ہونے والے نہ صرف ہندو مسلم فسادات بلکہ انسانیت کے قتل و غارت کی حقیقی داستان ہے جس میں کچھ شرپسندوں نے اپنے سیاسی و مذہبی مفادات کی خاطر پوری انسانیت کو تباہ برباد کر کے رکھ دیا تھا گجرات میں ہونے والے اس فساد میں بے شمار معصوم لوگوں کی جانیں گئیں ہزاروں لوگ بے گھر ہوئے عورتوں کی عصمت دری کھلے عام کی گئی اور انہیں بے عزت و بے سہارا کر کے چھوڑ دیا گیا انہیں مظلوم عورتوں، گجرات کے شہیدوں اور بے خانماں بچوں کی داستان کو اس ڈرامے میں زاہدہ زیدی نے بے باکی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

ڈرامے کی شروعات اس طرح ہوتی ہے کہ فرشتے خدا کی حمد و ثنا میں مصروف ہیں شیطان انہیں ایک کونے میں کھڑا دیکھ رہا ہے اور ڈانٹ ڈپٹ کر رہا ہے کہ تمہیں اس کے علاوہ کوئی دوسرا کام نہیں لیکن فرشتے اس کی نہیں سنتے اور وہ اپنے خدا کی حمد و ثنا میں اسی طرح مصروف ہیں اتنے میں خدا کی جلوہ نمائی ہوتی ہے اور شیطان سے خدا سوال کرتا ہے کہ تم کو ہم نے دنیا میں شر فساد پھیلانے کی ایک طویل مدت دی تھی اور اس کام کو تم نے کیا بھی اور پھر تم واپس آ گئے لیکن اب دوبارہ کیوں جانا چاہتے ہو تو ابلیس خدا کو بتاتا ہے کہ تیری دنیا میں اب شرپسندی کی کمی نہیں وہاں مجھ سے بھی زیادہ شر پھیلانے والے لوگ موجود ہیں ان میں سے کیٹس ثانی تو ظلم اور بربریت میں اس سے بھی آگے ہیں اور اس کا ہمنوا ٹوڈی بلا دل و جان سے اس کے کام میں شریک ہے اور اب وہ زمین میں ایک نیا فساد برپا کرنے کا منصوبہ بھی بنا چکے ہیں جس کی کچھ ہی دنو میں شروعات ہونے والی ہے میں بس اس کو دیکھنے جانا چاہتا ہوں اور آپ کو بھی اس کی تو تاً فو قتاً اطلاع کرتا رہوں گا۔ شیطان ان شرپسند اور بربریت پھیلانے والوں کی تعریف اس طرح کرتا ہے؛

شیطان: سچ تو یہ کہ خدائے برتر کہ ان لوگوں کو بھی اب میری مدد اور رہنمائی کی ضرورت نہیں میں نے تو ہمیشہ فرداً فرداً

انسانوں کے ذہنوں میں داخل ہوکر انہیں گمراہ کیا ہے لیکن ان لیڈروں نے تو ایک بڑے گروہ بلکہ پوری نسل ہی کے ذہنوں کو زہر آلود کر دیا ہے اور اپنے دشمنوں کو دیکھتے ہی ان کی آنکھوں میں خون اتر آتا ہے۔13

یہ فساد دراصل بھگوا دھوتی (ہندو) والوں کی سازش ہے جو سبز (اسلام) کرتی والوں کو اس دنیا سے نیست ونابود کر دینا چاہتے ہیں اس لیے یہ سب سازش رچی گئی ہے ابلیس کے الفاظ؛

شیطان: اس لیے کہ انہیں اپنے بھگوا دھوتی والے ہونے پر فخر ہے اور جو کوئی بھی ان کی وضع قطع اختیار نہیں کرتا اور ان کے دیوی دیوتاؤ کی پوجا نہیں کرتا اس کو یہ اپنا دشمن سمجھتے ہیں۔ اس لیے اس وقت ان کے سب سے بڑے دشمن سبز کرتی والے ہیں کیوں کہ وہ خدائے واحد کی عبادت کرتے ہیں۔14

شیطان خود اس بات کی بھی اطلاع دیتا ہے کہ پروگرام کی ساری تیاریاں ہو چکی ہیں اور خاص خاص لیڈر اس موضوع پر تبادلہ خیال بھی کر رہے ہیں اسی لیے وہاں جانا چاہتا ہوں اور آپ کو بھی باخبر کروں گا جس پر خدا کی طرف سے جواب آتا ہے کہ ہم ان کے بارے میں ہر بات جانتے ہیں ہمیں پتہ ہے یہ ایک ایسا فساد اور بربریت ہوگی جہاں ظلم، ایذا رسائی، جنون اور نفرت کے لیے ریکارڈ پیش کئے جائیں گے لیکن ہم اپنے کچھ نمائندوں کو مظلوموں کی مدد کرنے بھیجیں گے اور شیطان کو دنیا میں دوبارہ جانے کی اجازت مل جاتی ہے اس شرط پر کہ وہ اپنی حدود میں رہے اور اس طرح پہلا منظر ختم ہو جاتا ہے۔

دوسرے منظر میں ایک بڑا کمرہ ہے جس میں تین بڑے بھگوا لیڈر راج رائے، رتھ بانی اور ٹوڈی بلاد بیٹھے ہیں اور اس فساد کے کچھ منصوبہ بنانے کی تیاری میں محو گفتگو ہیں مچھندر ٹوڈی راج رائے کو بتاتا ہے کہ سب تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں اور دیش کے کونے کونے سے بھگوا کرتی والے جوشیلے نوجوانوں کو بلایا جا چکا ہے اور انہیں قتل وغارت اور آتش زنی کی ٹریننگ بھی دی جا چکی ہے ان میں تلواریں اور ترشول بھی تقسیم کر دئے گئے ہیں پیٹرول بھی خفیہ جگہ رکھ دیا گیا ہے جس سے سبز کرتی والوں کی عبادت گاہوں کو ایک ایک کر کے آگ لگا دی جائے گی ساتھ ہی مدرسوں اور خانقاہوں کو بھی زد میں لینے کی پوری تیاری ہے۔

اور اس طرح یہ تینوں اس ہنگامے کے منصوبے اور تیاریوں کا پورا خاکہ بناتے ہیں اور اس مرحلے

سے پہلے جشن کی تیاری بھی کرنا چاہتے ہیں اور ان سب منصوبوں میں سوامی جی کی رضا بھی چاہتے ہیں جو مالا کے دانے گنتے ہوئے کہتے ہیں کہ تمہیں یہ کام شروع کردینا چاہئے اور پھر سب فخریہ انداز سے ہاتھ ملاتے ہیں۔

تیسرا منظر اس ہنگامے سے شروع ہوتا ہے جس کا منصوبہ ان سب نے بنایا تھا اور جواب پایہ تکمیل تک پہونچ رہا ہے جس ایک ٹرین میں مسافروں کو آگ لگادی جاتی ہے یہ منظر کچھ اس طرح ہے:

> ایک ریلوے پلیٹ فارم کا منظر لوگ ادھر ادھر جارہے ہیں خونچے والوں کی آوازیں۔شور ہنگامہ یکا یک ٹرین کی سیٹی سنائی دیتی ہے اور سب لوگ اپنی اپنی جگہ ساکت اور خاموش کھڑے ہو جاتے ہیں پس منظر میں ایک ٹرین کے رکنے کا دھندلا تاثر جس میں ایک جگہ آگ کے شعلے بھڑک رہے ہیں اسی جگہ سے پیلی دھوتی والے تین چار جوان کود کر باہر آتے ہیں اور نعرے لگانا شروع کرتے ہیں اور پھر چاروں طرف شعلے بھڑک رہے ہیں اسی جگہ سے پیلی دھوتی والے تین چار جوان کود کر باہر آتے ہیں اور نعرے لگانا شروع کرتے ہیں اور پھر چاروں طرف سے بہت سے بھگوا دھوتی اور منڈے ہوئے سر والے لوگ نمودار ہوتے ہیں ان کا اوپر کا دھڑ ننگا ہے لیکن ان میں سے کچھ لوگوں نے مالا وغیرہ پہن رکھی ہیں یہ لوگ بھی جوش سے نعرے لگانا شروع کرتے ہیں کچھ پولیس کے لوگ بھی آجاتے ہیں اور آگ لگی ہوئی جگہ پر پانی ڈالتے ہیں آگ کی شدت کم ہونے پر اسی جگہ سے مختلف جوگ جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل ہیں نکل کر بھاگتے ہیں اور بھگوا دھوتی والے لوگ اسی جگہ سے زخمیوں اور لاشوں کو نکالنا شروع کرتے ہیں اور انہیں پلیٹ فارم پر لٹانے جاتے ہیں اور بڑے جوش سے نعرے بھی لگا رہے ہیں اور انہوں نے زخمیوں اور لاشوں کے بیچ گھیرا سا بنا لیا ہے دوسری طرف سے سبز کرتی اور ٹوپی پہنے اور سفید پاجاموں میں ملبوس کچھ لوگ آتے ہیں اور جھک کر لاشوں کو دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں بھگوا دھوتی والے انہیں دھکا دے کے ہٹا دیتے ہیں اور بڑے جوش سے ستیاناش اور مردہ باد کے نعرے لگاتے ہیں۔15؎

ہر طرف لاشیں نظر آتی ہیں عورتوں اور بچوں کی چیخیں اور پھر لاشوں پر بھگوا چادر پڑی ہوئی نظر آتی ہے پولیس افسر بھی آجاتے ہیں لیکن یہ پورا الزام سبز کرتی والوں پر آتا ہے اور پولیس والے انہیں گرفتار کر کے لے جاتے ہیں۔

چوتھے منظر میں بھگوا لیڈر ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے ہوئے نظر آتے ہیں خاص کر سب ٹوڈی کو مبارک باد دیتے ہیں اور ٹوڈی تو خوشی سے یقین ہی نہیں لاتا کہ اتنا مشکل کام اتنی آسانی سے پایہ تکمیل کو پہنچ چکا

ہے بلکہ شاندار طریقے سے۔جس کی خبر وہ راج رائے اور رتھ بانی کو بھی دیتا ہے وہ بھی خوشیاں منانے میں چور ہیں۔دوسری طرف ریڈیو ٹیلی ویژن نے ہر طرف اس کی خبر آگ کی طرح پھیلا دی ہے اور سبز کرتی والوں کو اس سب کا ذمہ دار مانا جا رہا ہے ہر طرف سبز کرتی والے مردہ باد کے نعرے لگنا شروع ہو چکے ہیں جن میں بھگوا رنگ والے مارچ نکالنے میں آگے آگے نظر آتے ہیں اور جگہ جگہ ان کے خلاف لوگوں کو بھڑکانے کے لیے جلسے کئے جا رہے ہیں جس میں کبھی ٹوڈی تقریر کرتا ہے پھر باری باری سے چھوٹا بھگوا لیڈر، بڑا بھگوا لیڈر اور پھر رتھ بانی مائک پر آتے ہیں اور ٹوڈی سے ملتے جلتے اپنے خیالات کا اظہار کر رہے ہیں اور لوگوں کے غصہ کو اور بھڑکا رہے ہیں۔

پانچویں منظر میں یہ لوگ سبز کرتی والوں کے گھروں میں cross(x) کا نشان لگا رہے ہیں تا کہ ان سب کو تیل ڈال کر آگ کی نظر کر دیا جائے زاہدہ زیدی اس خوفناک منظر کو اس طرح بیان کرتی ہیں؛

> کچھ لوگ ان گھروں پر تیل چھڑک کر شعلوں سے آگ لگاتے ہیں اور سبز کرتے ٹوپی اور سفید پاجامے میں ملبوس کئی لوگ گھروں سے باہر نکلتے ہیں اور ادھر ادھر بھاگنے کی کوشش کرتے ہیں اور بھگوا دھوتی والے انہیں پکڑ کر مارتے ہیں اور تلواروں سے ان پر حملہ کرتے ہیں کئی لوگ زخمی ہو کر گرتے ہیں اور کچھ کے سر قلم کر دئے جاتے ہیں پولیس کی گاڑی آتی ہے اور سپاہی اتر کر تماشہ دیکھتے ہیں اور کچھ سپاہی ہنس بھی رہے ہیں اور پھر جو سبز کرتی والے بھاگ کر کہیں جانے کی کوشش کرتے ہیں پولیس کے سپاہی انہیں گولیوں کا نشانہ بناتے ہیں۔گلی میں ہلاک شدہ لوگوں کی لاشیں پڑی ہیں اور کچھ زخمی کراہ رہے ہیں اور ہر طرف خون بہتا ہوا دیکھا جا سکتا ہے۔16

چھٹے منظر میں صبح کا وقت ہے اذان ہو رہی ہے کچھ لوگ نماز پڑھنے آرہے ہیں اور نماز پڑھی جا رہی ہے اتنے میں کچھ بھگوا رنگ والے نعرہ لگاتے ہوئے آتے ہیں ان کے ہاتھ میں جلتی ہوئی مشعلیں ہیں اور کچھ ہی دیر میں وہ اپنے ساتھ لائے ہوئے پیٹرول کے ڈبوں سے تیل نکال کر مسجد پر ڈالتے ہیں اور آن کی آن میں اسے آگ کے حوالے کر دیتے ہیں اور اب ان کا اگلا نشانہ مدرسے میں جہاں سبز کرتی والے شاید چھپ گئے ہیں یہ لوگ انہیں بھی ہلاک کرنے کے لیے آگے بڑھتے ہیں۔

ساتویں منظر میں بھی یہی بھگوا لیڈر کچھ قبائلی لوگوں کے ساتھ داخل ہوتے ہیں ان سب کے ہاتھ میں پیٹرول کے ڈبے اور ترشول ہیں جنہیں سبز کرتی والوں کے گھروں میں آگ لگانے کا حکم دیا جاتا ہے تا کہ

سارے سبز کرتی والوں کا نام ونشان مٹا دیا جائے عورتوں اور بچوں کو تک نہ چھوڑا جائے سب کو آگ میں جھونک دیا جائے اور جب ایک قبائلی بھگوا لیڈر سے کہتا ہے کہ بچے تو بھگوان کا روپ ہوتے ہیں تو وہ کہتا ہے:

بھگوا لیڈر: نہیں سبز کرتی والوں کے بچے بھگوان کا روپ نہیں ہوتے ان کو مارنے میں کوئی حرج نہیں بلکہ یہ بہت ضروری ہے کیوں کہ یہ بڑے ہو کر یہی بچے ہمارے دھرم کا ستیاناس کریں گے اس لیے ان بچوں کو مارنا بہت ضروری ہے۔ 17

جب کہ اگلے یعنی آٹھویں منظر میں سبز کرتی والوں کی دکانوں اور بازارون کو لوٹ کر آگ لگانے کا منظر ہے یہی بھگوا رنگ والے پہلے تو دکان سے خوب سامان لوٹتے ہیں اور پھر انہیں آگ کے حوالے کرتے ہیں اور کچھ ہی دیر میں آگ کے شعلے لپکتے ہوئے دیکھے جا سکتے ہیں۔

اگلے منظر میں ایک سبز کرتی والے کے گھر لوٹ مار اور آگ لگانے کا منظر ہے پہلے تو یہ بھگوا رنگ والے نعرے لگاتے ہوئے اس گھر میں داخل ہوتے ہیں ہاتھ میں پیٹرول کے ڈبے اور ترشول بھی ہیں گھر کو مالک کے سامنے لوٹتے ہیں اور پھر اسے آگ لگا دیتے ہیں جب گھر کا مالک پولیس کو فون کرتا ہے تو پولیس والے اس سبز کرتی والے افسر کا نمبر دیکھ کر بڑی بے شرمی سے فون کاٹ دیتے ہیں۔ اس منظر میں زاہدہ زیدی نے پولس والوں کی بے شرمی، بے حیائی اور بھگوا دھوتی والوں کی سازش میں ان کی حصہ داری کو دکھایا ہے۔

دسویں منظر میں فساد کے بعد کا منظر پیش کیا گیا ہے ایک کھلی ہوئی جگہ میں کچھ مرد عورتیں اور بچے جمع ہیں سردی کا مہینہ ہے لیکن ان کے جسم پر کپڑے کے صرف ٹکڑے دکھائی دیتے ہیں وہاں تھوڑی سی آگ جلا رکھی ہے جس ارد گرد لوگ بیٹھے ہیں اسی درمیان وہاں تین رازداران داخل ہوتے ہیں جو ان مظلوموں کی مدد کرنا چاہتے ہیں لیکن پولیس کے سپاہی انہیں اندر جانے سے روک دیتے ہیں کیوں کہ رازداران کی مدد کرنا چاہتے ہیں اور ان پر بیتے ہوئے ظلم وستم کو دنیا کے سامنے لانا چاہتے ہیں وہ بھوکے بچوں کو روتے بلکتے دیکھتے ہیں۔ اس کیمپ کی ایک عورت ان رازداران کو بتاتی ہے:

ایک ادھیڑ عمر عورت: میں بتاتی ہوں بیٹی یہ بچے کیوں رو رہے ہیں یہ سب بہت بھوکے ہیں اور دودھ پیتے بچے اس

لیے روتے ہیں کہ ان کی ماؤں کی بھوکی ہیں اور انہیں دودھ نہیں پلا سکتیں۔

ایک ریفیوجی مرد: ہم لوگوں کو صرف ایک وقت کا کھانا ملتا ہے اور وہ بھی کھانے کے قابل نہیں ہوتا اس لیے بہت سے لوگ بیمار ہو گئے ہیں۔18

پھر اس کے بعد وہ تینوں اندر داخل ہو کر مصیبت زدوں کا حال پوچھتے ہیں ہر ایک اپنا غم بتاتا ہے ان میں سے کچھ کا حال نقل کیا جاتا ہے جب ایک پاسبان روتے ہوئے بچے کو دیکھ کر ایک عورت سے اس کے بارے میں پوچھتا ہے۔

ایک پاسبان: (ادھیڑ عورت سے) یہ بچہ کون ہے تمہارا پوتا یا نواسا ہے۔

ادھیڑ عمر عورت: نہیں جناب یہ ایک یتیم اور بے سہارا بچہ ہے جس کے ماں باپ اور بھائی بہن سب کو بھگوا غنڈوں نے گھر میں گھس کر قتل دیا

یہ بچہ شاید کسی کونے میں چھپ گیا ہوگا یا کسی پلنگ کے نیچے چھپا ہوگا اس لیے یہ بچ گیا اب یہ بے چارہ مجھ سے ہی لپٹ گیا ہے رات کو میں اپنی چھاتی سے لگا کر اور چادر سے ڈھک کر سلا دیتی ہوں دن میں بھی یہ اور بچوں کی طرح نہیں کھیلتا۔ میرے پاس ہی بیٹھا رہتا ہے۔19

اس طرح کے کئی اور مصیبت زدہ اپنی اپنی داستان سناتے ہیں جوان مظلوموں کی مدد کرنے کا وعدہ اور دلاسا دیتے ہیں اور پھر ان میں سے ایک نوجوان ان مظلوموں کا حال کچھ اس طرح بیان کرتا ہے۔

نوجوان لڑکا: جن لوگوں کو ان وحشیانہ مظالم کا شکار بنایا گیا کیا وہ معصوم نہیں تھے کیا وہ بچے معصوم نہیں تھے جنہیں آگ میں جلا دیا گیا۔ کیا وہ کم عمر لڑکیاں معصوم نہیں تھیں جنہیں ان شیطانوں نے اپنی ہوس کا نشانہ بنایا۔ کیا وہ گھریلو عورتیں معصوم نہیں تھیں جن کی عصمت دری کی گئی۔ کیا وہ بڈھے لوگ معصوم نہیں تھے جن کے سامنے ان کے بچوں کو ہلاک کیا گیا۔20

پھر گیارہواں منظر شروع ہوتا ہے اس منظر میں راج رائے، بھگت، رتھ بانی اور ٹوڈی کی خوشیوں کا جشن دکھایا گیا ہے جو وہ اس سازش کو انجام دینے کے بعد منا رہے ہیں اس کا سب سے زیادہ credit ٹوڈی کی کوششوں کو جاتا ہے اور اس کے گلے میں گیندوں کے پھولوں کا ہار پڑا ہوا ہے ٹوڈی کہتا ہے:

ٹوڈی: جی ہاں رتھ بانی جی آپ کے کھرے اورمہان وچاروں کے انوسار ہم نے اپنے پرانت میں سبز کرتی والوں کا قلع قمع کر دیا ہے ان کے گھر اب راکھ کا ڈھیڑ ہیں۔ان کی دکانیں لوٹ کر جلا دی گئی ہیں اور ان کے سب کاروبار چوپٹ ہو چکے ہیں۔ان کی فیکٹریاں اور ورک شوپس کو اس طرح جلایا ہے کہ ان میں کام کرنے والا بھی کوئی بچ کر نہ نکل سکے۔اور ایک بسکٹ فیکٹری میں تو پورے تیس لوگ اندر ہی جل کر مر گئے۔21؎

اسی طرح ایک ایک کر کے ٹوڈی اپنے سارے منصوبے سے آگاہ کرتا ہے اور اب میڈیا اور پولس افسران کا سہارا لے کر رازداروں کو ریفیو جیوں سے ملنے،ان کی بات سننے اور ان کی مدد کرنے سے روکنے کے منصوبے بناتا ہے کہ کسی طرح ان لوگون کو جانے سے روک دیا جائے تاکہ سچائی لوگوں کے سامنے نہ آنے پائے۔

بارہویں منظر میں دکھایا گیا ہے کہ وہ حصہ جہاں اقلیتی فرقے تھے وہاں کا منظر اب اجاڑ ہے اب اس علاقے میں الیکشن ہونے والے ہیں اور اب ٹوڈی اور اس کی پارٹی کے یہاں سے جیتنے کے امکان ہیں کیوں کہ وہاں اب کسی سبز کرتی والے کا گھر نہیں۔

دوسری طرف وہ رازدان ہیں جو آپس میں محو گفتگو ہیں اور اس پوری صورت حال کا جائزہ لے رہے ہیں ان کی ساری ہمدردی ریفیو جی کیمپ کے لوگوں کے ساتھ ہے ان کا خیال ہے کہ اکثریتی فرقے کے بھی کچھ لوگوں کو اقلیتی فرقے کا خیال ہے وہ ان کی مدد بھی کر رہے ہیں بہت سو نے انہیں پناہ بھی دی ہے۔لیکن ابھی تک ان ریفیو جی کیمپ والوں کے لیے کچھ خاص نہیں کیا گیا ہے۔نوجوانوں کے لیے اگر چہ کچھ نہیں لیکن یتیم بچوں کے لیے اقلیتی فرقے کے لوگوں نے راجدھانی میں اور کئی دوسرے شہروں میں ایسے سینٹر قائم کئے ہیں جہاں ان بچوں کی رہائش کا مناسب انتظام اور تعلیم کا بھی انتظام کیا جا رہا ہے۔

ساتھ ہی وہ تینوں رازدان اس حادثے کا بھی پتہ لگا لیتے ہیں کہ آگ ٹوڈی نے ہی لگوائی تھی تا کہ وہ اپنے نسل کشی کے پروگرام کو عملی جامہ پہنا سکے۔اور اب نئے منتری کی انکوائری بھی چل رہی ہے۔ان تینوں کو یہ سب ڈرامہ لگتا ہے جسے لکھنے کا وہ لوگ منصوبہ بناتے ہیں۔

تیرہواں اور آخری منظر اسی طرح کا ہے جس طرح پہلا منظر تھا فرشتے خدا کی حمد وثنا میں مصروف نظر آتے ہین شیطان داخل ہوتا ہے وہ پھر فرشتوں کو دیکھ کر کہتا ہے کہ تمہیں خدا کی حمد وثنا سے کچھ فرصت نہیں کچھ خبر

ہے کہ زمین اب وہ زمین نہیں رہی جس کی تعریف کے قصیدوں میں شاروں اور مصوروں نے اپنے فن کی جولانیاں دکھائی تھیں تم کبھی اس پرسکون آسمان سے نیچے بھی دیکھواب وہاں نہ تنظیم ہے اور نہ تخلیق کی کارفرمائی ہر طرف زمین میں بربریت اور قتل و غارت گری برپا ہے اور یہ اس کی دلیل ہے کہ میں اپنے فلسفہ حیات میں کامیاب ہو چکا ہوں۔

اتنے میں خدا کی آواز آتی ہے کہ شیطان تم فرشتوں سے بحث نہ کرو وہ جو بھی کر رہے ہیں وہ اپنی جگہ ٹھیک ہے تم اس بات کو نہیں سمجھ پاؤ گے بلکہ تم یہ بتاؤ کہ اس قدر دیر سے کیوں آئے اور دوسری بات ہم نے تمہیں اپنی حدود میں رہنے کے لیے کہا تھا لیکن تم نے قتل و غارت گری میں ساری حدیں پار کر دیں تو شیطان اس کا جواب دیتا ہے

شیطان: خدائے بزرگ و برتر۔قتل و غارت کے اس ڈرامے میں میری حیثیت تو سرف ایک تماشائی کی تھی یہ سچ ہے کہ میں اس خونی ڈرامے کے مناظر میں بالکل محو ہو گیا تھا اور اس کے مرکزی کرداروں کی بیداغ پلاننگ اور تخریبی ذہانت نے مجھے مسحور کر دیا تھا لیکن خدائے برتر میں اگر کوشش کرتا بھی تو اس کو کوئی سمت نہیں دے سکتا تھا کیوں کہ اب وہ مجھ سے کہیں آگے نکل چکے ہیں۔22؎

اس طرح شیطان ان ظلم کرنے والوں پر طنز کرتا ہے لیکن خدا کہتا ہے ہم نے کچھ نمائندے زمین میں رکھیں ہیں جو ان مظلوموں کی مدد اور سہارا بنیں گے اور پھر ہم خود ان مکاروں کے سردار کیٹس کو بھی شیطان سے برتر اور اس کا سردار کہتا ہے۔

خدا کی آواز: تمہاری شناخت اب بدل چکی ہے ظلم اور بدی کی قوتوں کا شہنشاہ اب کیٹس ثانی ہے جو دنیا کا سب سے بڑا دہشت گرد ہے اور اس کے سر کے لیے یہ تاج بہت چھوٹا ہے۔اور اب تم اس کے ایک ادنیٰ غلام ہو اس لیے تمہارے سر پر یہ تاج زیب نہیں دیتا۔ہم تمہیں دنیا میں جانے کی اجازت دیتے ہیں۔تم ایک دم چھلے کی حیثیت سے کیٹس ثانی کی تخریبی سرگرمیوں میں شرکت کر سکتے ہو۔23؎

اور پھر شیطان خدا سے پوچھتا ہے کہ تو ان ظالموں کو نیست و نابود کر دے گا تو خدا کہتا ہے کہ ابھی

وقت لگے گا ابھی تو ظلمتوں کا اندھیرا پڑھ رہا ہے اور ابھی بہت دور تک رات ہوگی۔ لیکن یہ بات بھی سچ ہے کہ یہ ظلمت بدی کی قوتیں مطلق العنان نہیں بلکہ ان سے بھی بڑی ایک طاقت ہے جس کے ماتحت یہ پوری کائنات ہے اور بہت جلد نہ صحیح تو ایک دن ان بدی کی قوتوں کا خاتمہ ہوجائے گا لیکن اس کے لیے دنیا کو انتظار کرنا پڑے گا اور خوش آئندہ تبدیلی میں بھی وقت درکار ہے۔ جس کے لیے انسانوں کو جدوجہد کرنی پڑے گی۔

زاہدہ زیدی کا یہ پورا ڈرامہ علامتی اور استعاروتی انداز میں پایہ تکمیل کو پہنچ جاتا ہے اور وہ اس خونی ڈرامے کو پیش کرنے میں کامیاب ہوجاتی ہیں جس میں انسانیت کے قتل وغارت گری، ظلم اور بربریت کی ساری حدیں پار ہو چکی تھیں اور جس نے ساری انسانیت کو ہلاک کر کے رکھ دیا تھا۔ اور جسے زاہدہ زیدی نے خدا کی پرامید کرن کے ساتھ ختم کردیا ہے جب کہ انسانیت کا قتل کرنے والوں کا اس دنیا سے خاتمہ ہوجائے گا۔

کیوں کر اس بت سے رکھوں جان عزیز:

یہ زاہدہ زیدی کا ایک طویل ڈرامہ ہے جسے انہوں نے ادبی دنیا میں چلنے والی سیاسی سازشوں کے تناظر میں لکھا تھا۔ ادب، کلچر، آرٹ اور فنون لطیفہ کو معاشرے کی اصلاح کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے لیکن زاہدہ زیدی نے اس ڈرامے کے ذریعہ یہ دکھایا ہے کہ اس فنون لطیفہ کے میدان میں سیاسی رقابتیں، خودغرضی اور لالچ نے لی ہے۔

ڈرامہ کچھ اس طرح شروع ہوتا ہے کہ شہر میں ایک ادبی جلسہ منعقد ہونے والا ہے جس میں اردو ادب کے مایہ ناز اور ادبی دنیا پر اپنی علمیت کا سکہ جمانے والے مشہور نقاد جناب بحر العلوم اور ان کے محبوب ترین شاعر شاعر اعظم تشریف لا رہے ہیں جہاں بحر العلوم اپنی بصیرت کے ذریعہ علم و ادب کے سمندر روا کریں گے اور شاعر اعظم اپنے دلچسپ کلام سے لوگوں کی تفریح کا باعث بنیں گے۔ جلسہ میں لوگ بحر العلوم کا بڑی بے صبری سے انتظار کررہے ہیں۔ کیوں کہ سب کو بحر العلوم سے بہت گہری وابستگی ہے اور ان کے لیے بہتر سے بہتر انتظام کرنا ان کی خوش نصیبی بھی ہے۔ ایک نوجوان بحر العلوم کے ارد گرد رہنے کی فکر میں دکھائی دیتا ہے تاکہ ان نئی نسل کے نوجوانوں کی تخلیقات کے متعلق بھی بحر العلوم چند باتیں فرما دیں تو ان کی شہرت میں بھی چار چاند لگ جائیں گے ۔آخر کار بحر العلوم کے آنے کا وقت ہوجاتا ہے ان کے ساتھ ناظم جلسہ، صدر جلسہ اور شاعر اعظم ہیں بحر العلوم کا گلدستوں سے استقبال ہوتا ہے اور اس کے بعد ناظم صاحب جلسے کی شروعات کرتے ہیں۔

اور پھیر بحرالعلوم کی تعریف وتوصیف میں ہر ایک قصیدے پڑھنا شروع کرتا ہے پہلے ناظم صاحب پھر صدر جلسہ اور ڈاکٹر ادارہ تہذیب وتمدن وغیرہ ناظم جلسہ کچھ اس طرح اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں

جناب صدر اور حضرت بحرالعلوم کی اجازت سے اب جلسے یعنی جشن بحرالعلوم کی کاروائی شروع ہوتی ہے۔جناب بحرالعلوم، شمس العلماء حضرت بقراط ثانی کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔وہ ایک عظیم انسان ہیں۔ایک عظیم مفکر ودانش وراور ایک نہت بڑے اسکالر ہیں اوران کی شہرت چہار وانگ عالم میں پھیل چکی ہے۔سب باشعور لوگ ان کی تحریروں سے روچنی اور بصیرت حاصل کرتے ہیں اور شیر خوار بچوں سے لے کر بزرگ حضرات تک سبھی ان کی تقریریں سن کر جھوم جاتے ہیں۔لیکن خاص طور سے نوجوان ان سے اس قدر متاثر ہوئے ہیں کہ وہ پڑھنا لکھنا بھول کر ہر وقت ان کی گراں قدر کتابیں بغل میں دبائے گھومتے ہیں۔اوران کی شان میں منظوم اور نثری قصیدے لکھ کر اپنی ادبی اہمیت کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔لیکن ساتھ ہی یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ بزرگ حضرات بھی بحرالعلوم کی مدح سارئی میں اپنے علم ودانش کا نچوڑ پیش کرتے ہیں۔اوراکثر منظوم خراج عقیدت پیش کرنے میں نوجوانوں سے بھی آگے نکل جاتے ہیں۔حضرات آپ جانتے ہیں کہ جناب بحرالعلوم ہرفن مولا ہیں۔وہ ایک بہترین افسانہ نگار اور شاعری کے میدان میں بھی انہوں نے ایسے گنج ہائے گراں مایہ پیش کیے ہیں جن کی تعریف ممکن نہیں لیکن ان سب سے بڑھ کر وہ ایک دانش وراور نقاد ہیں۔اور ہماری زبان بلکہ ملک کی کسی بھی زبان میں ان کے قدوقامت کا نقاد اس سے پہلے کبھی پیدا نہیں ہوااور نہ آئندہ پیدا ہوسکتا ہے۔اور میں تو جب دوسرے ملک کی تاریخ پر بھی نظر ڈالتا ہوں تو مجھے اس قدر بلند قامت کوئی نقاد نظر نہیں آتا۔ارسطو۔کروچے، کولرج، آرنلڈ، ایلیٹ، ایزا پاؤنڈ، سارتر، رچرڈ، لیوس اور تھروپ فرائی سب ان کے سامنے پانی بھرتے ہیں۔اور دور حاضر کے اہم مفکر اور نظریہ ساز یعنی سوسیر، رولاں بارت، جیکب باختن اور دریدا سبھی ان کی تحریروں سے متاثر ہوئے ہیں اوانہیں اپنا استاد مانتے ہیں۔24ؔ

جبکہ بزم ادب کا صدر کہتا ہے خود خدا بھی ان کی تعریف کرے تو مکمل ایک صحیفہ کی صورت اختیار کرلے میری کیا بساط کہ میں ان تعریف میں کچھ رقم کرسکوں میں تو ایک ادنیٰ سا ذرہ ہوں جس پر بحرالعلوم کی نظر عنایت ہوئی ہے۔ان کے علم کی وسعت اور خیالات کی پرواز لامحدود ہے۔

جب کہ انجمن ترقی پسند کا سیکرٹری کے خیالات کچھ اور ہی ہیں وہ بحرالعلوم کی تعریف ضرور کرتے ہیں

لیکن ان کا خیال ہے کہ جس طرح بحرالعلوم نے شاعر اعظم پر نظر عنایت کی ہے اوران کا تذکرہ اپنی تصانیفات میں کیا ہے اسی طرح اور لوگ بھی ہیں جو بہترین افسانے، ڈرامے اور شاعری تخلیق کر رہے ہیں انہیں بھی آپ توجہ فرمائیں تاکہ ان میں بھی تحریر وتقریر کا ذوق پیدا ہو اور انہیں آگے بڑھنے کے مواقع فراہم ہوں اسی طرح اس مجمع سے ایک خاتون اٹھتی ہے جو اپنی بات کہنے کی اجازت مانگتی ہے اور پھر بحرالعلوم کے اشارہ پر وہ اپنی بات پیش کرتی ہے:

> جناب بحرالعلوم صاحب، صدر محترم، خواتین وحضرات، میں نے اس جلسے کی سب تقریروں کو غور سے سنا میں خود بحرلاعلوم سے بہت متاثر ہوئی۔ وہ ایک عالم فاضل انسان ہیں ان کے کارنامے غیر معمولی ہیں ان کا مطالعہ وسیع اور نظر گہری ہے انہوں نے پرانی باتوں کو مسترد کر کے اکچھ نئے اصول بنائے ہیں پرانے بت گرائے ہیں اور نئے بتوں کو ادب کے مندر میں سجایا ہے انہوں نے اپنے پسندیدہ شاعروں اور افسانہ نگاروں کی فہرستیں مرتب کیں۔ جنہیں انہوں نے اس دور کے اہم ترین مصنف وشاعر قرار دیا ہے۔ وہ سب تو مجھے متاثر نہ کر سکے کیوں کہ ان میں کچھ تو صرف تک بند ہیں اور کچھ چیستاں قسم کے شاعر اور افسانہ نگار ہیں۔ پھر بھی کیوں کہ انہیں بحرالعلوم نے پسند کیا ہے اس لیے ان میں کچھ نہ کچھ بات تو ضرور ہوگی اور میں اس بات پر غور کروں گی۔ لیکن اس وقت میں جناب بحرالعلوم سے سرف ایک سیدھا سادا سوال کروں گی کہ آپ کی ان فہرستوں میں کسی عورت کا نام کیوں نہیں۔ ہمارے ملک میں کچھ چوٹی کی افسانہ نگار اور ناول نگار موجود ہیں اور یہ بات تو سبھی جانتے ہیں اسی لیے میں یہاں صرف خواتین شعرا کی بات کروں گی۔ اس وقت ہمارے یہاں کچھ صف اول کی شاعرات بھی موجود ہیں جن کے کلام میں غیر معمولی حسن اور باثر انگیزی ہے۔ ان کی فکر میں گہرائی، جذبے میں خلوص اور وذن میں وسعت ہیانہوں نے اپنی داخلی دنیا کے اسرار رموز کو بھی شعر میں ڈھالا ہے اور خارجی دنیا کے تیکھے خدوخال بھی ان کی شاعری میں جھلکتے ہیں کیوں کہ ان کی شاعری بنیادی طور پر انسان کے مقدر سے گہری وابستگی کا ثمر ہے ان کی شاعری میں حسن وعشق کی سرمستیاں بھی ہیں گہری بصیرتیں بھی اور فن کا نکھرا ہوا شعور بھی۔ غرض کہ انہیں ہر اعتبار سے صف اول کا شاعر قرار دیا جا سکتا ہے تو پھر آپ کی فہرست میں ان کا نام اور آپ کے مضامین میں ان کا تذکرہ کیوں نہیں مجھے یہی کہنا تھا۔25؎

خاتون کی بات کا بحرالعلوم کی طرف سے ناظم جلسہ جواب دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر خواتین کی شاعری میں فکر کی گہرائی، جذبے کی شدت، حسن وعشق کی سرمستیاں، گہری بصیرت اور ہمہ گیر وژن ہونا چاہیے

بلکہ عورتوں کو عورتوں کی طرح شاعری کرنا چاہئے ان کی شاعری میں چوڑی، مہندی، اوڑھنی، جھومر، جھمکے کا ذکر ہوتا کہ جب، مرد اس کو پڑھے یا سنے تو ان میں مرد ہونے کا احساس اور زبان کا چٹخارہ محسوس ہو۔ بحر العلوم کو عورتوں سے نفرت نہیں۔ بہرحال آخر میں بحر العلوم بقراط ثانی کھڑے ہوتے ہیں اور اب تک جن لوگوں نے بھی ان کی تعریف میں تقریر کی تھیں ان سب کا شکریہ ادا کرتے ہیں لیکن کچھ دیر بولنے کے بعد اچانک بحر العلوم جامد ہوتے چلے جاتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک سنگ مرمر کے مجسمے میں تبدیل ہو جاتے ہیں لوگوں کی نظروں کے سامنے پردہ ڈال دیا جاتا ہے اور ڈاکٹر کا معائنہ کرنے کے لیے بلایا جاتا ہے ڈاکٹر صاف طور پر بتا دیتا ہے کہ بحر العلوم اب مجسمے میں تبدیل ہو چکے ہیں لیکن ناظم اور صدر جلسہ لوگوں سے اس بات کو چھپا دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس وقت بحر العلوم کی طبیعت کا ناساز ہے اس لیے جلسہ ملتوی کیا جاتا ہے۔

بحر العلوم کے مجسمے میں تبدیل ہونے کے بعد ناظم اور صدر جلسہ کا نیا روپ سامنے آتا ہے۔ پہلے تو وہ بحر العلوم کے مجسمے کو رکھنے کے لیے ایک میوزیم بناتے ہیں اور لوگوں سے یہ کہتے ہیں کہ یہ مجسمہ ایک بیرون ملک کے سنگ تراش نے بنایا ہے جو بحر العلوم سے بے حد محبت کرتا ہے چونکہ لوگ بحر العلوم کی غیر موجودگی پر سوال کریں گے اس لیے انہوں نے لوگوں کو بتایا کہ بحر العلوم علاج کے سلسلے میں دوسرے ملک گئے ہیں پھر مختلف ملک کی سیر کریں اور کچھ ادبی پروگرام میں حصہ لیں گے اس وقت گزر جائے گا اور لوگ بحر العلوم کو رفتہ رفتہ فراموش کر دیں۔ دوسرے شاعر اعظم کی حالت بھی غیر ہو چکی تھی مے نوشی دن رات جاری کر دی تھی اور ان کے غم میں بالکل خستہ حال ہو چکے تھے۔ تو ناظم صاحب نے یہ منصوبہ بنایا کہ شاعر اعظم کو ان کے گاؤں بھیج دیا جائے اور کسی کو اس بارے میں کوئی خبر نہ دی جائے۔ ناظم کے اس کام میں ایک نوجوان مدد کرتا ہے جو ڈرامے کے شروع میں بحر العلوم کے قریب آنے کی کوشش کر رہا تھا تاکہ وہ خود شاعر اعظم بنے اور ناظم کے بحر العلوم بقراط ثانی بننے کے خواب دیکھ رہا ہے اس طرح دونوں منصوبے بناتے ہیں اور پھر ایک دن شاعر اعظم کو گاؤں بھیج دیا جاتا ہے اور بحر العلوم کے مجسمے کو میوزیم میں رکھ دیا جاتا ہے۔

لیکن انجمن کا سکریٹری ان سب باتوں کی تہ تک جانے کی کوشش میں لگا ہے اس کا ساتھ دینے کے لیے وہ خاتون جس نے خاتون کی تخلیقات کی حمایت میں بحر العلوم کے سامنے درخواست کی تھی اس کا نام فہمیدہ

تھا اس کے ساتھ دوسری عورت فرزانہ بھی شامل تھی جو بحر العلوم کی زندگی اوران کی ادبی خدمات پر پی۔ایچ۔ڈی کرتی ہے۔ یہ سب اس معاملے کو واکرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ایک دن لائبریری سے ساری چیزیں چوری ہوجاتی ہیں اور بحر العلوم کی ساری کتابیں بھی غائب تھیں لیکن اس چوری میں سب سے اہم بات یہ تھی کہ بحر العلوم کا مجسمہ چوروں نے چور چور کردیا تھا۔ یہ ساری چوری ناظم جلسہ اوراس نوجوان کی سازش سے ہوتی ہے جو پوری طرح سے بحر العلوم کی شخصیت کولوگوں کے ذہن ودماغ سے اوجھل کردینا چاہتے ہیں تاکہ وہ لوگ خود بحر العلوم اور شاعر اعظم کی جگہ لے سکیں۔ یہ سارا معاملہ انجام پانے کے بعد ایک دن شہر کے اندر نقارہ بجتا ہے اور لوگوں کواطلاع دی جاتی ہے کہ بحر العلوم بقراط ثانی اور شاعر اعظم ثانی کا شہر کے ٹاؤن ہال میں ایک جلسہ منعقد کیا جارہا ہے جس میں ان کوخراج عقیدت پیش کیا جائے گی۔ جس کا صاف اشارہ تھا کہ ناظم جلسہ اور نوجوان اپنی سازشوں اور مکاریوں میں پوری طرح کامیاب ہوچکے ہیں۔ اوریہیں یہ ڈرامہ ختم ہوجاتا ہے۔

اس ڈرامے میں زاہدہ زیدی نے ادبی دنیا میں سیاسی مکاریوں اور سازشوں کا پردہ فاش کیا ہے کہ کس طرح آج عصری ادب میں کلچر کے بحران کے زوال اور دولت کی بالادستی، خودغرضی اور میڈیا کی یلغار بھی دیکھنے کو ملتی ہے حالانکہ فنون لطیفہ کا میدان سب باتوں سے دور تھا اور وہاں صداقت اور اقدار کو ہمیشہ اہمیت دی جاتی تھی لیکن آج کے عصری ادب پر اگر ہم نظر ڈالیں تو یہاں بھی ہمیں ہر جگہ گروپ بندی، خوشامد، کرپشن اور سطحی علمیت کی نمائش نظر آئے گی۔ زاہدی اس ڈرامے کے مقدمے میں لکھتی ہیں۔:

> آج جب ہم ادب، شاعری اور کلچر پر نظر ڈالتے ہیں تو وہاں بھی کرپشن، زبردستی، گروپ بندی، کردارکشی، خوشامد پرستی سطحی علمیت کی نمائش زبان کی بے حرمتی الفاظ کے ناجائز استعمال، کلیشے کی بالادستی، مستعار تصورات کے جارحانہ استعمال اور بے بصر فارمولوں کی یلغار کے ایسے مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں کہ ناامیدی کے گہرے بادل تخلیق کے روشن فلک پر چھائے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔26؎

دوسری بات جو اس ڈرامے میں اہم ہے وہ عورتوں کی تخلیقات سے متعلق ہے جس وقت یہ ڈرامہ لکھا گیا اس وقت عورتوں کی تخلیقات اوران کی شاعری کو زیادہ اہمیت نہیں تھی حالانکہ اس وقت بھی بہت سی اہم شاعرات موجود تھیں لیکن مرد ادیبوں کے نزدیک ان کی ایسی اہمیت نہیں تھی جیسا کہ مردوں کا مقام تھا جس کا

زاہدہ زیدی نے اس ڈرامے میں اظہار کیا۔

فنی نقطہ نظر سے یہ ڈرامہ حقیقت وعلامت نگاری کا امتزاج ہے زاہدہ زیدی نے اس ڈرامے میں بھی ابسرڈ ڈرامے کی کچھ خصوصیات کا استعمال کیا ہے سنجیدہ اور مضحکہ خیز دونوں طرح کے عوامل کی شمولیت ہے زبان بھی علمی و ادبی گروہ کی نمائندگی کرتی ہے کیوں کہ یہ ڈرامہ ادبی مجلس اور زاہدہ زیدی کے اردگرد کے تعلیم یافتہ ماحول کو پیش کرتا ہے جس سے وہ شعوری ولاشعوری طور پر متاثر تھیں اور جس کا وہ مشاہدہ کر رہی تھیں جو ادب اور کلچر کی دنیا میں ہر طرف جاری وساری ہو چکا تھا اسی کو انہوں نے اس ڈرامے میں پیش کیا ہے ایک جگہ وہ لکھتی ہیں فہمیدہ و فرزانہ کی زبانی:

> فرزانہ: میرے خیال میں ادب میں اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی عام بت پرستی کی دو صورتیں نظر آتی ہیں اول تو یہ کہ یہ سادہ لوح اور محدود ذہن رکھنے والے لوگ عام طور پر کسی نہ کسی کی پرستش کا رجحان رکھتے ہیں کوئی ایسی ہستی جس کے سائے میں وہ خود کو زیادہ محفوظ محسوس کر سکیں۔ اور کسی خاص شخص کی بڑھتی ہوئی شہرت اور اہمیت ان کے پرستش کے ولولے کو ہوا دیتی ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کچھ لوگ جو حد سے زیادہ شاطر ہیں کسی اہم اور بارسوخ شخص کی مدح سرائی اور قصیدہ خوانی کو آخری حد تک پہنچا کر بظاہر اسے معبود کا درجہ دیتے ہیں لیکن درپردہ اسے ذاتی مفاد کے لیے استعمال کرتے ہیں اور اس کی مدد سے ایک نمایاں مقام حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور جب ان کا مقصد حاصل ہو جاتا ہے تو وہ خود ہی اس بت کو گرا کر اس کی جگہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔
>
> فہمیدہ: جیسا کہ آپ خود دیکھ رہے ہیں۔ کہ اب ناظم بحرالعلوم بننے کے خواب دیکھ رہا ہے اور وہ نوجوان جو شاعر اعظم کو ایک سال سے گھیرے ہوئے تھا اب انہیں برباد کرنے کے بعد خود کو شاعر اعظم کہنے لگا ہے۔ 27

فہمیدہ اور فرزانہ کی اس گفتگو کے ذریعہ زاہدہ زیدی نے ادب اور زندگی کے شعبوں میں ہونے والی بت پرستی، مکاری، سیاسی سازشوں اور خود غرضی کے ان مسائل کی طرف اشارہ کیا ہے جو وہ اپنے آس پاس کے ماحول میں دیکھ رہی تھیں۔

ناول کا فن:

ناول نگار خواتین۔

اردو ناول نگاری کی ابتدا سے ہی مرد حضرات کے ساتھ ساتھ خواتین ناول نگاروں نے بھی اس میدان میں اپنے قلم کے جوہر دکھانے شروع کیے اور چند اہم موضوعات کو اپنے ناول کا حصہ بنایا جن میں بیشتر سماج کی ضرورت و اصلاح کی غرض سے لکھے گئے تھے جہاں ہمیں حقیقی زندگی اور حقیقی معاشرے کی تصویریں صاف نظر آتی ہیں۔انہوں نے زندگی کے ہر مسائل پر سنجیدگی سے لکھا اور اس میں کامیابی بھی حاصل کی۔ابتدائی دور کی خواتین کے یہاں اگر چہ ہمیں نذیر احمد اور راشد الخیری کے اثرات دیکھنے کو ملتے ہیں بلکہ بیشتر خواتین نے ان دونوں ناول نگاروں کی تقلید میں ناول لکھے کیوں کہ نذیر احمد نے جب ناول لکھنے کا آغاز کیا اور اپنا پہلا ناول لکھا تو وہ لڑکیوں کی فلاح و بہبود اور ان کی تعلیم و تربیت کے متعلق ہی لکھا تھا اور اس کے بعد ان کی بے شمار تخلیقات لڑکیوں کی تعلیم اور ان کی خانگی زندگی کے متعلق ہی ہیں۔ان خواتین نے معاشرہ میں پھیلی عورتوں کی بدترین حالت پر غور کر کے انہیں اپنی تخلیقات میں پیش کیا اور اپنی کوششوں سے عورتوں کو معاشرہ میں عزت و وقار کا مقام دلانے کی پوری کوشش کی۔جن میں اکبری بیگم،صغرا ہمایوں،عباسی بیگم،نذر سجاد اور طیبہ بیگم خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

اس کے بعد ترقی پسند تحریک کے زیر اثر اور پھر تقسیم ہند کے دوران ہمیں بے شمار ناول نگار خواتین مل جاتی ہیں۔جن میں عصمت چغتائی،صالحہ عابد حسین،بانو قدسیہ،قرۃ العین حیدر،خدیجہ مستور،ہاجرہ مسرور،جمیلہ ہاشمی، جیلانی بانو،رضیہ فصیح،فہمیدہ ریاض،ترنم ریاض،واجدہ تبسم،مسرور جہاں،ساجدہ زیدی اور زاہدہ زیدی شامل ہیں۔ان خواتین ناول نگاروں میں ہم زاہدہ زیدی کی کچھ معاصر خواتین کی ناول نگاری کا جائزہ لیں گے۔

1۔قرۃ العین حیدر۔

اردو کی ورجینا وولف کہیں جانے والی ممتاز ناول نگار قرۃ العین حیدر نے 1945 کے آس پاس لکھنا شروع کیا تھا۔انہوں نے افسانہ،ناول،خاکہ،رپورتاژ،خطوط اور تنقید و ترجمہ ہر صنف میں اپنے گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ان کے ناولوں میں پہلا ناول ''میرے بھی صنم خانے (1949)'' ہے۔جس میں اودھ کے ایک زمین دار گھرانے کی کہانی ہے جو اپنے گرد و پیش کے ماحول میں ہونے والی سیاسی و سماجی حالات سے بے خبر ہے۔اس کے بعد انہوں نے کئی اہم ناول سفینہ غم دل 1953،آگ کا دریا 1959،گردش رنگ چمن 1988،چاندنی بیگم 1990 اور سوانحی ناول کار جہاں دراز ہے جو 1990 میں لکھا۔ان ناولوں میں ان کے ناول ''آگ کا دریا'' کو کافی مقبولیت اور تنقیدی توجہ ملی۔ جو تقسیم ہند کے موضوع پر لکھا گیا تھا۔اور جس میں صرف تقسیم ہند کا بیان ہی نہیں بلکہ ہندوستان کی ڈھائی ہزار سال کی تاریخ کو سمیٹا گیا ہے۔اور اس میں تقسیم ہند کے ساتھ پوری انسانیت کی تقسیم کو دکھایا گیا ہے۔ادبی حلقوں میں اس ناول پر کافی بحث ہو چکی ہے۔

آگ کا دریا کے علاوہ ''آخر شب کے ہم سفر'' بھی ان کا بہترین ناول ہے۔فنی اعتبار سے قرۃ العین حیدر کا یہ ناول آگ کا دریا سے زیادہ کامیاب ہے۔اس ناول کا موضوع تاریخ،سیاست،معاشرت اور معیشت ہے۔یہ ناول بنگال کی دہشت پسند اور انقلابی تحریک 1942 کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ان ناولوں کے علاوہ ان کے دوسرے ناول چاندنی بیگم،گردش رنگ چمن اور کار جہاں دراز ہے۔بھی اہم ناول ہیں۔

قرۃ العین حیدر نے ہندوستان کے سرمایہ دار طبقہ کی زندگی کو خاص طور سے اپنے ناولوں میں پیش کیا۔اور کونیل ہندوستان کے ماضی اور پھر اس کے بعد کی ہندوستانی صورت حال کی تصویر کشی کی ہے۔ان کا ذہن ماضی اور حال دونوں کو بیک وقت دیکھتا ہے۔اور یہی ان کا کمال ہے کہ وہ تاریخ کو کہانی کے پیرایہ میں پیش کر دیتی ہیں۔اور ان کے بیش تر ناولوں میں تاریخ،زمانہ اور وقت کو ہی موضوع بنایا گیا ہے۔لیکن قرۃ العین حیدر نے وقت و تاریخ کو موضوع بنانے کے باوجود انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کو اپنے فن میں سمو دیا ہے۔

2۔جمیلہ ہاشمی۔

جمیلہ ہاشمی بھی زاہدہ زیدی کی معاصر ناول نگار ہیں۔ان کی پیدائش 1929 کو مشترکہ ہندوستان کے

گوجرہ میں ہوئی۔اس کے بعد وہ پاکستان چلی گئیں۔اور پنجاب یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم۔اے کیا۔وہ اردوادب کی ممتاز افسانہ نگار اور ناول نگار ہیں۔ان کے افسانوی مجموعوں میں''آپ بیتی جگ بیتی 1969،رنگ بھومی 1987اورنسبت رت میں رو''ہیں۔

جمیلہ ہاشمی نے کئی ناول لکھے جن میں''تلاش بہاراں،جوگ کی رات،آتش رفتہ،روحی،جوگی کی رات اوراپنااپنا جہنم (تین ناوٹ)''خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ناول''تلاش بہاراں''پرانہیں آدم جی ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔یہ ان کے معاشرتی ناول ہیں۔جس میں انہوں نے زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔

ان ناولوں کےعلاوہ ان کے تاریخی موضوعات پر لکھے گئے دو ناول''دشت سوس''اور''چہرہ بہ چہرہ رو برو''ہیں۔ان میں''چہرہ بہ چہرہ رو برو''1977میں شائع ہوا۔یہ ناول ایران کی متوسط طبقہ اور وہاں کی وہابی تحریک سے متعلق قرۃ العین طاہرہ کی کہانی ہے۔جس کی زندگی کی روشنی میں کئی حقائق سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی گئی ہے۔اس کے علاوہ ناول''دشت سوس1983میں منظر عام پر آیا۔جس میں حسن بن منصور حلاج کی زندگی کی تصویر کشی کی گئی ہے۔حسین بن منصور دسویں صدی عیسوی میں عہد عباسیہ میں ایک ممتاز صوفی تھا۔ اس ناول میں منصور کی مخصوص فکر کے ساتھ عہد عباسیہ کی سماجی اور سیاسی حالات کو بھی قلم بند کیا گیا ہے۔

جمیلہ ہاشمی نے معاشرتی اور تاریخی دونوں طرح کے موضوعات کو اپنے ناولوں میں پیش کیا ہے۔معاشرتی پہلوؤں میں انہوں نے سماجی،سیاسی اور زندگی کے مختلف مسائل کے ساتھ عورت پر مرد کی بالا دستی کو بیان کیا۔تو دوسری طرف انہوں نے اپنی ذہانت،محنت،لگن اور وسیع مطالعہ سے دو اہم تاریخی ناول بھی لکھے۔ناول نگاری میں انہوں نے اپنی انفرادیت کے جو نقوش چھوڑے ہیں انہیں اردو ناول نگاری میں فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

3۔خدیجہ مستور۔

پاکستان کی مشہور ومعروف افسانہ اور ناول نگار خدیجہ مستور اپنے ناول''آنگن''کی وجہ سے اردو میں ایک الگ پہچان رکھتی ہیں۔اگرچہ انہوں نے ناول کے مقابلے میں افسانے زیادہ لکھے لیکن پھر بھی اپنے ناول ''آنگن''اور''زمین''کی وجہ سے وہ اردو ناول نگاری میں ایک قابل قدر ناول نگار کی حیثیت سے جانی جاتی ہیں۔

ان کی پیدائش 1927 میں یو پی کے بریلی شہر میں ہوئی لیکن تقسیم ہند کے بعد انہیں بھی بے سروسامانی کی حالت میں ہجرت کر کے پاکستان جانا پڑا۔اور پھرلاہور میں مستقل سکونت اختیار کی۔تقسیم کے خونی واقعہ پر یوں تو اردو میں بہت سے ناول لکھے گئے۔خدیجہ مستور کے پانچ افسانوی مجموعے ''کھیل 1944، بوچھار 1946، چندروز اور 1951، تھکے ہارے 1962 اور ٹھنڈا میٹھا پانی 1981 منظر عام پر آچکے ہیں۔ان کے مشہور افسانوں میں تلاش گمشدہ ،درد، بوچھار اور چند روز اور ہیں۔جب کہ دو ناول ''آنگن 1962 ''اور'' زمین 1984 '' شائع ہو چکے ہیں۔تقسیم کے خونی واقعہ پر یوں تو اردو میں بہت سے ناول لکھے گئے۔لیکن ان میں آگ کا دریا (قرۃالعین حیدر)،اداس نسلیں (عبداللہ حسین) اور آنگن (خدیجہ مستور) کو خاص اہمیت حاصل ہیں۔

ان ناولوں میں خدیجہ مستور کا ناول آنگن بھی اردوادب میں نمایاں مقام رکھتا ہے۔قرۃالعین حیدر اور عبداللہ حسین کی طرح خدیجہ مستور نے بھی تقسیم ہند کو نہ صرف اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا بلکہ ہجرت کا درد بھی محسوس کیا۔ان کے اس ناول میں بھی صرف تقسیم ہند کے خونی واقعہ کی تاریخ ہی نہیں بلکہ اس وقت کی پوری سماجی اور معاشرتی حالت کی تصویر کشی ملتی ہیں۔یہ ناول گھر کی نجی اور گھریلو زندگی سے لے کر پورے ہندوستان کی سیاسی اور سماجی حالت کو بھی بیان کرتا ہے جس لحاظ سے ہندوستان کو بھی ایک آنگن کے پس منظر میں پیش کیا گیا ہے۔اس میں ہمیں رومانی عنصر بھی نظر آتا ہے جہاں تہمینہ آپا اور صفدر کی محبت پروان چڑھتی ہے۔اس کے علاوہ سیاسی اعتبار سے بھی اس ناول میں اس وقت ہندوستان میں چل رہی مختلف تحریکوں کانگریس اور مسلم لیگ کا ذکر بھی ملتا ہے۔غرض کہ خدیجہ مستور نے اپنے اس ناول میں ہندوستان کی دور غلامی سے لے تقسیم ہند تک سبھی واقعات کا احاطہ کیا ہے۔

ناول کے علاوہ ان کے افسانوں کے موضوعات بھی اہم ہیں انہوں نے عورت کی حیثیت،اس کی نفسیات اور مسائل پر لکھا اور ایک عورت ہونے کے ناطے ان کی ہمدردیاں بھی عورت کے ساتھ ہی تھیں۔جس کا ذکر انہوں نے اپنے پہلے مجموعہ ''کھیل'' میں کیا۔جس میں انہوں نے عورت کی وفا و قربانی اور مرد کی بے وفائی کو موضوع بحث بنایا ہے۔اس طرح ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ خدیجہ مستور کے موضوعات کافی وسیع اور ہمہ گیر

ہیں۔جس کوانہوں نے نہایت صاف،سادہ اور سلیس اردو میں بیان کر دیا ہے۔اور جواردو ادب کی تاریخ میں قدرومنزلت کی نگاہ سے بھی دیکھا جاتا ہے۔

4۔جیلانی بانو۔

ہندوستانی ادیبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی جیلانی بانو1936میں بدایوں میں پیدا ہوئیں۔ان کے والد حیرت بدایونی اپنے وقت کے معروف شاعر تھے۔اردو ادب سے دلچسپی جیلانی بانو کو اپنے والد کے توسط سے ملی۔۔ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا انہوں نے منٹو،عصمت،میر،غالب اور اقبال کی تخلیقات کا خاص طور سے مطالعہ کیا تھا۔اس کے علاوہ ان کے گھر سجاد ظہیر،مخدوم محی الدین،جگر مرادآبادی اور کرشن چندو غیرہ کا ان کے گھر آنا جانا تھاایسے ماحول میں ان کی شخصیت کوخوب ترقی ملی اور پھر انہوں نے ابتدائی عمر سے ہی لکھنا شروع کر دیا تھا۔

ان کی پہلی کہانی ''ایک نظر ادھر بھی1952''میں منظر عام پر آئی لیکن ان کی شہرت کہانی ''موم کی مریم'' سے ہوئی جو ماہنامہ سویرا میں شائع ہوئی۔ان کا شہرہ آفاق ناول''ایوان غزل1977'' ہے۔اس ناول میں حیدرآباد کی جاگیردارانہ زندگی کی عکاسی کی گئی ہے۔واحد حسین اس ناول کا کردار رقص وسرور کا دلدادہ تھا جس کی وجہ سے اس ناول میں رقص وسرور اور ادبی محفلوں کی عکاسی ملتی ہے۔ان کا دوسرا ناول''بارش سنگ 1985'' ہے۔اس کے علاوہ ان کے ناولٹ کا مجموعہ''جگنو اور ستارے1965'' ہے۔جس میں تین ناولٹ دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پر،جگنو اور ستارے اور رات جگنو اور ستارے،شامل ہیں۔ان کا دوسرا ناولٹ کا مجموعہ''نغمے کا سفر1977'' ہے۔جس میں اکیلا،پتھر کا جگر،کیمیائے دل اور نغمے کا سفر ناولٹ ہیں۔ان کے علاوہ گڑیا کا گھر اور ابارشن بھی ان کے ناولٹ ہیں۔ اس کے علاوہ کہانیوں کا مجموعہ روشنی کے مینار(1958)اور نروان(1963)ہے۔

جیلانی بانو کی ان تخلیقات سے ہمیں ان کی ذہانت کا ثبوت مل جاتا ہے۔جیلانی بانو کا تعلق حیدرآباد سے تھا اسی لیے ان کی بیشتر کہانیوں میں ہمیں حیدرآباد کا ذکر ملے گا۔انہوں نے سماج کے غریب اور پس ماندہ طبقے کا خاص طور سے اپنی تخلیقات میں ذکر کیا ہے۔

ناول کے علاوہ ان کے کئی افسانوی مجموعے بھی ہیں۔جن میں''بات پھولوں کی،سچ کے سویرے،

بند ہے اور پرایا گھر وغیرہ ان کے اہم افسانوی مجموعے ہیں اس کے علاوہ ''دور کی آوازیں'' کے نام سے ایک خطوط کا مجموعہ بھی ہے۔ جیلانی بانو خالص نثر نگار تھیں۔اور نثر نگاری کے میدان میں ان کی بے شمار تخلیقات کو دیکھ کر اس کا اندازہ لگانا بھی مشکل نہیں۔

5۔بانو قدسیہ۔

بانو قدسیہ کا نام بھی اردو کی نامور ناول نگار،افسانہ نگار اور ڈرامہ نگار میں شامل ہوتا ہے۔ ناول کی صنف میں یوں تو انہوں نے کئی تخلیقات پیش کیں۔لیکن ناول نگاری میں وہ اپنے شہرہ آفاق ناول ''راجہ گدھ'' کی وجہ سے جانی جاتی ہیں۔ناول کے علاوہ انہوں نے افسانہ اور ڈرامے کے میدان میں طبع آزمائی کی۔اور ریڈیو ٹیلی ویژن کے لیے بہت سے ڈرامے بھی لکھے۔

ان کے ناولوں میں راجہ گدھ،ایک دن،حاصل گھاٹ،شہر لازوال،آباد ویرانے، پروا، پروا اور ایک دن ،موم کی گلیاں،شہر بے مثال،توبہ شکن شامل ہیں۔ان کے افسانوں میں،ہجرتوں کے درمیاں،دستہ بستہ،آتش زیر پا،امربیل،دوسرا دروازہ، بازگشت، نا قابل ذکر، سامان وجود،توجہ کی طالب، کچھ اور نہیں،سوانح نگاری میں ان کی دو تصانیف راہ رواں (اشفاق احمد)،مرد ابریشم (قدرت اللہ شہاب) ملتی ہیں۔

جب کہ ان کے ڈراموں میں چھوٹا شہر بڑے لوگ، پھر اچانک یوں ہوا،لگن اپنی اپنی،ایسے پیسے تمثیل، ہوا کے نام،دوسرا قدم،سدھارن،آدھی بات ،سورج مکھی اور پیا نام کا دیا، ہیں۔ بانو قدسیہ کے ڈرامہ آدھی بات کو کلاسکی ڈرامہ کہا جاتا ہے۔

ان مذکورہ خواتین کے علاوہ اس دور کی بہت سی اہم خواتین ناول نگار ہیں۔جنہوں نے ناول کی صنف میں بے بہا تخلیقات کے نمونے پیش کیے جس سے اردو ناول کی صنف میں بہترین ناولوں کی ایک لمبی فہرست شامل ہے۔ان میں ہاجرہ مسرور کے،

زاہدہ زیدی کی ناول نگاری:

ناول انقلاب کا ایک دن۔

ناول انقلاب کا ایک دن زاہدہ زیدی کا واحد ناول ہے۔ یہ ناول چودہ مناظر پر مشتمل مختصر ناول ہے

جس میں ایک یونیورسٹی کے ماحول کو پیش کیا گیا ہے جہاں ایک ترقی پسند خیالات کی حامل لڑکی صادقہ اور اس کے ارد گرد کا ماحول نظر آتا ہے۔صادقہ جو انگلش میں M.A کر رہی ہے اسے انگیریزی ادب سے خاص دلچسپی ہے ساتھ ہی وہ بہت ذہین اور محنتی طالب علم بھی ہے مختلف کتابوں کے مطالعہ کا اسے خاص شوق ہے۔انگریزی کے علاوہ اسے اردو سے بھی گہرا شغف ہے اور شعروشاعری میں بھی اس کی خاصی دلچسپی ہے خاص کر ڈرامے کی صنف سے ان کو بے حد لگاؤ ہے وہ اردو ور انگریزی دونوں زبانوں میں ڈرامے کی صنف سے متاثر ہیں انگریزی کے سبھی ڈرامہ نگاروں کا نہ صرف اس نے گہرائی سے مطالعہ کیا ہے بلکہ وہ اپنی رائے کا اظہار کرتی ہے۔وہ اپنے ڈیپارٹمنٹ کی ایک باصلاحیت اور سنجیدہ طالب علم ہے جسے آکسفورڈ جا کر تعلیم حاصل کرنے کا بہت شوق ہے۔اور گاہے گاہے اس کا خواب دیکھتی رہتی ہے۔

علمی سرگرمیوں کے علاوہ وہ کمیونسٹ پارٹی کی بھی سرگرم رکن ہے جو نہ صرف پارٹی کے جلسوں اور حلقوں میں شامل ہوتی ہے بلکہ عملی طور پر بھی اہم کام انجام دیتی ہے۔انقلابی خیالات کی کتابیں خرید کر لانا خاص کر چیخوف، گورکی، تالستائی اور دوسرے کچھ پارٹی لٹریچر اور روسی ناولوں سے تھیلا بھرا رہتا ہے جس کو وہ ترقی پسند خیالات کے حامل لوگوں تک پہنچاتی ہے۔

صادقہ کے علاوہ اس کی چار اور بہنیں تھیں جن میں سب سے بڑی صالحہ علوی جو نہایت ذہین پروقا راور سنجیدہ تھیں اور آکسفورڈ سے اسکالرشپ پر پی۔ایچ۔ڈی کرنے والی وہ پہلی خاتون تھیں۔ان کی ذہانت اور علمیت کا یونیورسٹی کا ہر طالب علم اور استاد قائل تھا۔وہ اپنی تقریروں اور لکچروں سے اچھے اچھے مخالفوں کا منہ بند کر دیتی تھیں اور اب امریکہ سے واپس آکر انہیں سینئر لکچر شپ بھی مل گئی تھی جو ان کی غیر معمولی ذہانت وقابلیت کا اعتراف بھی تھی۔یہاں مصنفہ نے صالحہ کے کردار کو ایک آئیڈیل کردار کے روپ میں پیش کیا ہے جس نے اپنی صلاحیتوں کی بنا پر اپنے حق کو حاصل کیا تھا۔

صادقہ کی دوسری بہنیں بھی کمیونسٹ پارٹی کی سرگرم رکن تھیں اور آج کل ’’پارٹی اسکول‘‘ میں شریک ہونے کے لیے گئی تھیں جہاں انہیں پارٹی کے لیڈروں کو دوسری تمام رپورٹیں بھی پیش کرنا تھیں اس پارٹی اسکول میں بورژوا لڑکیوں کا شریک ہونا خاص کر اہم تھا کیوں کہ اس سے انہیں مزدوروں، کسانوں، اور غریب طبقہ

کے لوگوں کو سمجھنے اوران کے قریب ہونے کا موقعہ ملے گا۔ جب کہ صادقہ کی ایک بہن سعدیہ جو طالب علمی کے زمانے میں کچھ غیر سنجیدہ اور الھڑ تھی اس کی شادی ہوگئی تھی لیکن شادی کے بعد سعدیہ بھی پڑھنے کے لیے سنجیدہ ہوگئی تھی اور کمیونسٹ پارٹی کا رکن بھی بننا چاہتی تھی اپنی اس خواہش کا اظہار صادقہ سے کر چکی تھی صادقہ کی بہنوں کے علاوہ اس کی امی کا کردار بھی اہم ہے جو فارسی اور اردو میں اچھے شعر کہتی ہیں اور صادقہ نے ان کے کلام کو شائع کروانے کا ارادہ بھی کرلیا ہے۔

غرض کہ صادقہ کا خاندان علمی و ادبی تھا بلکہ اس کا خاندان الطاف حسین حالی کے گھرانے سے تھا جہاں علم و ادب کو ایک خاص اہمیت رہی ہے مالی اعتبار سے بھی ماضی میں ان کا گھرانہ کافی اچھی حالت میں تھا اس کے والد کی وفات کے بعد خاندان کے لوگوں نے ان کی جائداد پر قبضہ کر رکھا تھا اور اب وہ ایک معمولی گھرانے سے تھی لیکن پارٹی کے لوگ اسے ہمیشہ بورژوا طبقہ سے ہونے کا طعنہ سناتے کہ وہ پارٹی کے کاموں میں بھی بورژوا ذہنیت کے مطابق کام کرتی ہے جب کہ صادقہ ہمیشہ خود کو ایک معمولی گھر سے واسطہ ہونے کا ثبوت فراہم کرتی رہتی ہے جن کی آمدنی کا واحد ذریعہ اس کی آپا صالحہ علوی کی تنخواہ پر منحصر تھا۔

ناول میں ان کرداروں کے علاوہ باقر انصاری، پروفیسر محبوب علی، سید اسرار حسین، جبار احمد خان ،ڈاکٹر انیس فاروقی، شفیق بھائی، شکیلہ، شبانہ، ثریا، خالدہ، کامریڈ لال سلام سلمان، ابرار عالم، پروفیسر عبدالماجد اور شاہینہ کے کردار بھی اہم اور جاندار ہیں۔

ناول میں یونیورسٹی کے دلچسپ ماحول کو پیش کیا گیا ہے جہاں ادبی، سیاسی سرگرمیاں، آپسی بحث و مباحثہ، تقریریں، خطبات، ثقافتی پروگرام طالب علموں کی مختلف سرگرمیاں، ہنگامے، ان کی شرارتیں اور علمی و ادبی فضا کو دلچسپ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ خاص کر صادقہ کی ادبی اور سیاسی زندگی کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے۔ صادقہ انگریزی ادب ایم۔ اے کی طالب علم ہے۔ وہ ورڈس ورتھ کی شاعری اور شعری زبان پر ایک اہم مضمون prefece to lyrical ballads کے نام سے لکھ رہی ہے اور ورڈس ورتھ جس پر اسرار صاحب اور پروفیسر محبوب علی دونوں نے تعریف کی ہے۔ اس کے علاوہ اس نے شیکسپیئر کے ڈرامے Hamlet کو بھی ایک نئے انداز سے مشاہدہ کیا ہے اس پر پروفیسر محبوب علی تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں؛

Hamlet کی خود احتسابی اور تشکیک کا جو تجزیہ تم نے کیا ہے وہ بہت اچھا ہے اور مافوق الفطرت عناصر یعنی معقول بادشاہ کے بھت کی جو نفسیاتی تاویل تم نے پیش کی ہے وہ بھی جاندار ہے لیکن جہاں تم نے ہیملٹ کو ایک نقلابی ہیرو کے طور پر پیش کیا ہے وہاں کچھ بات نہیں بن پاتی۔1

لٹریچر کے علاوہ صادقہ کو انگریزی زبان پر بھی مہارت ہے وہ اپنی ایک تقریر سٹڈی سرکل کی میٹنگ میں کرتی ہے جس کا عنوان ہے Marxist concept of individual,family and society (فرد، خاندان اور معاشرے کا مارکسی تصور) نثار احمد فاروقی جو کہ انگریزی پر اپنی ملکیت سمجھتے تھے صادقہ سے اردو میں سوال کرتے ہیں جو اسے کافی ناگوار گزرتا ہے کیوں کہ اس کا خیال تھا کہ فاروقی صاحب چاہتے تھے کہ وہ اردو میں تقریر کرتی لیکن صادقہ نے انگلش میں نہ صرف روانی کے ساتھ پیپر پڑھا بلکہ ان طالب علموں کے سوالات کے جواب بھی دئے جنہوں نے اس سے سوال کئے تھے۔

انگریزی کے علاوہ صادقہ کو اردو شاعری اور ڈرامے سے بھی دلچسپی تھی جس کا ثبوت یہ تھا کہ پروفیسر نجیب الرحمان کی نظمیں اسے زبانی یاد تھیں اس کے علاوہ کرشن چندر کے افسانہ ''ان داتا'' کو اسٹیج کرنے کی بھی تیاری میں مصروف تھی اور اسے پیش کرنے کے لیے انتھک کوشش کر رہی تھی۔ان علمی سرگرمیوں کے علاوہ صادقہ سرگرم اور ایک فعال رکن کی حیثیت سے بھی نمایاں کیا گیا ہے جو پارٹی کے ساتھ ہر قدم ساتھ ہے اور ہر ممکن طرح سے پارٹی کی کارگزاریوں میں نہ صرف حصہ لیتی ہے بلکہ بے تکلف اور بے جھجک اپنے خیالات کا بھی اظہار کرتی ہے۔ Marxist concept of individual,family and society پر اظہار خیال کرنے کے لیے مارکس اور اینگلز کے کئی مضامین اور کتابیں پڑھ کر اپنا پیپر تیار کیا تھا جس کی مدد سے اس نے اپنے مضمون پر مختلف پہلوؤں سے روشنی ڈالی اور مرد معاشرہ اور خاندان کے موضوع پر مارکسی نظریات کی وضاحت بھی کی۔اس مضمون میں دلچسپی کے لیے اس نے انگریزی اور اردو لٹریچر کا بھی سہارا لیا ہے ابسن ،آرتھر اور برناڈ شو کے ڈراموں اور تالستائی و پریم چند کی کہانیوں کا بھی حوالہ دیا۔

غرض کہ ناول میں صادقہ کے پہلو دار کردار کے ساتھ دوسرے کردار بھی اہم رول ادا کرتے نظر آتے ہیں۔یونیورسٹی کی خاص سرگرمیوں کا احاطہ کیا گیا ہے اس کے علاوہ کلاس اور ڈیپارمنٹ کی بھی مختلف تقریب و

سیمینار کا ذکر ملتا ہے پورے ناول کی فضا میں علمی وادبی ماحول چھایا رہتا ہے۔صادقہ چونکہ خود بھی ایک طالب علم ہوتی ہے لہذا اس کے آس پاس کے تمام کردار بھی کافی ذہین ،دلچسپ اور علمی و ادبی فضا کی نمائندگی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ناول پڑھنے سے جو تاثر اور ماحول نظر آتا ہے وہ علی گڑھ اور یونیورسٹی سے تعلق رکھتا ہے زاہدہ زیدی نے جس یونیورسٹی کا نقشہ پیش کیا ہے وہ A.M.U کے انگلش اور اردو ڈیپارٹمنٹ سے ملتا ہے جیسے انہوں نے ایک جگہ لکھا ہے:

اس کا پہلا پڑاؤ شعبہ اردو تھا جو انگریزی کے شعبہ سے قریب تھا۔2

دوسرا ہسٹری ڈیپارٹمنٹ کا ذکر" ساڑھے بارہ بجنے والے تھے اور صادقہ کا رخ اب ہسٹری ڈیپارٹمنٹ کے اس ہال کی طرف تھا جو آرٹس فیکلٹی کا سب سے بڑا ہال تھا اور فیکلٹی کے توسیع خطبات عام طور سے وہیں ہوتے تھے۔3

اور صادقہ کے کردار میں خود زاہدہ زیدی نظر آتی ہیں جس کا ذکر ناول میں بھی ملتا ہے جب صادقہ کی بڑی بہن صالحہ تقریر کے لیے مدعو کی جاتی ہے تو پروفیسے عبدالماجد ان کا تعارف کراتے ہوئے کہتے ہیں "اور اب صالحہ علوی کے خاندان کے علمی وادبی اور اصلاحی کارناموں کا تذکرہ شروع کر دیا وہ ان کے والدین نانا اور دادا سے ہوتے ہوئے حالی اور سرسید تک آپہنچے تھے۔"4

اس کے علاوہ انہوں نے صادقہ کی والدہ کی شاعری کا بھی ذکر کیا جو اردو اور فارسی میں شاعری کرتی تھیں جو خود زاہدہ زیدی کی والدہ مختار فاطمہ تھیں اور جن کے کلام کے کچھ اشعار زاہدہ زیدی نے قلم بند بھی کئے ہیں جو ان کی والدہ کے مذہبی شعری مجموعے "چمنستان عقیدت" سے لیے گئے تھے۔

انقلاب کا ایک دن، ایک فکری ناول ہے اس میں اگرچہ صرف ایک دن کی فضا کو دکھایا گیا ہے لیکن اس ایک دن میں بھی ہمیں اس ناول کا مطالعہ کرنے سے ایک پورے دور کی سرگرمیاں نظر آتی ہیں اور اس وقت کی علمی و ادبی ،سیاسی ،سماجی اور معاشرتی فضا کے نقوش ملتے ہیں۔ بلکہ ایک طالب علم کی ذہانت، صلاحیت، قابلیت اور اس کی دلچسپیوں، یونیورسٹی کا ماحول، کلاس روم کی شرارتیں اور طالب علم و استاد کے

تعلقات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔صادقہ کے کردار کو مرکزیت حاصل ہے اور اس کی قابلیت، غیر معمولی صلاحیت اور دلچسپیوں کو ظاہر کیا گیا ہے۔ساتھ ہی اس ناول میں صادقہ کی نفسیاتی اور داخلی کیفیات کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔اسے فطرت سے بے حد لگاؤ ہے خاص کر ڈوبتے ہوئے سورج کا منظر اسے بیحد متاثر کرتا ہے وہ اکثر اس منظر کو غور سے دیکھتی ہے۔ڈوبتے سورج کے علاوہ اسے سمندر سے بھی دلچسپی ہے اس کا ذکر بھی اس ناول میں ملتا ہے۔ان تمام چیزوں کے برعکس صادقہ کی داخلی خواہش کو بھی اجاگر کیا گیا ہے اور ان تمام مصروفیات کے باوجود کبھی کبھی اس کے ذہن میں ایسے واقعات بھی رونماں ہوتے ہیں جہاں وہ خود کو اکیلا اور تنہا محسوس کرتی ہے اور اپنی منزل کو موہوم سمجھنے لگتی ہے لیکن یکا یک وہ اپنے اس خیال کو جھٹک دیتی ہے۔؛

اور اس نے اپنے تصورات کی شدت کو ذرا کم کر کے ہلکے طنز کے ساتھ سوچا کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اس کی طرح ایک ہلکی پھلکی سائیکل پر سوار تن تنہا ایک موہوم منزل کی سمت رواں دواں ہیں ___ تن تنہا ___ اور ایک موہوم منزل کی سمت! ___ لیکن اس کے ذہن میں یہ خیال کیسے آیا ؟ ___ کیا وہ تنہا تھی ___ اور کیا اس کی منزل موہوم تھی ؟ ___ کیا اس کے عزیز رشتہ دار، دوست احباب، استاد اور ہم جماعت انقلابی ساتھی اور ترقی پسند حلقے کے لوگ اس کی زندگی کا حصہ نہ تھے۔کیا اس کی زندگی انہیں رشتوں اور محبتوں سے عبارت نہ تھی ___ ؟ ___ ’’اور اب اس نے محسوس کیا کہ یہ سبھی رشتے اس کے لیے اہم اور بامعنی تھے۔اور اس کی زندگی کے ہلکے اور گہرے رنگ انہیں کے مرہون منت تھے۔۔لیکن اپنے ذہن کی پہنائیوں اور روح کی گہرائیوں میں تو وہ تنہا ہی تھے اور یہ داخلی دنیا بھی تو اس کی بے بہا دولت تھی جس کے بغیر اس کی زندگی سپاٹ اور بے معنی تھی۔5

ناول کو روزمرہ واقعات کے تانے بانے میں پرویا گیا ہے اور ہر ایک کردار کے عمل کے ذریعہ ناول کی فضا کو آگے بڑھایا گیا ہے اس میں صادقہ کے شعور کو بھی کافی اہمیت حاصل ہے اس میں مصنفہ نے شعور کی رو کی تکنیک سے کام لے کر ماضی کے واقعات کو بھی پیش کیا ہے۔جو صادقہ کے شعور میں وقتاً فوقتاً گردش کرتے ہیں۔ناول کی زبان اور اسلوب بہت زیادہ پیچیدہ نہیں مگر کمیونسٹ پارٹی اور صادقہ کے انگریزی طالب علم ہونے کے باعث اس میں انقلابی فنکاروں کی تحریروں اور کتابوں کے نام جگہ جگہ دیکھنے کو ملتے ہیں جیسے چیخوف، گورکی، تالستائی وغیرہ کے ناموں کے ساتھ انگریزی کے اہم فنکار ابسن ، برنارڈ شو، ورڈس ورتھ،

شیکسپیئر اور آرتھر ملر وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے۔

زاہدہ زیدی اردو شاعری اور ڈرامے سے گہرا شغف رکھتی تھیں اس لیے ناول میں کئی مرتبہ اردو شعراء اور ان کے کلام کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ جگہ جگہ علامہ اقبال کے اشعار کا حوالہ بھی ملتا ہے۔ ناول کی شروعات میں بھی جگر مرادآبادی کا ایک شعر درج کیا گیا ہے:

اک لفظ محبت کا ادنیٰ یہ فسانہ ہے

سمٹے تو دل عاشق پھیلے تو زمانہ ہے [6]

شاعری کے علاوہ اردو افسانے اور ڈراموں کا بھی تذکرہ ہے جن میں سردار جعفری کے ''نئی دنیا کو سلام'' اور کرشن چندر کے ''ان داتا'' کو اسٹیج پیش کے لیے بھی دکھایا ہے۔ مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ زاہدہ زیدی نے اس ناول میں اپنے طالب علمی کے زمانے کی سرگرمیوں اور اپنے اردگرد کے ماحول اور ادبی و علمی فضا کو ناول کے قالب میں پیش کیا ہے جس کا اثر پورے ناول میں چھایا ہوا ہے۔

اس ناول کے تعارف میں ناول کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے شہناز ہاشمی لکھتی ہیں:

> مجموعی طور پر ''انقلاب کا ایک دن'' بے حد دلچسپ اور فکر انگیز ناول ہے۔ جس میں ایک پورے دور کے نقوش ابھرتے ہیں۔ سب سے زیادہ جاذب توجہ خود صادقہ کا کردار ہے۔ صادقہ انگریزی ادب میں گہری دلچسپی رکھتی ہے۔ ڈرامے اور شاعری خاص لگاؤ ہے۔ وہ کمیونسٹ پارٹی کی ایک رکن بھی ہے۔ اور اپنے چاروں طرف کے حالات اور واقعات کے بارے میں سنجیدگی اور گہرائی سے سوچتی ہے۔ اگرچہ اس کی سوچ زمان و مکان کی قید سے آزاد ہے۔ لیکن اس کو زمانے کے سرد و گرم کی سوجھ بوجھ اور کشاکش جذبات کا احساس بھی ہے۔ صادقہ کے تخیل کی پرواز بے کنار ہے۔ لیکن ساتھ ہی وہ حقیقت کی دنیا سے بھی آشنا ہے۔ انسانی رشتوں کی نزاکتیں اور لطافتیں مصنفہ نے صادقہ کی زبان اور سرگرمیوں کے ذریعہ بڑی خوبی سے پیش کی ہیں۔ استاد اور شاگرد کے رشتے، بزرگوں اور نوجوانوں کے رشتے، دوستوں اور ہم عصروں کے رشتے اور ساتھ ہی انسان اور سماج کی وابستگی، انسانی خیالات پر مناظر فطرت کے اثرات، یہ سب چیزیں بہت ہی سیر حاصل طریقے سے اجاگر کی گئی ہیں۔ [7]

ناول ''انقلاب کا ایک دن'' کمیونسٹ پارٹی کی کارکن صادقہ کے انقلابی خیالات کی ایک دن کی

روداد ہے،اوراس ناول میں یونیورسٹی کے ماحول سے لے کراس دورتک کے تمام سیاسی اورسماجی حالات کا اندازہ بخوبی ہوجاتا ہے،اس کے علاوہ مباحثے،ادبی وثقافتی اور سیاسی سرگرمیوں کا بھی جائزہ لیا گیاہے۔دراصل یہ ناول زاہدہ زیدی کی خودکی زندگی معلوم ہوتی ہے جسے انہوں نے ناول کےفورم میں پیش کیا ہے۔اس ناول سے ہمیں زاہدہ زیدی کی زندگی کے بھی بہت سے واقعات جیسے ترقی پسند تحریک کی سرگرمیوں،زاہدہ زیدی کےگھریلوحالات اوران کی شخصیت کے بارے میں بھی معلومات حاصل ہوتی ہے۔

جہاں تک اس ناول کی فنی خصوصیات کی بات ہےاس میں زاہدہ زیدی نےشعور کی روکی تکنیک سے کام لے کر بہت سے واقعات پرنظرڈالی ہے کبھی اپنے ماضی،کبھی حال اور مستقبل کی فکرکوظاہرکیا گیا ہے۔اور چونکہ یہ بات عیاں ہے کہ وہ انگریزی کی طالب علم اور پروفیسرتھیں لہذااس صنف میں بھی ان کا رجحان کا بجا طور پرانگریزی ادب سے متاثر ہے۔قرۃالعین حیدرکی طرح زاہدہ زیدی بھی ورجینا وولف سے متاثرتھیں اور ان کےاس ناول پربھی ورجینا وولف کے ناول ''مستقبل'' کا اثر دکھائی دیتا ہے۔ڈرامائی انداز میں لکھے گئے یہ ناول شعور کی تکنیک اور ڈراما کی خصوصیات کے علاوہ شاعرانہ عناصر کا بھی حامل ہے۔فطرت کی بھی بہترین عکاسی کے ساتھ داخلی اورخارجی مسائل کوبھی بیان کیا گیا ہے۔جس میں ماضی اورحال کےنقوش ابھرتے ہیں تو مستقبل کی بھی جھلک نظرآتی ہے۔لیکن اس کے مرکزی کردارصادقہ کی فکرزمان ومکان کی قید سےآزاد ہے جو زاہدہ زیدی کی شخصیت کی اہم خصوصیت ہے،صادقہ کوحقیقت کے سردوگرم کا بھی احساس ہے۔صادقہ کےعلاوہ ناول کے تمام کردار بہت جاذب اورسرگرم عمل ہیں،جن کی مدد سے مصنفہ نےاس ناول کی فضا تیارکی ہےاور جو ناول کودلچسپ بنانے اورموضوع کی وضاحت میں اہم کردارادا کرتے ہیں۔

زاہدہ زیدی کے ڈراموں اورناولوں کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات عیاں ہوجاتی ہے کہ ڈراما اور ناول دونوں اصناف سخن میں انہوں نے اپنی تخلیقی بصیرتوں سے کام لیا ہے۔ان دونوں اصناف میں اگرموضوعات کی بات کی جائےتوان کے یہاں اپنے معاشرے کی نہ صرف حقیقی تصویرنظرآئےگی بلکہ انسانی زندگی کے سیاسی،سماجی،معاشی اورنفسیاتی مسائل کوبھی بخوبی پیش کیا ہے۔اسی طرح فنی سطح پربھی ان کاقلم مضبوط ومنفردہےاوردونوں اصناف سخن میں انگریزی ادب کااثربراہ راست نظرآتاہےانگریزی ادب کی مخصوص تکنیک

وجودیت، سریلزم، علامت نگاری، اظہاریت، ڈریم تکنیک، ابسرڈ اور ڈراما در ڈراما کی تکنیک سے خاص طور سے استفادہ حاصل کیا ہے۔

حوالے:

ڈرامانگاری:

1۔ زاہدہ زیدی؛ دوسرا کمرہ، علی گڑھ: آبشار پبلی کیشنز، 1997ء، ص، 31۔

2۔ ایضاً، ص، 32

3۔ زاہدہ زیدی؛ دوسرا کمرہ، علی گڑھ: آبشار پبلی کیشنز، 1997ء، ص، 40

4۔ ایضاً، ص، 61-62

5۔ زاہدہ زیدی؛ دوسرا کمرہ، علی گڑھ: آبشار پبلی کیشنز، 1997ء، دوسرا کمرہ، ص، 107

6۔ زاہدہ زیدی؛ دوسرا کمرہ، علی گڑھ: آبشار پبلی کیشنز، 1997 وَہ صبح کبھی تو آئے گی، ص، 140-142

7۔ زاہدہ زیدی؛ دوسرا کمرہ، علی گڑھ: آبشار پبلی کیشنز، 1997ء، اور جنگل جلتا رہا، ص، 244–245

8۔ ایضاً، ص، 246-247

9۔ زاہدہ زیدی؛ صحرائے عظیم، آبشار پبلی کیشنز، علی گڑہ، 1991ء، ص، 24

10۔ ایضاً، ص، 24

11۔ ایضاً، ص، 07

12۔ ایضاً، ص، 11

13۔ زاہدہ زیدی؛ بہت دور تک رات ہوگی، ثمر آفسیٹ پرنٹر، نئی دہلی، 2006ء، ص، 11

14۔ ایضاً، ص، 11

15۔ ایضاً، ص، 20-21

16۔ ایضاً، ص، 50-51

17۔ ایضاً، ص، 57

18۔ ایضاً،ص،69-70

19۔ ایضاً،ص،73

20۔ ایضاً،ص،77

21۔ ایضاً،ص،80

22۔ ایضاً،ص،95

23۔ ایضاً،ص،98

24۔ زاہدہ زیدی؛ کیوں کر اس بت سے رکھوں جان عزیز، دہلی: ایجوکیشنل پبلی شنگ ہاؤس،1998ء،ص،

25۔ ایضاً،ص،32-33

26۔ ایضاً،ص،07

27۔ ایضاً،ص،91-92

ناول نگاری:

1۔ زاہدہ زیدی؛ انقلاب کا ایک دن، نئی دہلی: ایجوکیشنل پبلی شنگ ہاؤس،1996ء،ص،33

2۔ ایضاً،ص،46

3۔ ایضاً،ص،51

4۔ ایضاً،ص،52

5۔ ایضاً،ص،94

6۔ ایضاً،ص،04

7۔ ایضاً،ص،7-8

☆☆☆

باب چہارم
زاہدہ زیدی کی ترجمہ نگاری اور تنقید نگاری

ترجمہ کا فن:

اردو میں ترجمہ کی صنف کا با قاعدہ آغاز مغرب کے زیر اثر ہوا۔ پہلی جنگ آزادی کے بعد جب ہندوستان میں انگریزی حکومت کے زیر اقتدار سائنسی ترقی کا آغاز ہوا۔ تو ہندوستانی ادب میں بھی تبدیلی آئی ناول اور افسانے کی صنف کا آغاز ہوا اور داستانوی ادب کو خیر آباد کیا گیا۔ اس دور میں ادب میں حقیقی زندگی اور سائنٹفک نظریات کا دخل ہوا۔ اور ادب میں زیادہ تر مغرب کی پیروی شروع ہوئی۔ ناول اور افسانے کی صنف مغربی ادب سے اردو میں داخل ہوئیں۔ اسی طرح شاعری میں بھی مغربی ادب کے زیر سایہ نیچرلزم کی تحریک شروع ہوئی۔ اس طرح ہندوستانی ادب میں مغرب کی پیروی کی جانے لگی۔ اور وہاں کے ادب کا مطالعہ شروع ہوا تو اس وقت کے ادیبوں نے مغربی ادب کو اردو میں بھی منتقل کرنے کی کوشش شروع کی۔ جن میں حالی، محمد حسین آزاد، نظم طباطبائی، عبدالحلیم شرر، رتن ناتھ شرسار وغیرہ۔

ان ادیبوں میں نظم طباطبائی کو ترجمے کی روایت میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ جن کی بدولت اردو میں ترجمہ نگاری کا با قاعدہ آغاز ہوا۔ انہوں نے سب سے پہلے انگریزی شاعر ''گرے'' کی مشہور نظم ''ایلجی'' کا اردو میں ''گورغریباں'' کے نام سے ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ 1897 میں عبدالحلیم شرر کے رسالہ ''دلگداز'' میں شائع ہوا۔ اس ترجمے کو بہت زیادہ پسند کیا گیا۔ اور اس کو کافی شہرت ملی۔ اس ترجمے کی مقبولیت کے بعد طباطبائی نے اور بھی کئی ترجمے کیے۔ جن میں ''زمزمہ فصل بہار (گرے)''، ''دولت خداداد افغانستان (سر الفریڈ لائل)'' وغیرہ۔

یہاں محمد حسین آزاد کے مضامین کا مجموعہ ''نیرنگ خیال'' کا ذکر کرنا بھی ضروری ہوگا۔محمد حسین آزاد نے ان مضامین کو انگریزی مصنفین جانسن اور اڈیسن کے تمثیلی مضامین سے اخذ کیے تھے۔جن میں چھ جانسن ،تین اڈیسن اور باقی انگریزی کے دوسرے مصنفین کے مضامین سے ترجمہ کیے گئے ہیں۔اس کے بعد محمد حسین آزاد نے انگریزی کی بہت سی نظموں کو اردو میں منتقل کیا۔ان میں ''اندھی پھول والی کا گیت (لارڈلٹن)، بہار کا آخری پھول (ٹامس مور)''وغیرہ۔

اس طرح اردو میں اور بھی بہت سے شاعروں نے انگریزی نظموں کا ترجمہ کرنا شروع کر دیا اور اس طرح اردو ترجمہ نگاری کی بنیاد مضبوط ہوتی چلی گئی۔ان ترجموں میں شامل نظموں میں حسرت موہانی کی ''موسم بہار کا آخری پھول (ٹامس مور)''،ظفر علی کی ''ندی راگ (ٹینی سن)''،وفا (ورڈس ورتھ)، نادر کاکوروی ''مرحومہ کی یاد میں،گزرے زمانہ کی یاد میں (ٹامس مور)''،عزیز لکھنوی کی ''مٹی کا جواں چاند (ٹامس مور)''،تلوک چند محروم کی ''نغمات (شیکسپئر)،کوئل (ورڈس ورتھ)،نسب (ہارڈی)، یونان کے جزیرے (لارڈ بائرن)''وغیرہ۔

اسی طرح ناول اور افسانے کی صنف میں ترجمے کا آغاز ہوا اور بہت سے انگریزی،روسی،فرانسیسی، لاطینی، جرمن،سنسکرت اور ہندی ناول و افسانے اردو میں منتقل کیے گئے۔شروع میں نذیر احمد نے جو کہانیاں لکھیں تھیں۔وہ انگریزی ادب سے ہی ماخوذ تھیں۔اس کے بعد رتھن ناتھ شرسار کے ''خدائی فوج''اور سجاد حسین کے ''حاجی بغلول'' کو بھی انگریزی سے متاثر کہا جاتا ہے۔مرزا ہادی رسوا نے بھی کئی جاسوسی ناول ترجمہ کئے جن میں ''خونی جورو،خونی مصور،خونی بھید اور بہرام کی رہائی'' کے نام سے 1928 میں شائع ہوئے۔ان ادیبوں کے بعد بہت سے ناول مغربی ادب سے ترجمہ کیے گیے۔پھر ان ترجمہ نگاروں کی ایک لمبی فہرست نظر آتی ہے۔جن میں عبدالماجد سالک،اشفاق احمد،ابن سلیم،بشیر ساجد،سید قاضی محمود،انتظار حسین اور انیس ناگی وغیرہ اور دوسرے بے شمار مترجم شامل ہیں۔جب کہ افسانہ نگاروں میں امتیاج علی تاج،سجاد ظہیر،نیاز فتح پوری،مجنوگورکھپوری،غلام عباس،سید وقار عظیم،حامد اللہ افسر،قمر نقوی،یوسف ظفر،منصور احمد اور دوسرے کئی ادیبوں کے نام لیے جاسکتے ہیں۔یہاں ہر ایک کے بارے تفصیل کی گنجائش نہیں۔

جہاں تک ڈرامے کا تعلق ہے۔تو ترجمہ نگاری کی صنف میں ترجمہ کئے ہوئے ڈراموں کی کمی نہیں یہاں بھی ہمیں ایک لمبی فہرست نظر آئے گی۔چونکہ ڈرامہ سب سے قدیم صنف ہے۔لہذا اس میں ترجمہ کا فن بھی بہت پرانا ہے۔جس میں قدامت کے اعتبار سے ہومر کی ''اوڈیپس'' کو لے سکتے ہیں۔جس کا دنیا ادب میں سب سے پہلے یونانی سے لاطینی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔دنیا کے دوسرے ادب کی طرح اردو میں بھی مغرب اور مشرق دونوں کی ادبی صنف سے ڈرامے کا ترجمہ کیا گیا۔جس میں ہمیں انیسویں صدی میں کچھ فارسی، ہندی اور سنسکرت کی چھوٹی چھوٹی کہانیاں ملتی ہیں۔اس عہد میں کچھ انگریزی ادب کے ڈراموں کا ترجمہ بھی ملتا ہے۔جن میں احسن لکھنوی کے انگریزی ادب سے کیے ہوئے ترجمے سامنے آتے ہیں۔جو بیشتر شیکسپئر کے ڈراموں کا ترجمہ ہیں۔ہملٹ،شہید وفا،خون ناحق،دل فروش اور گلنار و فیروز وغیرہ شیکسپئر کے ڈراموں کے ہی ترجمہ ہیں۔اور پھر اسی صدی کے آخر میں ہمیں اردو کے ممتاز ڈراما نگار آغا حشر کاشمیری نظر آتے ہیں۔جنہوں نے خود بھی طبع زاد ڈرامے لکھے اور شیکسپیئر کے ڈراموں کو بڑی فنکاری کے ساتھ اردو میں ترجمہ بھی کئے۔ڈرامے کے فن کو انہوں نے اس قدر ترقی دی کہ وہ اردو کے شیکسپئر کہلائے۔انہوں نے نہ صرف انگریزی سے بلکہ فارسی، ہندی اور سنسکرت کے بھی ڈراموں کو اردو میں منتقل کیا۔ان کے ترجمہ کئے ہوئے ڈراموں میں آغا حشر کاشمیری کے تراجم کے علاوہ بھی اردو ڈرامہ نگاری کی صنف میں بہترین اور کامیاب تراجم کئے گئے۔ان معروف ترجمہ نگاروں میں عابد علی عابد، عابد حسین، محمد عمر نور الہٰی، فضل الرحمٰن، سجاد ظہیر، انور عظیم ،مقبول حسن، منیب الرحمٰن ، سلیم شہزاد، مجنوں گورکھپوری، راجندر سنگھ بیدی، منٹو، شاہد احمد دہلوی وغیرہ اہم ہیں۔جنہوں نے یوروپ کے مشہور ادیبوں گوئٹے، مولیئر، آسکر وائلڈ، ٹالسٹائی، برناڈ شاہ، سوفو کیز، آرچر ڈ اور دوستوفسکی وغیرہ کے ڈراموں کے ترجمے کئے۔

اب اگر ان ادیبوں میں ہم خواتین ترجمہ نگار کی بات کریں تو وہ بھی اس میدان میں پیچھے نہیں۔جس طرح ناول، افسانہ، شاعری اور ڈرامہ کی صنف میں خواتین نے اہم کارنامے انجام دیے۔اسی طرح یہاں بھی وہ ابتدا ہی سے مردوں کے ساتھ نظر آتی ہیں۔ان خواتین ترجمہ نگاروں میں تو رضیہ سجاد ظہیر، صالحہ عابد حسین ،عصمت چغتائی اور قدسیہ زیدی، قرۃ العین حیدر، زاہدہ زیدی، ساجدہ زیدی اور الطاف فاطمہ کے نام نظر آتے

ہیں۔یوں تو اور بھی بہت سی خواتین ہیں جنہوں نے وقتاً فو قتاً ترجمہ نگاری کا کام انجام دیا لیکن یہاں ہم انہیں خواتین کوزاہدہ زیدی کی معاصرین کی حیثیت سے پیش کریں گے اور ترجمہ نگاری کے فن میں ان کی خدمات کے حوالے سے گفتگو کریں۔

ترجمہ نگار خواتین:

1۔رضیہ ظہیر۔

رضیہ سجاد ظہیر کا شمار بیسویں صدی کی ابتدائی افسانہ نگار، ناول نگار، خاکہ نگار اور مترجم نگار میں ہوتا ہے۔وہ اردو کی ایک اہم ادیبہ ہونے کے ساتھ ساتھ ترقی پسند تحریک کے معروف ومشہور بنیاد گزار اور سرگرم رکن سجاد ظہیر کی اہلیہ بھی ہیں۔انہوں نے اس دور میں آنکھ کھولی تھی جب لڑکیوں کا تعلیم حاصل کرنا تو دوران کا گھر سے باہر نکلنا بھی معیوب سمجھا جاتا تھا۔لیکن رضیہ سجاد ظہیر نے ایک علمی ع ادبی گھرانے میں پرورش پائی ۔ان کا خاندان نہ صرف تعلیم یافتہ تھا بلکہ وسیع النظر بھی تھا۔انہوں نے شادی سے پہلے ہی میٹرک، ایف۔اے اور بی۔اے پاس کرلیا تھا۔انہوں نے بہت سی چھوٹی چھوٹی کہانیاں مختلف رسالوں کے لیے لکھیں۔نذر سجاد حیدر، صالحہ عابد حسین اور عطیہ فیضی وغیرہ سے ان کے ادبی مراسم تھے۔ان خواتین کی طرح رضیہ سجاد نے بھی مختلف مضامین لکھے۔انہیں عورتوں سے خاص ہمدردی تھی۔وہ اس وقت کی عورتوں کی پست حالت اور ان کی ناخوندہ حالت سے بہت مایوس تھیں اور ان کی اصلاح کی خواہش مند تھیں اس کے لیے انہوں نے بہت سے مضامین لکھے اور عورتوں کی تعلیم کی حمایت اور پردہ کی سخت پابندی کی مخالفت بھی کی۔اسی دور میں انہوں نے افسانہ نگاری اور ناول نگاری کی طرف بھی توجہ دی۔ان کا پہلا انفسانوی مجموعہ ’’زرگلاب‘‘ ہے جو1981 میں شائع ہوا۔اس کے علاوہ ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ ’’اللہ دے بندہ لے1984‘‘ ہے۔ان کے افسانوں میں ایک طرف ہمیں عورت کی قربانی، مرد وعورت کے مثالی کردار اور مثالی محبت نظر آئے گی تو دوسری طرف اس وقت کے متوسط گھرانے کی زندگی میں پیش آنے والی روزمرہ کی بھی کہانیاں ملیں گی۔ان افسانوں میں ’’دوسرا نام، واردات، پت جھڑ میں پھول، دو دل ایک داستان، کہانی کی کہانی اور ایک کو بھی نہ نہیں، لاوارث، چنے کا ساگ، وہ شعلے‘‘ اہم ہیں۔

افسانوں کے علاوہ ان کا پہلا ناول ''سرشام، کانٹے اور سمن'' شامل ہیں۔ان کے افسانوں کی طرح ناول بھی متوسط طبقہ کی نمائندگی کرنے کے ساتھ طبقاتی کشمکش، سرمایہ دارانہ نظام کا زوال اور اس نظام کی زوال پذیر قدروں کا بیان ملتا ہے۔اردو کے علاوہ ضیہ سجاد ظہیر کو انگریزی سے بھی خاص الگاؤ تھا۔ان کے والد کو انگریزی ادب سے گہری وابستگی تھی انہیں سے متاثر ہوکر رضیہ سجاد نے بھی انگریزی شعروادب کا مطالعہ کیا۔اور keat اور shelly کا کافی مطالعہ کیا۔ساتھ ہی مذہبی کتابوں سے بھی ان کی گہری وابستگی تھی۔خاص کر واقعات کربلا، امام حسین اور ان کے اصحاب سے عقیدت مندی ان کے خاندان میں بہت پہلے سے چلی آرہی تھی۔رضیہ سجاد پر بھی انہیں تمام چیزوں کا اثر پڑا۔اور ان کی آنے والی زندگی بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔

ان کے علمی خدمات کا کسی قدر مختصر جائزہ لینے کے بعد ہم یہاں ان کی ترجمہ نگاری کے حوالے سے گفتگو کریں گے۔رضیہ سجاد نے نہ صرف اردو میں مختلف کہانیاں، مضامین، افسانے اور ناول لکھے بلکہ مختلف زبانوں کی کہانیوں کا اردو میں ترجمہ بھی کیا۔انہوں نے روسی، جرمن، بنگالی اور ہندی کہانیوں کے ترجمہ کی طرف خاص توجہ کی۔اور پشکن، چیخوف، ٹالسٹائی، شولوخوف، سیمونوف، سیارام گپت، امرت لال ناگر، بھگوتی چرن ورما، ملک راج آنند اور میکسم گورکی وغیرہ کے افسانوں کے ترجمے شامل ہیں۔ان ترجموں کی فہرست درج ذیل ہے:

روسی افسانوں میں ''بچپن، منزل کی تلاش (میکسم گورکی)، گیلیلیو (بریخت)، بہنیں (اسقد مختار)، انسان کا عروج (ایم۔ایلین۔وائی سگال)، الوداع گلسری جمیلہ (چنگیز ایموی)، لینن کی یادیں (یکابہ)، جرمن زبان کا پھول اور سموم (برونو اتپیس)، انگریزی زبان کا قلی، سات سال (ملک راج آنند)، اکبر (لارنس بنسین)، ہندی کا مٹی بنتی تصویریں، گورکی کی سوانح حیات (بھگوتی چرن ورما)، عورت (سیارام سرن گپت)، دلدل (بھٹا چاریہ)، بوند اور سمندر (امرت لال ناگر)، آسامی سے گنگا چیل کے پنکھ (لکشمی نندن بورا) وغیرہ شامل ہیں۔

ان تراجم میں رضیہ سجاد نے ہندی زبان سے تو براہ راست ترجمہ کیا ہے۔لیکن باقی زبانوں سے براہ راست کی بجائے انگریزی زبان کے توسط سے ترجمہ کیا ہے۔ہندی زبان چونکہ ہندوستانی زبان ہے اور اسے

پڑھنے یا سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی کیونکہ یہاں بھی ہندوستانی زندگی کے مسائل اور عام لوگوں کی زندگی کو پیش کیا گیا ہے۔ اردو اور ہندی زبان میں جو مشترک خصوصیات ہیں ان کی بنا پر بھی ہندی کہانیوں میں پیش کئے گئے خیالات کو با آسانی سمجھا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رضیہ سجاد ظہیر کے ہندی سے اردو میں کئے گئے تراجم میں زیادہ دلکشی اور فطری پن نظر آتا ہے۔ بلکہ ان ترجموں میں انہوں نے زبان و بیان سے جو دلکشی پیدا کی ہے اس سے وہ انہیں کی تخلیقات معلوم ہوتی ہیں۔ جس کی بہترین مثال سیا رام چرن گپت کا ناول ''ناری'' ہے جسے رضیہ سجاد نے اردو میں ''عورت'' کے نام سے ترجمہ کیا ہے۔ اس ناول میں ایک عورت کی عملی زندگی اور اس کی نفسیات کو جس فطری انداز میں بیان کیا گیا ہے اس پس منظر سے عورت کی مکمل تصویر سامنے ابھرنے لگتی ہے۔ اسی طرح ہندی کے بہت سے سماجی، معاشرتی، معاشی، مذہبی رسم و عقائد اور عام لوگوں کی زندگی کے مسائل سے متعلق کہانیوں کو جس نداز سے ترجمہ کیا گیا ہے وہ بہت حقیقی معلوم ہوتا ہے۔ اور ان کی فنی خصوصیات کردار، پلاٹ اور منظر اور زبان و بیان میں بھی کسی طرح کا کوئی ڈھیلا پن نہیں۔ بلکہ ان تمام فنی لوازمات کا انہوں نے خاص خیال رکھا ہے۔ اور یہی ان کے ہندی تراجم کی کامیابی کی ضمانت بھی ہے کہ انہوں نے اصل مصنف کے کسی خیال کو مجروح نہیں ہونے دیا۔ ان کے دوسری زبانوں کے تراجم مثلاً انگریزی، روسی اور جرمن کے بارے میں بھی یہ بات کہی جاسکتی ہے۔ انگریزی ادب کا تو انہوں نے خود ہی بہت گہرائی سے مطالعہ کیا تھا جس کے باعث انہیں اس زبان میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی بلکہ اپنی فنکارانہ صلاحیت سے انہوں نے اس میں بھی وسعت پیدا کی۔ باقی زبانوں کا بھی انہوں نے انگریزی زبان کے توسط سے ترجمہ کیا جس کے باعث انہوں نے ان غیر ملکی زبانوں کے تراجم کو زر دوز بان کے قالب میں با آسانی ڈھال دیا۔ جس میں ان کی زبان کی صفائی، اس پر مضبوط گرفت اور لہجے کی نرمی کو بڑا دخل ہے۔ ان کے یہ تراجم اردو ترجمہ نگاری کے صنف میں ایک وسیع اور اہم اضافے کی اہمیت رکھتے ہیں۔

2۔قدسیہ زیدی۔

اردو ادب کی مشہور و معروف ادیبہ قدسیہ زیدی دہلی میں 1914 میں پیدا ہوئیں اور یہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ قدسیہ زیدی کی شادی سید بشیر حسن زیدی سے ہوئی تھی۔ جو اس وقت ریاست رامپور کے چیف منسٹر

تھے۔اس وجہ سے ان پر گھر اور خاندان کی بہت سی ذمہ داریاں تھیں۔شوہر کے ساتھ سرکاری کام سے لے کر مختلف تقریبوں میں شرکت و میزبانی تک ان پر کئی اہم کام ان کے ذمہ تھے۔ایسے ماحول میں ادب کا ذوق و شوق پیدا ہونا کوئی عام بات نہیں۔انہوں نے نہ صرف اردو ادب کا مطالعہ کیا بلکہ انگریزی ادب میں مہارت حاصل کی۔انہیں انگریزی ڈرامے سے خاص لگاؤ تھا۔اور انگریزی کے کم و بیش سبھی ڈراموں کا انہوں نے مطالعہ کیا۔خاص کر بچوں کی انگریزی کتابوں کو انہوں بہت توجہ سے پڑھا اور پھر ان کے اندر یہ لگن پیدا ہوئی کہ وہ بھی بچوں کے لیے انگریزی کتابوں کی طرز پر اردو میں کتابیں لکھی ہیں وہ جانتی تھیں کہ بچوں کے لکھنا آسان کام نہیں کیوں کہ بچوں کی عمر اور ذہن کو سامنے رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے اسی لیے بچوں کے لیے انہوں نے ان کتابوں کو بہت ہی آسان، رواں اور سلیس اور سادہ اردو میں لکھنا کرنا شروع کر دیا۔

بچوں کے لیے لکھی گئی کتابوں میں ان کی پہلی کتاب ''البیلی بچھیا'' ہے۔اس کے بعد انہوں نے ''گاندھی بابا کی کہانی''، لکھی۔ان کتابوں کی فہرست میں اور بھی کتابیں شامل ہیں جن میں ان تھک جاں، بھن بھن بانو، جانباز سپاہی، بن کے باسی، گلابو چوہیا اور غبارے، سرخ جوتے، بجو بھیا کی عقل مندی، گلابو چوہیا اور پری زاد، جنگل میں شیر، انوکھی دکان اور منی مانو ہیں۔ان کتابوں کو انہوں نے خوبصورت تصویروں کے ساتھ شائع کروایا۔انہیں آرٹ، تصویروں اور گڑیوں کی نمائش کا بھی شوق تھا۔اور مشہور آرٹسٹ ''شنکر زویکلی'' کے ساتھ مل کر بچوں کے بین الاقوامی تصویری مقابلے کو سالانہ فیچر بنا دیا۔جب کہ بچوں کے لیے لکھے گئے ڈراموں میں ''شیر دادا'' اور ''روگی لومڑی'' وغیرہ شامل ہیں۔

بچوں کے ادب کے علاوہ قدسیہ زیدی کا رجحان ہندوستانی ڈرامہ اور تھیٹر کی طرف تھا۔ڈرامہ کی صنف سے انہیں گہرا شغف تھا انہوں نے نہ صرف اردو بلکہ ہندی، سنسکرت اور انگریزی کے ڈراموں کو خوب پڑھا اور ان کا ترجمہ کر کے انہیں اسٹیج بھی کیا۔انہوں نے خود تو کوئی ڈرامہ تخلیق نہیں کیا لیکن دوسری زبانوں کے ڈرامے اردو اور ہندوستانی زبان میں ترجمہ کیے اور جس لگن اور شوق کے ساتھ اس کام میں مصروف رہیں شاید کوئی تخلیق کا بھی نہ رہتا۔ان کے ترجمہ کیے ہوئے ان ڈراموں میں ''آزر کا خواب: برنارڈ شا

خالد کی خالہ: چارلیز آنٹ پر مبنی ڈرامہ

گڑیا گھر: ابسن کے ڈالز ہاؤس کا ترجمہ

جان ہار: ڈرامہ

شکنتلا: کالی داس کے سنسکرت ڈرامے کا ہندوستانی میں ترجمہ

مٹی کی گاڑی: (شودرک کے مرچھ کٹک کا ہندوستانی میں ترجمہ

مدرا راکشش: کا ہندوستانی میں ترجمہ

سفید کنڈلی: برٹش کے کوکیشیسن چاک سرکل کا اردو ترجمہ

امبر پالی: مہاتما بدھ کے زمانے کی مشہور دستان کا ترجمہ

چچا چھکن کے ڈرامے اور چچھا چھکن کے کارنامے وغیرہ کو ترجمہ کیا۔

قدسیہ زیدی نے ہندوستانی تھیٹر کو حیات نو بخشی۔ اور اس کے لیے انہوں نے ''ہندوستانی تھیٹر'' قائم کیا۔ اپنے اس مقصدر کے حصول کے لیے انہوں نے انتھک محنت کی۔ بہت سی مخالفتوں کو بھی برداشت کیا۔ اپنے عیش وعشرت کو ترک کیا اور پوری جدو جہد کے ساتھ اس کام میں لگی رہیں۔ انہوں نے جتنے بھی غیر ملکی ڈرامے ترجمہ اور اسٹیج کئے ان میں اندھی تقلید کے بجائے قدسیہ زیدی نے ان کو ہندوستانی فضا اور ہندوستانی روایات میں ڈھال کر اسٹیج کیا کیوں کہ وہ جانتی تھیں کہ مغرب کی اندھی تقلید مضر ثابت ہوسکتی ہے۔ اور اس کام کے لیے انہوں نے اپنی بے پناہ ذہنی صلاحیت اور حوصلہ مندی سے کام لیا اورس کام میں کامیابی حاصل کی۔ ان کے یہ تراجم ان کی صرف دوسری زبانوں کا ترجمہ نہیں بلکہ ان کی محنت وریاضت اور ان کی ذہنی فکر کا ثبوت ہیں۔

3۔ قرۃ العین حیدر۔

قرۃ العین حیدر اردو ادب کی ایک عظیم افسانہ نگار، ناول نگار، رپوتاژ نگار اور خاکہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مترجم کی حیثیت سے بھی معروف ہیں۔ ترجمہ نگاری کی اس صنف میں انہوں نے ادب اطفال کی طرف خاص کر توجہ دی۔ اور بچوں کے لیے بہت سی روسی کہانیوں کو اردو میں منتقل کیا۔ ان کے ناول ''جن حسن بن عبدالرحمن'' کو ادب اطفال کے سائنسی فکشن میں اہمیت حاصل ہے۔ انہیں مشرقی اور مغربی دونوں ادب پر دسترس حاصل تھی۔ لیکن انہوں نے جو کہانیاں بچوں کے لیے ترجمہ کی ہیں ان میں زیادہ روسی کہانیاں

شامل ہیں۔

ماں کی کھیتی۔(Mother earth) چنگیز اعتما توف کی کہانی کا ترجمہ ہے۔چنگیز اعتما توف روسی ادیب،صحافی اور سیادت داں تھا۔اس کی ادبی شناخت اس کی تصنیف ’’Tales of the mountain and steppers‘‘(1963)سے ہوئی۔ادب کے علاوہ اسے سیاست میں بھی دلچسپی تھی۔اس نے متعدد افسانے اور ناول لکھے جن میں The Girl With The Red scarf ،A Difficult passage,Jamila,The first Teacher,The Day lasts More Than a Hundred years اور White Steamboat شامل ہیں۔

’’یودوکیہ‘‘ ویراپانووا کی کہانیوں کا ترجمہ ہے۔ایک روسی عورت اور اس کے پانچ بچوں پر مشتمل کنبے کی کہانی ہے۔جو 1959 میں شائع ہوئی۔ویراپانووا ایک روسی ناول نگار،افسانہ نگار، ڈرامہ نگار اور صحافی تھا۔اس نے پہلے ایک صحافی کی حیثیت سے کام کیا۔اس کی پہلی کہانی جس کا ذکر قرۃ العین حیدر نے اپنے ترجمے ’’یودوکیہ‘‘ کے پیش لفظ میں کیا ہے۔وہ The Pirozkhovs ہے۔جو ایک مزدور خاندان پر مشتمل ہے۔اس کی باقاعدہ ادبی زندگی کا آغاز اس کی کتاب companions سے ہوتا ہے۔اس میں ہاسپٹل ٹرین میں کام کرنے والوں کی بہادری اور جرات کو دکھایا گیا ہے جو زخمیوں کو جنگ کے میدان سے عقب کی طرف لے جاتے ہیں۔اس کے تین ناول companions,Kruzhilikha,The Bright ,Shore اسٹیٹ ایوارڈ ملا۔جب کہ ناول Seryozha پر بنی فلم کو فلم کا سب سے بڑا اوارڈ مل چکا ہے۔ان کے علاوہ Seoson of Valya,Volodya,the year اس کی کہانیوں اور ڈراموں پر مشتمل ہیں۔

’’ڈنگو(ارفریر مین)،لوڑی کے بچے ،میاں ڈھینچو کے بچے،شیر خاں،ہرن کے بچے اور بہادر (او،پیروفسکا)،خیالی پلاؤ(وی میدویدیف)وغیرہ۔متآخرالذکر پیروفسکا کی ان کتابوں کے بارے میں ڈاکٹر خوشحال زیدی رقم طراز ہیں:

> ان کتاب میں جانوروں کے بچوں کا حال کچھ اس انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ آپ سب کو کہانی سے زیادہ مزہ آئے گا۔یہ بچے جانوروں کے بچے ہیں لیکن انہیں بھی آپ کی طرح کھیل کود کا شوق ہے۔آپ ہی کی طرح شرارتیں

کرتے ہیں۔آپس میں چہلیں بھی کرتے ہیں۔لڑتے بھڑتے بھی ہیں۔یہ سب باتیں مصنف نے بہت انوکھے اور اچھوتے انداز میں بتائی ہیں۔یہ کتابیں پڑھ کر آپ کو خود اندازہ ہوجائے گا کہ محترمہ کتنی آسان،صاف ستھری،کتنی لوچ دار اور میٹھی زبان لکھتی ہیں۔1؎

اس قول سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ قرۃالعین حیدر نے ان کہانیوں کو کس خوش اسلوبی سے زردو زبان میں منتقل کیا ہوگا۔انہیں ترجمہ نگاری کا بے حد شغف تھا۔ان کے اسی شوق نے ان کے فن کو دلکشی عطا کی۔ان کا انداز ایسا بے ساختہ اور رواں ہے کہ ترجمے کا احساس نہیں ہوتا۔بلکہ یہ ساری کہانیاں قرۃالعین حیدر کی طبع زاد معلوم ہوتی ہیں۔

4۔صالحہ عبد حسین۔

صالحہ عابد حسین مولانا الطاف حسین حالی کے خاندان میں ان کی پوتی کے گھر 1913 میں پیدا ہوئیں۔ان کا نام مصداق فاطمہ رکھا گیا۔وہ ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوئی تھیں جنہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کو جدید تعلیم سے روشناس کیا۔نہ صرف مردوں کو بلکہ خواتین کی تعلیم کی حمایت کی اور ان کے لیے اسکول بھی کھولے۔والد خواجہ غلام الثقلین مولانا حالی کی بھانجی کے بیٹے تھے۔جنہوں نے علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی۔بلکہ ان کے خاندان کے بیشتر مردوں نے علی گڑھ میں ہی تعلیم پائی۔ایسے علمی و ادبی گھرانے میں صالحہ عابد حسین کی پیدائش اس بات کا اشارہ تھی کہ انہیں تعلیم کا شوق ورثہ میں ملا تھا۔

صالحہ عابد نے ذہانت بھی غضب کی پائی تھی۔ابتداء میں انہوں نے مختلف رسائل عصمت،سہیلی،نور جہاں اور تہذیب جو خواتین میں چھوٹے چھوٹے مضامین لکھنے شروع کئے جنہیں کبھی بنت خواجہ غلام الثقلین اور کبھی بہن خواجہ غلام السیدین کے نام سے شائع کرواتیں۔ان کی کا پہلا مضمون ''اماں کے بغیر'' ہے۔جو انہوں نے اپنی ماں کے انتقال کے بعد لکھا۔جب کہ وہ صرف چودہ برس کی تھی۔جب غلام السیدین ٹریننگ کالج میں پروفیسر ہوئے تو یہ لوگ علی گڑھ منتقل ہوگئے۔وہاں صالحہ عابد حسین نے علی گڑھ گرلز کالج میں داخلہ لیا۔اور یہیں انہوں نے اپنا نام مصداق سے صالحہ کرلیا۔اس کے علاوہ انہوں نے پنجاب اسکول سے بھی تعلیم پائی۔انہوں نے اردو،فارسی اور انگریزی کے علاوہ تاریخ و مذہب کا بھی مطالعہ کیا۔

ان کی شادی اردو کے معروف ادیب وڈرامہ نگار سید عابد حسین سے ہوئی۔شادی کے بعد بھی انہوں نے اپنی تعلیم جاری رکھی اور فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ان کی تعلیم سرگرمیاں ان کے شوہر اور بھائی غلام السیدین کی بدولت تھیں۔انگریزی کی بہت سی کتابوں کا انہوں نے مطالعہ کیا تھا۔ان کی پہلی کہانی 1928 میں رسالہ ''نور جہاں'' میں ''لمبی ڈاڑھی والا بوڑا پوپ'' کے نام سے شائع ہوئی۔جو ایک انگریزی کہانی سے متاثر ہوکر لکھی گئی تھی۔

صالحہ عابد حسین کے تقریباً 8 ناول،5 افسانوی مجموعے،4 سوانح،3 ڈراموں کے مجموعے اور 7 بچوں کے لیے لکھی گئی اور درجنوں ترجمہ کی ہوئی کتابیں،ریڈیائی ڈرامے اور فیچر شامل ہیں۔ان کے ناولوں میں پہلا ناول ''حسن اتفاق'' ہے جو شائع نہیں ہوا تھا۔اس کے بعد ''عذرا'' آتش خاموش،قطرے سے گہر ہونے تک،راہ عمل،یادوں کے چراغ،اپنی اپنی صلیب،الجھی ڈور اور ساتواں آنگن'' ہیں۔نقش اوّل،نراس میں آس،لونگے،درودرما اور ساز ہستی ان کے افسانے ہیں۔تنقیدی مضامین ''انتخاب مراثی،خواتین کربلا کلام انیس کے آئینہ میں،ادبی جھلکیاں،بات چیت،اورانیس سے تعارف'' ہیں۔

جہاں تک ڈراموں کا تعلق ہے ان کے ڈراموں میں ''زندگی کے کھیل،عفت،امتحان،بنیادی حق،حالی جھلک،بڑے میاں،آنکھ کا ڈاکٹر،ایک پیسہ،تارہ،رومانی شادی وغیرہ ہیں۔ان کا بہت سا ریڈیائی فیچر اور ریڈیائی تقاریر پر مشتمل ذخیرہ موجود ہے۔جو ''بات چیت'' کے عنوان سے شائع بھی ہو چکے ہیں۔اس میں ''میں نے لکھنا کیسے سیکھا،استانی،عورت کے فرائض،موجودہ عہد،تیمارداری،بدمزاج بیوی،میل جول اور ہمارا اخلاق'' وغیرہ کئی مضامین شامل ہیں۔

اس کے علاوہ حالی کی سوانح ''یادگار حالی'' کے نام سے لکھی۔انہوں نے خود اپنی بھی خودنوشت سوانح ''سلسلہ روز وشب'' کے نام لکھی۔اور ایک سفر نامہ ''سفر زندگی کے لیے سوز وساز'' اور دو سوانحی خاکے ''جانے والوں کی یاد آتی ہے،بزم دانشوراں'' تخلیق کیے۔جب کہ مذہبی مضامین ''سلک گہر'' کے نام سے لکھے۔

انہوں نے کچھ کتابیں جرمن زبان اور دوسری ہندوستانی زبانوں سے ترجمہ کی تھیں۔اوران کی کتاب ''انیس کے مراثی کا انتخاب'' اور ''مہا کوی انیس'' ہندی میں ترجمہ ہوئی تھیں۔بچوں کے لیے لکھی گئی ان کی

کہانیوں میں ''بہادرسند، بھولی، جادو کا ہرن ،سندر چنار'' وغیرہ ہیں۔

صالحہ عابد حسین کے موضوعات متوسط طبقہ کی زندگی ،قومی یکجہتی، پرانی تہذیب واقدار کا زوال،تعلیم ،سیاست، مسلم معاشرے کی اصلاح، ہندوستانی معاشرہ میں عورت کی حالت اورعورت کےحقوق کی حمایت ان کی تخلیقات کے اہم موضوع ہیں۔ وہ انسانی رشتوں کو زیادہ اہمیت دیتی ہیں۔ اسی طرح ان کی بچوں کے لیے لکھی گئی کتابوں میں آپسی محبت، انسانی دوستی اور بھائی چارہ وغیرہ کے موضوعات ملتے ہیں۔ ان کی زبان سلیس ،رواں اورصاف ستھری روزمرہ کی عام بول چال کی زبان تھی۔ یہ مختصر جائزہ صالحہ عابد حسین کی ادبی خدمات کا اندازہ کرنے کے لیے اگرچہ ناکافی ہے پھر بھی ہم ان تخلیقات کی روشنی میں ان کی ادبی خدمات کا کسی قدر اعتراف کرسکتے۔

5۔ساجدہ زیدی۔

ساجدہ زیدی 1927 میں علی گڑھ میں پیدا ہوئیں۔ ساجدہ زیدی، زاہدہ زیدی کی بڑی بہن تھیں۔ لہذا ساجدہ زیدی کا تعلق بھی علمی وادبی گھرانے سے تھا۔ زاہدہ زیدی کی شادی اگرچہ بہت چھوٹی عمر میں ہوگئی تھی لیکن انہوں نے سلسلہ تعلیم جاری رکھا۔ شادی کے بعد ہی انہوں نے بی۔ ایڈ اور ایم۔ ایڈ فرسٹ کلاس میں پاس کیا۔ اور پھر 1955 میں علی گڑھ کے ایجوکیشن ڈیپارٹ منٹ میں لکچرر ہوگئیں۔ اس کے بعد 19964 میں تعلیم کی غرض سے لندن گئیں اور وہاں سے تخلیق کی نفسیات میں ایم۔ فل ریسرچ کی ڈگری حاصل کی۔

ساجدہ زیدی نے نہ صرف ادبی بلکہ مختلف قسم کی غیر ادبی خدمات بھی انجام دیں۔ وہ یو۔ جی۔ سی اور این۔ سی۔ آر ٹی اداروں سے بھی وابستہ رہیں۔ انہوں نے مختلف ممالک انگلستان، امریکہ جرمنی، ہالینڈ، سویڈن، کینیا، آسٹریلیا، سوویت یونین اور عرب وغیرہ کا سفر کیا۔ ان کا مشاہدہ ومطالعہ اور تجربات وسیع تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ساجدہ زیدی نے ادب کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی۔ ان کے شعری مجموعے ''جوئے نغمہ، سیل وجود، آتش سیال، پردہ ہے ساز کا'' ہیں۔ طبع زاد ڈراموں کا مجموعہ ''سرحد کوئی نہیں (منظوم)''۔ ''چاروں طرف موسم'' ڈرامے، ترجمے وماخوذ۔ ناول ''موج ہوا پیچاں، مٹی کے حرم''۔ ''تلاش بصیرت اور گزرگاہ خیال'' تنقیدی مضامین کا مجموعہ اور نفسیات پر لکھی گئی کتابوں میں ''شخصیت کے نظریات'' انسانی شخصیت کے

اسرار ورموز، key issue on educatin اور changing perspective on creativity
ہے۔ساجدہ زیدی کی ان تخلیقات کے علاوہ ان کی خودنوشت سوانح ''نوائے زندگی'' کے نام سے ہے۔

ہم یہاں ساجدہ زیدی کی دوسری تخلیقات کا جائزہ لینے کے بجائے اپنی توجہ زاہدہ زیدی کے عہد کے مترجم نگار کی حیثیت سے کریں گے۔ جو اس Chapter کا مرکز ہے۔کیوں کہ یہاں دوسری تخلیقات کی تفصیل کی گنجائش نہیں۔جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے کہان کے ''چاروں طرف موسم'' ڈرامے، تراجم وماخوذ کا مجموعہ ہے۔جس میں تین مغربی ڈراموں کے ترجمے شامل ہیں۔جن میں دو تراجم ''گہرا نیلا سمندر (ٹیرنس ریمیگن)''اور''چاروں موسم (آرنلڈ ویسکر) انگلش ڈراموں کے ترجمے ہیں۔اور ایک ''ممتا کی آگ (لورکا)'' کا تعلق اسپینی ڈرامے سے ہے۔یہ لورکا کے ڈرامے ''یارما'' کا ترجمہ ہے۔اس ڈرامے میں سماجی حقیقتوں،انسانی رشتوں اور نفسیاتی دروں بینی کے امتزاج سے پیدا شدہ حسین امتزاج کو دکھایا گیا ہے۔ جس عورت کی اس نفسیاتی کرب کو بیان کیا ہے جو اسے لاولد ہونے پر ہوتا ہے۔کیوں کہ اولاد پیدا کرنے کی خواہش عورت کی فطری خواہش ہے۔جو اس کے وجود کو تکمیلیت عطا کرتی ہے۔اس ڈرامے میں عورت کے اسی لاولد ہونے کے کرب کو بغاوتی انداز اختیار کرتے ہوئے دکھایا ہے۔جسے ساجدہ زیدی نے زمان ومکان کی قیود سے آزاد کر کے ہندوستانی ماحول وسماج میں ڈھال دیا ہے۔لیکن اصل ڈرامے کے خیالات میں کسی طرح کی کوئی کمی نہیں کی یہی ایک اچھے مترجم کی پہچان بھی ہے۔

جب کہ اول الذکر ریمیگن اور ویسکر کے ڈرامے علامتی انداز کے ہیں جس میں زندگی گزارنے کے فلسفیانہ تصورات،خواہشات عدم تکمیلیت ،مرد وعورت کی محبت اور ان کی نفسیاتی الجھنوں اور پیچیدگیوں کا احاطہ کیا ہے۔ساجدہ زیدی بھی ڈرامے خاص کر مغربی ڈرامے سے زاہدہ زیدی کی طرح گہرے طور پر متاثر تھیں۔انہیں مغربی ڈرامے کا بہت شوق تھا۔مغربی ڈرامے میں ان کا مطالعہ انگریزی،روسی، اسپینش ،اطالوی،فرانسیسی ،جرمن، یونانی اور امریکی ڈراموں میں رہا ہے۔ ان کے اس قدر گہرے مغربی مطالعہ سے ہم ان کی غیر معمولی عملیت کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ جس کے نتیجے میں انہوں نے نہ صرف ڈرامے خود تخلیق کیے۔ان کی زبان اگر چہ بول چال اور روزمرہ کی زبان نہیں بلکہ ان کی علمیت کا مظہر اور مغرب سے ان

کی وابستگی کی وجہ سے ہے۔جس میں انگریزی کا الفاظ کی بھی کافی کثرت نظر آتی ہے۔ پھر بھی ان کے ترجمے اس قدر بھی مشکل نہیں کہ ان کو سمجھنا دشوار ہو بلکہ انہوں نے ان ڈراموں کو ہندوستانی ماحول وفضا میں بھی ڈھال دیا ہے مگر اصل ڈرامے کے خیالات میں کسی طرح حقیقت سے دور نہیں گئیں بلکہ ان کے مغربی ڈراموں کے تراجم نے اردو ترجمہ کی صنف میں بھی وسعت و گہرائی پیدا کی۔

اگر ساجدہ زیدی کے طبع زاد ڈراموں کی بات کی جائے ۔تو ان کے ڈراموں کا مجموعہ ''سرحد کوئی نہیں'' ہے۔جو 1991 میں زیر اشاعت آیا۔اس میں کل تین ڈرامے شامل ہیں۔ایک ''سرحد کوئی نہیں'' جو کہ ایک منظوم ڈرامہ ہے۔جو چار ایکٹ پر، مشتمل ہے۔اور جس میں صرف دو لوگوں کی ہم کلامی پیش کیا گیا ہے۔وہ ہے ایک مرد اور عورت۔ بظاہر یہ ڈرامہ مرد وعورت کی محبت اور عشق کی مختلف کیفیات کی تصویر کشی کرتا ہے۔لیکن حقیقت میں اس ڈرامے کو وجودی المیہ کہا جاتا ہے۔جس میں تقدیر کی ناسازگاریوں، دو محبت کرنے والوں کی جدائی اور ان کی نفسیاتی و ذہنی کشمکش کا احاطہ کرتا ہے۔اس کے کردار زہرہ اور گوتم ہیں۔دونوں ایک دوسرے سے بے انتہا محبت کرتے ہیں۔لیکن گوتم ،زہرہ کا ہاتھ چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔مگر جب وہ ڈھائی سال بعد واپس آتا ہے تو زہرہ اس سے کہتی ہے کہ وہ وقت اب گزر چکا ہے۔اور اب اس کے جذبات میں ٹھہراؤ اور زندگی کی سفاکیوں سے صلح کرنے کا حاصلہ آچکا ہے۔اس میں عورت کی قربانی اور اس کے عظمت کی بھی تصویر کشی ہے۔ پورا ڈرامہ آزاد نظم کے فورم میں ہے۔شروع سے آخر تک بحر بھی ایک ہے لیکن تغزل اور نغمگی اسی طرح برقرار ہے۔اور زبان کی بے پناہ شگفتگی کے ساتھ اختتام کو پہنچ پذیر ہوتا ہے۔

اس مجموعے کا دوسرا ڈرامہ ''حسرت تعمیر'' ہے۔ یہ ڈرامہ ساجدہ زیدی نے مشترکہ طور پر صفدر علی جعفری کے ساتھ مل کر پورا کیا۔اس ڈرامے میں بھی مرد عورت کے نازک رشتے ،ان کے درمیان مبہم فرق اور ان کت تعلقات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔جو ریحانہ اور منصور کی کہانی ہے۔جو رشتہ ازدواج میں منسلک ہیں اور ایک دوسرے سے محبت بھی کرتے ہیں۔لیکن دونوں کو محبت کے روکھے پن سے بیزار اور تشنہ ہیں۔

تیسرا ڈرامہ ''مجھے ڈرائیونگ سکھا دو'' ہے۔ یہ ڈرامہ بھی میاں بیوی کی محبت پر مشتمل ایک ایکٹ کا ڈرامہ ہے۔ان میاں بیوی کی عجیب محبت ہے جو ایک لمحہ کے لیے بھی ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے اور ہر

وقت ایک دوسرے پر سوار رہتے ہیں۔لیکن دونوں ایک دوسرے پر طرح طرح کے جملے ،فقرے اور بحث و تکرار بھی کرتے رہتے ہیں۔ان کی یہ بحث وتکرار بڑے مزاحیہ اورطنزیہ انداز میں ہے۔اس ڈرامے میں ساجدہ زیدی نے ابسرڈ ڈرامے کی نشاندہی بھی کی ہے۔

دراصل ان کے ان تینوں ڈراموں میں ایک طرح کی مماثلت پائی جاتی ہے۔تینوں ڈرامے مرد وعورت کی محبت اوران کے رشتے پر منحصر ہیں۔دراصل ساجدہ زیدی نے ان ڈراموں کے ذریعہ مردوعورت کی محبت کے ساتھ اس کے رشتوں کی پیچیدگیوں ،ان کے رشتے کی کھوکھلی بنیاد،ان کی نفسیاتی وذہنی الجھنوں کو بھی پیش کیا ہے۔

ان ڈراموں میں ساجدہ زیدی نے نئے تجربے کیے ہیں۔انہیں ڈرامے کی صنف سے گہری دلچسپی تھی۔ان کے زیادہ تر ڈرامے مغرب سے متاثر ہوکر لکھے گیے ہیں اوراس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے نہ صرف مغربی ادب کا مطالعہ کیا تھا۔بلکہ لندن میں ایم۔فل کی تعلیم بھی حاصل کی تھی۔جہاں انہوں نے مغربی ڈراموں کا مشاہدہ کیا اور بہت سے ڈرامے اسٹیج ہوتے ہوئے بھی دیکھے۔اس کے علاوہ انہوں نے یوروپ کے مختلف مما لک کا سفر بھی کیا تھا جہاں انہوں نے وہاں کے ماحول اورطرز زندگی اورتہذیب وکلچر کواپنی آنکھوں سے بھی دیکھا۔اوروہ اس سے متاثر بھی ہوئیں۔اور پھرانہوں نے مغربی ڈرامے کے طرز پر اردو میں ڈرامے تخلیق کیے ۔ان کے یہ ڈرامے زندگی کی کشمکش اورانسان کے وجود کے اس المیہ کی عکاسی کرتے ہیں۔جواپنے دامن میں آفاقی حقیقتوں کو بھی سمیٹے ہوئے ہیں۔

6۔الطاف فاطمہ۔

الطاف فاطمہ پاکستان کی مشہورومعروف ناول نگار،افسانہ نگار،نقاد،محقق اور مترجم ہیں۔ان کی پیدائش 1927 لکھنؤ میں ہوئی۔لیکن تقسیم ہند کے وقت وہ پاکستان چلی گئی تھیں۔وہاں انہوں نے درس وتدریس کو اپنا شعار بنایا اور لاہور کے اسلامیہ گرلز 1987 میں ریٹائر ہوئیں۔ان کے تخلیقی کارنامے اس وقت منظر عام پر آئے جب ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''شہپر'' منظر عام پر آیا جس میں 1945 کی جنگ ،شہادت اور قتل غارت کی تصویر کشی کی گئی تھی۔ان کا یہ افسانہ کافی مقبول ہوااوراس پر انہیں آدم جی ایوارڈ بھی دیا گیا۔دوسرے افسانوی مجموعوں

میں ''تارِعنکبوت''،جب دیواریں گرتی ہیں''،وہ جسے چاہا''،''دیدوادید'' شامل ہیں۔

اس کے بعد ان کی شہرت میں اضافہ کرنے والا ان کا ایک ناول ''دستک نہ دو'' ہے۔اسے عوام میں کافی مقبول ہوا۔''نشان منزل'' بھی ان کا بہترین ناول ہے۔جو مشرقی پاکستان کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔اسی طرح کا ایک اور ناول ''چلتا مسافر'' بھی بنگلادیش سے ہی متعلق ہے۔ان کے علاوہ ایک اور ناول ''خواب گر'' بھی منظر عام پر آچکا ہے۔جب کہ ''اردو میں فن سوانح نگاری اور اس کا ارتقاء'' ان کی تحقیق و تنقیدی نظریات پر مشتمل ہے۔

افسانوں اور ناولوں کے علاوہ انہوں نے پاکستانی ٹیلی ویژن کے لیے ڈرامے بھی لکھے۔اور تخلیقی کاموں کے علاوہ انہوں نے تراجم کے فن میں بھی کام کیا۔انہوں نے بہت سی کتابوں کا ترجمہ اردو میں کیا۔جن کی فہرست درج ذیل ہے۔

1۔سچ کہانیاں۔بنگالی،گجراتی،مراٹھی،تامل اور ہندی افسانے کے تراجم

2۔بڑے آدمی اور ان کے نظریے۔

3۔نغمے کا قتل۔ہارپلی

4۔جاپانی افسانہ نگار خواتین۔نوریکو میزوٹا لپٹ،کیوکوار بے سیلڈن

الطاف فاطمہ نے ایک طویل عمر پائی ان کا انتقال 2018 میں 91 سال کی عمر میں ہوا۔وہ اپنی ساری زندگی ادبی کاموں میں مشغول رہیں۔انہوں نے اردو ادب کی مختلف صنف میں ناقابل فراموش کارنامے چھوڑے ہیں۔جو ادب میں ان کی خدمات کا اعتراف کرنے کے لیے کافی ہیں۔

زاہدہ زیدی کی ترجمہ نگاری:

ترجمہ نگاری کی صنف، اس کے ارتقاء اور ترجمہ نگاروں کا جائزہ لینے کے بعد زاہدہ زیدی کے ترجموں کی طرف توجہ مبذول کریں تو ہمیں اندازہ ہوگا کہ زاہدہ زیدی نے بھی اس صنف میں اپنے گہرے اثرات چھوڑے ہیں۔ انہوں نے بیشتر مغربی ادب کے ڈراموں کا ترجمہ کیا ہے۔ چونکہ زاہدہ زیدی کو ڈرامے کی صنف سے خاص لگاؤ تھا۔ اور اس صنف میں بھی وہ مغربی ڈراموں سے زیادہ دلچسپی رکھتی تھیں۔

زاہدہ زیدی نے مغرب کے جن ڈرامہ نگاروں کے ڈراموں کا ترجمہ کیا ہے۔ ان میں چیخوف، رولوے، پراندیلو، سارتر، بکیٹ اور ایونیسکو کے ڈراموں کا گہرائی سے مطالعہ کیا اور پھر انہیں اردو میں منتقل کیا۔ ان کے تراجم کی فہرست درج ذیل ہے؛

1۔ مسدود راہیں

2۔ انتون چیخوف کے شاہکار ڈرامے

3۔ انصاف کا دائرہ

4۔ انسان اپنی تلاش میں

مسدود راہیں:

انیسوی صدی میں یورپ میں ایک فکری انقلاب رونما ہوا جسے نشاۃ الثانیہ کا دور بھی کہا جاتا ہے وہاں لوگ خیال آفریں باتوں کو چھوکر حقیقی زندگی کی طرف لوٹے اور زندگی میں پیش آنے والے تضادات کو قبول کیا اور امپیرزم کو خیر آباد کہ کر حقیقت کی تلاش میں نکلے اس دور میں لوگوں نے مختلف نظریات کو پیش کیا جیسے ڈارون نے حیاتی جبر کا، مارکس نے تاریخی عمل کی برتری کا، فرائڈ اور یونگ نے نفسیاتی پابندیوں کا نظریہ پیش کیا لیکن ان نظریات کی بنا پر انسان آزاد ہونے کے بجائے مزید پابندیوں میں گرفتار ہوگیا اور مادیت سے چھٹکارا پانے

کے بجائے بے کسی کے سمندر میں ڈوبتا گیا تب فنکار نے اس جبر کے خلاف بغاوت کی اور پھر بہت سے نظریات سامنے آئے اور جب سائنس جا بجا ترقی کی راہ ہموار کرتی چلی گئی تو روح آوارہ بھٹکتی رہی اسے سائنس کی دنیا میں کوئی دخل نہیں رہا تو فنکاروں نے باہری دنیا کو چھوڑ کر داخلی دنیا کی تلاش شروع کی اور انسان کی بنیادی جبلتوں اور منفی رجحانات میں اس کی کھوج کی جس سے ایک نئی روایت نے جنم لیا۔

اس کا نظریہ یہ تھا کہ زندگی میں کوئی نظم وضبط اور باقاعدگی نہیں ہے تو پھر فن میں کیوں اس کو تلاش کیا جائے اس لئے فنکار کو بھی فن میں کوئی نظم وظبط پیدا کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ فن بھی اتنا ہی بے ربط اور غیر منطقی ہونا چاہئے جتنی کہ زندگی ہے۔یہیں سے ابسرڈ ڈرامے کی بنیاد پڑی اور یوجین انیسکو نے اس کو آگے بڑھایا اس کا کہنا تھا کہ فنکار کا مقصد کوئی کہانی یا قصہ بیان کرنا نہیں ہے نہ یہ کہ زندگی کے دوسرے مسائل کو کس طرح حل کیا جاسکتا ہے بلکہ فنکار کا مقصد زندگی کی صحیح تصویر کشی کر دینا ہے وہ تصویر جو بہت ڈراؤنی اور خوفناک ہے جو ہمیں سمجھ نہیں آتی اس کو پیش کر کے بے کس اور مظلوم انسانوں کو اس کا سامنا کرنا اور اس سے لڑنے کے لیے آمادہ کرنا اور اسے خیالی دنیا کی جھوٹی تسلیوں سے نجات دلا کر اصل زندگی جینے اور اسے برداشت کرنے کے قابل بنانا ہے۔

ابسرڈ ڈرامہ میں گفتگو غیر منطقی ہوتی ہے ہر چیز گویا مشینی انداز میں کام کرتی نظر آتی ہے کوئی منطقی مفہوم نہیں ہوتا بات کہاں شروع ہوئی کہا ختم ہوئی کس بات کا کس سے تسلسل ہے اس کا صحیح اندازہ لگانا مشکل ہوتا حتی کہ کسی بات کا کوئی موقع محل بھی نہیں نظر آتا اگر یہ کہا جائے کہ نیم پاگل پن ابسرڈ ڈرامے کا موضوع ہے تو غلط نہ ہوگا۔

ابسرڈ ڈراما نگار زیادہ تر جلاوطن تھے جو پیرس میں رہتے تھے اور وہاں خود کو اجنبی محسوس کرتے تھے ان ادیبوں نے زندگی کو بھی اجنبیت سے دیکھا جس کے نتیجے میں درد و کرب شدید ہوتا گیا اس وجہ یہ بھی تھی کہ وہ جس ملک میں اپنی زندگی گزار رہے تھے وہاں کے مسائل کو بھی اجنبی اور غیروں کے مسائل سمجھتے تھے جس کے نتیجے میں ان کی ذات خواہ مخواہ ان مسائل کا نشانہ بنتی گئی جس کا انہیں بے انتہا دکھ ہوتا ہے اور ان مسائل کے درمیان وہ خود کو ایک مشین سمجھتا ہیں جسے بولنے کی اجازت نہیں بس کام کرتے رہنا ہے۔

انیسکو جس کو ابسرڈ ڈرامے کا بنیاد گزار کہا جاتا ہے اس کے ڈراموں میں بھی انسان ایک مشین میں

تبدیل نظر آتا ہے وہ بھی زندگی میں ہونے والی ذہنی کشمکش کو پیش کرتا ہے جس میں کبھی زندگی کی یہ کشمکش اجتماعی طور پر نظر آتی ہے تو کبھی انسان کی ذاتی الجھنوں میں اس کے علاوہ موجودہ عہد کی لوٹ کھسوٹ، لالچ، ظلم، ستم ظریفی، تعصب، جنگ اور موت کا خوف وغیرہ جیسے مسائل نے اس کے فن کو متاثر کیا۔ ابسرڈ ڈرامہ نگاروں نے اپنے کرداروں کو وسیع تر کائناتی تناظر میں پیش کیا ہے اس کے اجزاءِ ترکیبی بقول زاہدہ زیدی:

ابسرڈ ڈرامے کے اجزاءِ ترکیبی اظہاریت، سریلزم اور علامتی طرزِ اظہار ہیں جن کی معنی خیز آمیزش نے ڈرامے کے ایک ایسے اسلوب کو جنم دیا ہے جو گہرے اور گریز پا تجربات کو گرفت میں لانے اور معنوں کی تہیں کھولنے میں زیادہ صلاحیت رکھتا ہیا بسرڈ ڈرامے کے مخصوص اور تکراری موضوعات زندگی اور موت، تلاشِ ذات اور عرفان کائنات اور کائنات میں انسان کا مقام جیسے گہرے مسائل ہیں۔ جدید مغربی ڈرامے کے اہم رجحانات کے ساتھ عہد حاضر کے کچھ مخصوص اور پریشان کن مسائل مثلاً تنہائی، تشویش، کربِ ذات، منطق کی شکست، زبان کا استحصال اور ترسیل کی ناکامی کاالمیہ وغیرہ بھی ان ڈراموں کی ساخت میں پیوست ہیں۔

جدید مغربی ڈرامے کے کئی رجحانات سامنے آئے ہیں اور اس جدید مغربی ڈرامے میں بہت سی تحریکات کا بھی جنم ہوا جس میں حقیقت نگاری، نیچرلزم، سریلزم اور اظہاریت اس کے علاوہ یونانی دیومالا کی نئی تفہیم اور تشریح اور اس کے ذریعہ نئی بصیرتوں اور فلسفہ حیات کی تجسیم بھی اس جدید عہد میں پروان چڑھی لیکن جدید ڈرامے کی سب سے اہم تحریکیں ابسرڈ ڈراما اور ایپک تھیٹر، سٹیٹ واردات اور ڈوکیومینٹری وغیرہ ہیں۔'' 2؎

یہاں ہمیں مغربی ڈرامے کی اہم تحریک ابسرڈ ڈرامے سے بحث ہے جس کے روح رواں سیموئل بیکٹ، آرتھر اداموف، ژال ژینے، ہیرلڈ پینٹر، فرماند دوارابال، ایڈورڈ ڈ آلبی، مینول دی پیدرولو اور یوجین آئنیسکو ہیں۔ ابسرڈ ڈرامے کی تحریک بیسویں صدی کی اہم تحریک ہے جس نے مغربی ڈرامے میں ایک رونما تبدیلی کی اس ڈرامے کے ذریعہ فنکاروں نے انسان کے وجدانی اور داخلی سطحوں کو زیر بحث بنایا اور انہیں وسیع تر کائناتی تناظر میں پیش کیا اور اس میں زندگی کو نئی علامتی انداز میں پیش کیا اس میں المیہ اور طربیہ کی آمیزش ہوتی لیکن اس کا طربیہ انداز مضحکہ خیز نہیں ہوتا بلکہ زندگی کی حقیقی بصیرتوں کو سامنے لانا ہے اس تحریک کے علمبرداروں نے طربیہ انداز میں paradox (قول محال) irony (گہرے طنز) black humour (المناک

مزاح) کا سہارا لے کر زندگی کے تضادات اور پریشان کن سوالات کو پیش کیا۔ رضا علی عابدی لکھتے ہیں:

یہ ابسرڈ ڈرامہ ہے جس میں آدمی کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا، نہ وہ کچھ کہہ سکتا ہے، یہ وہ کیفیت ہے جو زندگی کے تضاد و تقاضوں سے پیدا ہوتی ہے اور ذہن کو مفلوج کر دیتی ہے سٹرنڈ سے آئنیسکو تک فن کی جدلیاتی نظریات کے فروغ کی کہانی ہے ایک طرف زندگی کا ولولہ ہے اور دوسری طرف موت کی ناگریزی، ایک طرف محبت اور دوسری طرف نفرت۔ ادھر بغاوت کے جذبات اور ساتھ ہی مجلسی فطرت اور دوسروں کے وجود سے گھبراہٹ بھی ہوتی ہے اور تنہائی کا خوف بھی۔ ایک طرف انسانی ذہن کی منطق ہے تو دوسری طرف زندگی کا غیر منطقی انداز۔ ٹھوس حقیقت سے بھی انکار نہیں اور واہمہ کی بھی اہمیت ہے جیتی جاگتی زندگی بھی اور خوابوں کی دنیا بھی۔ انسان کی حرکات وسکنات محدود ہیں مگر اس کا تخیل اور اس کی خواہشات محدود یوں دیکھنے میں دنیا کتنی شفاف ہے مگر سوچو تو کتنی اندھیری اگر آزادی کی خواہش ہے تو ساتھ ہی ساتھ اس محرومی کا دکھ جو دوسروں سے جدا ہو کر محسوس ہوتی ہے امید بھی اور خوف بھی۔ 3

یوجین آئنیسکو:

آئنیسکو 1909 میں رومانیہ میں پیدا ہوا تھا اس کا باپ رومانی اور ماں فرانسیسی تھی اپنی ابتدائی زندگی کا کچھ حصہ اس نے روم میں گزارا اس کے بعد اس نے فرانس میں مستقل سکونت اختیار کی وہ مہاجر تھا جس کی وجہ سے اس کے ادب میں بھی ایک خانماں مہاجر کے مسائل کی عکاسی ملتی ہے اس نے اپنی تخلیقات میں پوری دنیا کے مہاجروں کے دکھ درد ان کے ذہنی ونفسیاتی مسائل اور دوسرے وطن میں آنے والی مشکلات کو فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے اس نے لاشعور کو حقیقی تصورات کی طرح بیان کیا ہے۔

یوجین نے اپنی تخلیقی اور تھیٹر کی زندگی کا آغاز The Bald Sapnaro1948 سے کیا لیکن اس سے پہلے اس نے Hugoliade اور Note are NU لکھی۔ اس کی دوسری تخلیقات میں The Lesson1950,The Chairs1951,The killer,The New Tenan1953 Astroll in the Air,The Future is in Eggs 1951,Victim of Duty1952,Jacks or the Submission1950 French ہیں۔ لیکن اس کی شہرت The Bald Sapnaro سے ہوئی وہ Avant-GradeTheatre سے وابستہ تھا۔ اس نے مذکورہ والا ڈرامے (The Bald Soprano) میں

متوسط طبقہ کی زندگی کو مضحکہ خیز انداز میں پیش کیا ہے یہ ڈرامہ بے معنی لفظوں کا ایک کھیل ہے جہاں کچھ بھی منطق نہیں ہے اور یہی آئنیسکو کے ڈراموں کی خصوصیت ہے اس کے ڈراموں میں کردار مشینی انداز میں کام کرتے ہیں پورا ڈرامہ کوئی میکانکی حرکت معلوم ہوتا ہے جہاں ہر چیز مشین کی طرح کام کرتی نظر آتی ہے الفاظ و معنی کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی نہ کوئی بات حقیقی و منطقی ہوتی ہے۔ بقول رضا علی عابدی:

> آئنیسکو کے ڈرامے میں آدمی آدمی نہیں لگتے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کچھ مشینی کھلونوں کو کوک دے کر چلا دیا گیا ہے گفتگو میں کوئی منطق کوئی مفہوم نہیں نظر آتا۔ بات ہوتی ہے مگر پتہ نہیں لگتا کہ بات ہو رہے کہاں سے شروع ہوتی ہے اور کس طرف بڑھ جاتی ہے اور اس تمام گفتگو کا مطلب اور حاصل کیا ہے۔ 4

جبکہ آئنیسکو کے ڈراموں کے بارے میں زاہدہ زیدی کا خیال ہے؛

> ایونیسکو کے ڈراموں میں المیہ اور طربیہ عناصر ایک دوسرے میں پیوست ہیں اور وجدانی کیفیت اور علامتی معنویت کے ساتھ ساتھ طنز و مزاح بھی ان ڈراموں کی نمایاں خصوصیت ہیں لیکن ایونیسکو کے فن میں طنز و مزاح اور بے ساختہ پن خوش وقتی کا ذریعہ نہیں بلکہ کسی سنجیدہ خیال یا المناک حقیقت کو بے نقاب کرنے کا وسیلہ ہے اور مضحکہ خیز عناصر اور قول محال کسی گہرے معنی یا پیچیدہ حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ 5

اس ڈرامے میں ایونیسکو نے ہر چیز کو ایک مشینی انداز میں دکھایا ہے اور ہر چیز کا واقع ہونا بھی ایک عادتاً بتایا ہے جہاں بات دل سے نہیں نکلتی بلکہ سطحی انداز میں کہی جاتی ہے جذبات کا دخل نہیں ہوتا بلکہ اس جگہ ردعمل کی صورت ہوتی ہے جس کی وجہ سے اس کے کردار جاندار انسان نہیں بلکہ مشین معلوم ہوتے ہیں۔ یوجین کا دوسرا ڈرامہ The Lesson ہے جس میں اس نے تعلیمی اداروں کو قتل گاہوں کے روپ میں پیش کیا جہاں ایک استاد نوجوان لڑکیوں کا استحصال کرتا نظر آتا ہے یہاں بھی زبان کو حقیقت کا اظہار نہیں بنایا گیا ہے۔

کرسیاں؛(The Chair)

یہاں یوجین کے ڈرامہ The Chair سے بحث ہے جس کا ترجمہ زاہدہ زیدی نے 'کرسیاں' کے نام سے کیا ہے۔ یہ ایک طویل استعاراتی اور anty-realist ڈرامہ ہے اس ڈرامے میں ایک گول کمرہ ہے

جس کے چاروں طرف سمندر ہے اس کے رہنے والے عمر رسیدہ میاں بیوی ہیں جن کی عمر تقریباً ۹۴،۹۶ سال ہے جو اپنے ماضی کی یادوں میں گم ہیں جہاں ان کے خواب و خیال کی دنیا، یادیں، مبہم واقعات اور تصورات نظر آتے ہیں بوڑھا اپنی ان یادوں کے ذریعہ دنیا کے لوگوں کو اپنا ایک پیغام دینا چاہتا ہے جس کی وجہ سے یہ دنیا تباہ کاری سے بچ سکتی ہے اس کی آخری خواہش یہی ہے کہ اس کا پیغام لوگوں تک پہنچ جائے تو پھر وہ میاں بیوی اس دنیا سے رخصت ہو جائیں گے اپنی اس خواہش کی تکمیل کے لیے وہ اپنے گھر شہر کے تمام لوگوں کو مدعو کرتا ہے جس میں بادشاہِ وقت کو بھی بلایا جاتا ہے شہر کے تمام لوگ اس کے گھر اکٹھا ہونے لگتے ہیں یہ تمام لوگ جس کو بھی مدعو کیا گیا ہے سب کے سب غیر مرئی ہیں صرف بڈھے اور بڑھیا کا وجود حقیقی ہے لیکن کرسیوں کی تعداد سے ان سب کی تعداد معلوم ہوتی ہے لوگ ایک ایک کر کے تشریف لاتے ہیں اور بڈھے اور بڑھیا ان کا استقبال کرتے ہیں مگر ان کی شکلیں نمودار نہیں ہوتی ہیں صرف کرسیوں کی بڑھتی ہوئی تعداد سے اس کا اندازہ لگایا جاتا ہے حتیٰ کہ بادشاہ بھی تشریف لے آتا ہے لیکن مجمع اس قدر ہے کہ وہ دونوں میاں بیوی بادشاہ تک نہیں پہنچ پاتے۔ یہاں بڈھے نے ایک مقرر کو بھی مدعو کیا ہے جس کے ذریعہ وہ اپنا پیغام پہنچانا چاہتا ہے کیوں کہ اس کا خیال ہے کہ وہ خود اپنے خیالات کا اظہار نہیں کر سکتا اس لئے اس نے اپنے پیغام رسائی کے لیے ایک مقرر مدعو کیا ہے لیکن عجیب بات ہے کہ یہ مقرر گونگا اور بہرہ ہے جو لوگوں کو کچھ بھی سمجھا نہیں سکتا بلکہ black board پہ کچھ لکھتا ہے لوگ اس کا مذاق اڑاتے ہیں اور وہ وہاں سے چلا جاتا ہے اسی درمیان بڈھے اور بڑھیا بھی کھڑکی سے کود کر اپنی جان دے دیتے ہیں۔

یہ ایک انتہائی معنی خیز اور علامتی ڈرامہ ہے اس میں ابہام اور رطِ قول محال جیسے ڈرامائی اسلوب کا سہارا لیا گیا ہے جو تشویش اور پریشانی کی کیفیت کو بیان کرتے ہیں اس ڈرامے پہ تبصرہ کرتے ہوئے زاہدہ زیدی نے لکھا ہے:

> اس ڈرامے میں ایونیسکو نے وجودی تجربے کی تہوں کو کھولنے کی کوشش کی ہے اور لاشعوری واردات اور مابعدالطبیعاتی تجربے کا بھی احاطہ کیا ہے۔ ڈرامے میں قدم قدم پر نفسیاتی بصیرتوں کی بھی جھلک ہے اس ڈرامے کی ایک بہت اہم اور منفرد خصوصیت اس میں اسٹیج کے مادی اور بصری وسائل کا انتہائی معنی خیز اور ڈرامائی استعمال ہے جس کی سب سے

نمایاں مثال اسٹیج پر خالی کرسیوں کی بھرمار ہے اوراس فنی اسلوب نے فنکار کی کائناتی بصیرتوں کو ایک مادی پیکر عطا کیا ہے۔6

دراصل اس ڈرامے میں میاں بیوی کی محرومیوں، ناکامیوں اور زندگی کا المیہ پیش کرنے کے علاوہ زندگی کے بے حقیقت ہونے کا احساس اور مابعدالطبیعاتی خلا کی نشان دہی ہے۔

بادشاہ سلامت خدا حافظ (Exit The King)

ایونیسکو کا دوسرا ڈرامہ جس کا ترجمہ زاہدہ زیدی نے کیا ہے Exit the king ''بادشاہ سلامت خدا حافظ'' کے نام سے ہے اس کا موضوع بادشاہ کی موت اوراس کی مملکت کا خاتمہ ہے جہاں بادشاہ کی موت کے دن قریب آرہے ہیں اس کی سلطنت کی تمام اشیاء بھی خاتمہ پر ہے فوجی افسروں کی تعداد بھی دن بدن کم ہوتی جارہی ہے جانوروں اور مویشیوں کا خاتمہ بھی ہورہا ہے حتیٰ کہ اس کی مملکت کا خطہ بھی سکڑتا جارہا ہے، بادشاہ کی گرفت ہر چیز سے کم ہوتی جارہی ہے اور وہ بادشاہ بھی جسمانی کمزوریوں میں مبتلا ہوتا جارہا ہے اور موت اس کا استقبال کرنے کے لیے اس کے دروازے پر آ کھڑی ہے۔ یوجین نے اس ڈرامے میں بھی ایک بوسیدہ کمرے کو دکھایا ہے جس پر بادشاہ کی مملکت تھی لیکن وہاں سے دھیرے دھیرے ساری چیزیں غائب ہوتی جارہی ہیں دراصل اس ڈرامے میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ جب بادشاہ جوان تھا اس نے کبھی موت کے بارے میں نہیں سوچا اور نہ ہی آخرت کے لیے کوئی تیاری کی بلکہ وہ ہمیشہ یہی سوچتا رہا ہے کہ وہ ابھی جوان ہے اس کے سامنے بہت وقت پڑا ہے اور جب وہ چاہے گا تب وہ خود موت کا فیصلہ کرے گا لیکن موت کسی کا انتظار نہیں کرتی وہ ایک اٹل حقیقت ہے جسے کسی طرح ٹالا نہیں جا سکتا اور انسان کا عمل صرف افسوس ناک اور مضحکہ خیز رہ جاتا ہے۔ وہ حقیقت سے آنکھیں چراتا رہتا ہے اس کی طرف سے منہ موڑتا اور فرار حاصل کرتا ہے جس طرح اس ڈرامے میں بھی بادشاہ کی چھوٹی ملکہ بادشاہ کو بار بار جھوٹی تسلی دیتی ہے کہ وہ بھی جوان ہے اور ابھی کافی عرصہ تک زندہ رہنے والا ہے۔ زاہدہ زیدی نے اس کے ڈرامے کے متعلق لکھا ہے

> بادشاہ سلامت، کا پس منظر ایوانِ شاہی ایک بوسیدہ کمرہ ہے جس کی دیواریں چیخ رہی ہیں کھڑکیاں غائب ہورہی ہیں اور بار بار صاف کرنے کے باوجود جالے اور کیڑے نمودار ہورہے ہیں اور یہ قابل رحم ایوان شاہی اس بادشاہ کی لمحہ بہ

لمحہ سکڑتی ہوئی اور زوال پذیر مملکت کا اشاریہ ہے اور خود بادشاہ ایک عام انسان کا علامتی روپ ہے جو موت کی ناگریز حقیقت سے دوچار ہے اور جسے بہر طور اندزی کی اس زوال آمادہ مملکت کو خیر آباد کہنا جس کے لیے وہ ذہنی طور پر تیار نہیں اور اس صورت حال کے پردے میں ایونیسکو نے ذات، کائنات، وجود وعدم، لاشعور حقیقت اور فرار اور زندگی کی حدود وامکانات جیسے اہم مسائل کا احاطہ کیا ہے۔7

یوجین کے دوسرے ڈراموں کی طرح یہ ڈرامہ بھی علامتی، سرریلسٹ اور ابسرڈ ڈرامے کے اجزاء پر مبنی ہے اس میں بھی اس نے انسانی ذہن، نفسیاتی کشمکش اور انسانی ذہن کی فراریت کو موضوع بنایا ہے جہاں انسان زندگی کی حقیقتوں سے شعور ولاشعور کی دنیا میں نظریں چرائے ہوئے ہے اس ڈرامے میں انسان کی انہیں لاشعوری حقیقتوں کو بے نقاب کیا ہے جس کے نتیجے میں یہ ڈرامہ کافی پیچیدہ اور فکر انگیز ہو گیا ہے جو ذات و کائنات وجود وعدم اور شعور ولاشعور جیسے ہمہ گیر مسائل کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔

سیمول بیکٹ:

سیمول بیکٹ بھی ابسرڈ ڈرامے کے نمایاں علمبرداروں میں سے ہے جو البرڈ تھیٹر اور اواں گارڈ ڈرامے کا اہم ترین نام ہے بیکٹ آئرلینڈ کا مہاجر تھا وہ آئرلینڈ میں خیالات وتحریر پر سخت پابندی لگنے کی وجہ سے بھاگ کھڑا ہوا تھا یہی وجہ ہے کہ اس کے ڈراموں میں بھی ایک مہاجر اور خانماں خراب کا درد جھلکتا ہے وہ ابسرڈ ڈرامے کا شاہکار فنکار تھا اس نے زندگی میں دوسری جنگ عظیم کی تباہ کاریوں کا مشاہدہ اور کمیونزم کی یلغار کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا جہاں سرمایہ دارانہ نظام تیزی سے ختم ہو رہا تھا اور معاشرہ انحطاط پذیر ہو رہا تھا جہاں سائنس کی ترقی تو بڑھتی جاری تھی لیکن انسانی قدریں تباہ وبرباد ہو رہی تھیں اور جہاں انسان کی کوئی قدر وقیمت نہیں رہ گئی تھی ایسے ماحول میں بیکٹ نے بھی وجودی تجربات اور داخلی کیفیات کو اپنے فن کا وسیلہ بنایا جہاں سماجی دنیا سے تعلق برائے نام ہے جس سے اس نے ابسرڈ ڈرامے کی دنیا میں وسعت پیدا کی اور سماجی نابرابری، انسانی قدروں کا زوال والمیہ، تشویش، تنہائی، کرب ذات اور سب سے بڑھ کر زبان کا استحصال اور ترسیل کا المیہ اس کے ڈرامے کے محرک عناصر ہیں انہیں سب عناصر کو اس نے اپنے ڈراموں میں برتا ہے۔

سیمول بیکٹ نہ صرف ڈرامہ نگار تھا بلکہ وہ ایک ناول نگار، افسانہ نگار، شاعر اور ترجمہ نگار بھی تھا اور

اس کو 1969 میں لٹریچر کا ناول پرائز بھی ملا تھا اس کے ناولوں میں more pricks than kicks 1934، Murphy1938، Molloy1951، Malone Dies 1952، The Unnamable1953، ناول کے علاوہ اس نے کئی اہم ڈرامے بھی لکھے ہیں جس میں Waiting for godot اس کا شہرہ آفاق ڈرامہ ہے اس ڈرامے کو جدید ڈرامے کی دنیا میں انقلاب آفریں تصور کیا جاتا ہے اور اس ڈرامے کو پوری دنیا میں یکساں مقبولیت حاصل ہے۔ اس ڈرامے میں بیکٹ نے انسانی صورت حال کو علامت بنایا ہے جہاں افکار، احساس، فلسفیانہ تصورات، کائناتی احساس، سماجی بصیرتوں اور معنی خیز اشاروں کو اہمیت حاصل ہے۔ اس میں دو کردار گودو اور دیدی ہیں جو ایک لق ودق صحرا میں گودو کا انتظار کر رہے ہیں جہاں چٹیل میدان اور سوکھے درخت کے علاوہ کچھ بھی نہیں اسی صحرا اور درخت کو بیکٹ نے انسانی زندگی کی علامت کے طور پر استعمال کر کے اس دنیا میں انسانی حقیقت کو واضح کیا ہے۔

Act without word بیکٹ کا ایک مختصر ڈرامہ ہے جس میں بیکٹ نے الفاظ کے استعمال سے مکمل احتراز کیا ہے جو کہ ابسرڈ ڈرامے کی سب سے بڑی خصوصیت ہے دوسرے یہ کہ اس ڈرامے کے عنوان سے بھی اس کی وضاحت ہوتی ہے جہاں بیکٹ نے انسانی زندگی اور اس کی صورت حال کو الفاظ کے بغیر ہی کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

شہ مات (End Game)

End Game بیکٹ کا ایک اور فکر انگیز ڈرامہ ہے جس کا اردو ترجمہ زاہدہ زیدی نے اپنی کتاب ''مسدود راہیں'' میں ''شہ مات'' کے نام سے کیا ہے۔ یہ ایک طویل ڈرامہ ہے جو یوجین کے ڈراموں کی طرح ایک بند کمرے پر مشتمل ہے اس ڈرامے کے مرکزی کردار ہیم، نیگ اور نیل ہیں۔ ہیم جو اس کمرے کا بادشاہ ہے کلو اس کا غلام ہے نیگ اس کا باپ اور نیل اس کی ماں ہے۔ ہیم ایک نابینا اور مفلوج بادشاہ ہے جو کہ اس کمرے کا مالک ہے اور اس بند کمرے پر ہیم کی حکمرانی ہے وہ ہمیشہ ایک وہیل چیئر پر بیٹھا رہتا ہے نہ وہ چل سکتا ہے نہ لیٹ سکتا ہے اور نہ ہی دیکھ سکتا ہے۔ اس کا سارا کام اس کا غلام کلو کرتا ہے کلو اس کے ہر حکم کی تعمیل کرتا ہے وہ اس کا ایک ایسا غلام ہے جو اس کے پاس بچپن سے رہتا ہے کلو کے باپ اسے ہیم کے پاس بچپن میں چھوڑ جاتا ہے

اور تب سے وہ ہیم کے پاس ہی رہتا ہے جس کے ہر حکم کو بجالانا اس کا فرض ہے، وہ کسی دوسری جگہ جا بھی نہیں سکتا اس بند کمرے کے علاوہ کوئی دوسری جگہ رہنے کے لیے نہیں ہے جب کہ ہیم کے والدین ہمیشہ کوڑے کے ڈبے میں بند رہتے ہیں اور جب کبھی انہیں بھوک لگتی ہے تو وہ باہر جھانک کر کھانے کے لئے مانگ لیتے ہیں۔ زاہدہ زیدی اس ڈرامے پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتی ہیں:

> شہ مات جو بیکٹ کے الم ناک ترین ڈراموں میں سے ایک ہے اور موت، تباہی، غم، تشویش، ندامت اور تاسف کے احساسات پر مرکوز ہے کافی پیچیدہ اور تہ دار معنی کا حامل ہے اور اسے مکمل طور پر کسی ایک تفہیم کے سانچے میں ڈھالنا نہ صرف مشکل بلکہ نامناسب بھی ہے اس کا گہرا مطالعہ یا ایک احساس پروڈکشن ہی اس کی معنویت کی تہیں کھولنے میں معاون ثابت ہوسکتا ہے۔8

''شہ مات'' میں ایک بند کمرہ ہے جہاں ان کرداروں کو باقی دنیا سے کٹا ہوا بھی دکھایا گیا ہے ہیم کی حکمرانی اور کلو کی غلامی کمرے صرف کمرے تک دکھائی گئی ہے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ انسانی زندگی کا استعارہ ہے جہاں انسان خود کو کائنات سے الگ زندگی اور روحانیت اور اپنے گردوپیش کے فطری مناظر سے بھی محروم ہو کر رہ جاتا ہے۔

بیکٹ کے دوسرے ڈراموں میں All that fall ،Happy Days،Krapp'Last tape بھی اہمیت کے حامل ہیں۔

ژاں پال سارتر:

ژاں پال سارتر ایک ناول نگار، افسانہ نگار، نقاد اور صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اہم ڈرامہ نگار بھی ہے اس کے ڈرامے وجودی فلسفہ کی بنیاد پر مبنی ہیں جس میں انسانی وجود کو اہمیت حاصل ہوتی ہے اور انسان کی ذات ہی اس کے ہر عمل کا مرکز ہوتی ہے انسان اپنے ہر عمل اور فیصلے کا خود مختار ہوتا ہے۔ سارتر کا بھی یہی کہنا تھا کہ انسان اپنے عمل سے ہی اپنی زندگی بناتا ہے وہ اپنے ہر کام میں آزاد ہے اور اس کے عمل کے ذریعہ ہی اس کی اقدار بھی متعین ہوتی ہیں انسان کے پاس شعور ہے جس کی بنیاد پر وہ اپنی سوجھ بوجھ سے اپنے عمل کو انجام دے سکتا ہے۔

دراصل وجودی فلسفہ کا مقصد آج کی بحرانی زندگی میں حقائق کو تلاش کرنے سے زیادہ حقیقی زندگی میں پیش آنے والے مسائل کا فوری حل تلاش کر کے ان سے نپٹنے پر زور دینا ہے آج نسان کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی کو فعال، متحرک اور بامعنی کیسے بنائے اور آج کی دنیا سائنس وٹیکنالوجی کی دنیا ہے جہاں خیال اور تصورات کو دخل نہیں ہوتا بلکہ عمل کے مطابق ہر چیز وقوع پذیر ہوتی ہے اسی لیے انسان کو بھی نیت اور ارادے کی جگہ عمل پر توجہ مبذول کرنی چاہئے کیوں کہ اسی سے اس کے اچھے اور برے ہونے کا فیصلہ صادر ہوتا ہے اس فلسفہ کے مطابق انسانی زندگی لحہ بہ لحہ اس کے عمل کے ذریعہ بدلتی رہتی ہے جس طرح کے وہ کام انجام دیتا ہے اسی طرح کا نتیجہ اس کے سامنے ہوتا ہے اسی لیے انسان کو سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا چاہئے کیوں کہ اسی فیصلہ کو اس کی زندگی کا حاصل قرار دیا جاتا ہے۔

دوسری چیز جو اس فلسفہ میں بنیادی اہمیت رکھتی ہے وہ یہ کہ انسان آزاد ہے وہ کسی کا پابند نہیں اسی لیے انسان بنا کسی ڈر کے پورے شعور اور ذمہ داری کے ساتھ اپنے کام کو انجام دینا چاہئے وہ جو بھی عمل کرے گا اس کا ذمہ دار وہ خود ہوگا اس فلسفہ میں کسی جذباتی لائحہ عمل کی کوئی گنجائش نہیں اور نہ ہی عمل کرنے کے بعد کسی جواز کو تسلیم کیا جائے گا بلکہ اس نے جو کیا وہی اس وقت کی حقیقت ہوگی۔

سارتر کا فلسفہ بھی وجودیت سے متاثر ہونے کی وجہ سے سارتر بھی یہی مانتا ہے کہ انسان آزاد ہے اور اسے اپنے عمل میں بھی پوری آزادی ہے مگر شرط یہ ہے کہ وہ اپنا ہر عمل شعوری طور پر سوچ سمجھ کر انجام دے لیکن یہ شعور ذمہ داری سے آتا ہے اگر انسان ذمہ دار ہوگا تو وہ پختگی اور اپنی سمجھ کے ساتھ اپنی زندگی کے کاموں کو انجام دے گا۔یہی وجہ کہ اس کے نزدیک زندگی عمل سے بنتی ہے ذہن میں بسنے والے خیالات اور تصورات کی اہمیت نہیں بلکہ اس انسان کے اس عمل کی ہے جو اس سے سرزد ہوتے ہیں۔

بند کمرہ:

سارتر کے ڈراموں میں ہمیں یہی فلسفہ ملتا ہے جہاں انسان اپنی دانش وعقل مندی سے اپنے عمل کو انجام دیتا ہے لیکن اگر ان سے جذباتی طور پر کوئی کام یا کوئی غلطی سرزد ہو جاتی ہے اور وہ اس کا جواز پیش کرے تو اس کے جواز کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔''بند کمرہ''جس کا ترجمہ زاہدہ زیدی نے کیا ہے اس میں بھی یہی صورت

حال پیش کی ہے جہاں تین گنہگاروں کو ایک ایسی جہنم میں ساتھ رکھا جاتا ہے جس میں ایذا رسائی ظاہری آلات تو نہیں لیکن وہ خود ایک دوسرے کے لیے ازیت کا باعث ہیں۔

اس ڈرامہ میں بند کمرہ میں تین گنہگار آنیز، استیل اور گارسوں ہیں تینوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہیں لیکن ساتھ میں رہنے کے بعد ان کی ماضی کی کرتوتوں اور ان کے گناہوں کا پردہ فاش ہوتا ہے۔ آنیز ایک ایسی عورت تھی جو اپنے مکروفریب سے دوسری عورتوں کو پھنساتی تھی وہ ہم جنس کے مرض میں مبتلا ہوتی ہے دوسروں کو تکلیف دینا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ دوسری عورت استیل ہے جو اپنی معصوم بچی کی قاتل اور اپنے محبوب کی خودکشی کا باعث تھی۔ وہ خود کو معصوم ظاہر کرنے کی کوشش کرتی ہے لیکن اس کا راز بھی فاش ہو جاتا ہے۔ تیسرا ایک مرد گارسوں ہے جو ایک صحافی ہے جس نے زندگی بھر طرح طرح سے اپنی بیوی کو تکلیفیں دیں اور خود کو ایک اصول پرست اور بہادر صحافی مانتا رہا لیکن جب اس کے ملک میں جنگ چھڑی تو وہ میدان جنگ سے پیٹھ پھیر کر بھاگتے ہوئے پکڑا گیا اور اس کے بعد اس کے دوستوں نے اس کا سینہ گولیوں سے چھلنی کر دیا مگر گارسوں اس جہنم میں بھی خود کو بہادر ہونے کا ثبوت اور جواز پیش کرتا رہتا ہے۔

بہر حال تینوں کو ان کے گناہوں کی سزا ملتی ہے اور انہیں اس بند کمرے میں جو جہنم کا استعارہ ہے ان سب کو اس کمرے میں ایک ساتھ بند کر دیا جاتا ہے وہاں تینوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہیں اور سمجھ نہیں پاتے کہ ان کو ایک ساتھ کیوں رکھا گیا ہے جب انہیں ایک دوسرے سے کوفت ہونے لگتی ہے تو وہ آپس میں بات نہ کرنے کا فیصلہ کرتے ہیں لیکن اسی دوران یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ آنیز جس کی فطرت مکروفریب ہے وہ استیل کو بھی اپنے جال میں پھنسانا چاہتی ہے اور اس سے محبت کا دعوہ کرنے لگتی ہے مگر استیل گارسوں کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کرنا چاہتی ہے لیکن آنیز ان کے درمیان حائل ہو جاتی ہے جب کہ گارسوں کو اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے بس وہ یہ چاہتا ہے کہ اسے کوئی یہ بتا دے کہ وہ بزدل نہیں بلکہ ایک اصول پرست انسان تھا اور اس نے اپنے ملک سے کوئی غداری نہیں کی لیکن آنیز بنا خوف اس سے بار بار یہ کہنے پر مصر ہے کہ وہ بزدل اور جنگ سے بھاگا ہوا انسان ہے۔ گارسوں اس سے جھنجھلا جاتا ہے اور آخر میں یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ ہمارے لیے کمرہ میں ظاہری آلات ایذاء رسائی کے لیے نہیں مگر ہمارے لیے ایک دوسرے کی موجودگی ہی جہنم ہے اور پھر

زور زور سے کمرے کا دروازہ پیٹنے لگتا ہے لیکن جب دروازہ کھلتا ہے تو وہ باہر نہیں جاتا جس پر وہ خود بھی حیرت زدہ ہوتا ہے اور پھر دروازہ بند ہو جاتا ہے۔

سارتر نے اس ڈرامے میں انسانی ذہنوں کی کشمکش اور ان تینوں کے داخلی ٹکراؤ سے ایک ڈرامائی کیفیت پیدا کی اور ان تینوں کے ذاتی اور شخصی رشتوں میں دھوکہ فریب اور مکاری کو مجرمانہ طور پیش کیا ہے ان کرداروں میں کہیں نہ کہیں یکسانیت نظر آتی ہے اگر یہ تینوں اپنی عقل اور سوجھ بوجھ سے فیصلہ کرتے تو ان کی زندگی کا رخ دوسرا ہوتا وہ اپنے عمل سے اپنی اقدار کی بھی تخلیق کر سکتے تھے کیوں کہ انہیں اپنے فیصلہ میں پوری آزادی تھی ان کا جہنم میں ہونا ان کے عمل اور فیصلہ کی بنا پر ہے کیوں کہ سارتر کا کہنا تھا کہ سخت سے سخت صورت حال اور پریشانی میں بھی انسان کے پاس کچھ نہ کچھ فیصلہ کرنے کی آزادی رہتی ہے جو اس کی زندگی میں ایک اہم تبدیلی کا باعث بن سکتا ہے۔

زاہدہ زیدی کی رائے اس کے متعلق اس طرح ہے:

> سارتر کا جہنم صرف جرم وسزا اور اعمال اور ان کے نتائج کا روپ نہیں بلکہ اعتقادی بددیانتی کے مختلف مظاہر اور غیر معتبر زندگی کی سکڑتی ہوئی حدود جامد اور بے معنی صورت حال کا بھی استعارہ ہے ان تینوں کرداروں نے نہ صرف ذاتی اور شخصی رشتوں میں خود غرضی اور سفا کی کو آلہ کار بنایا بلکہ شخصیت کی شناخت، اقدار کی تخلیق اور اپنی آزادی کو بامعنی بنانے میں بھی مجرمانہ طور پر بے نیاز رہے۔ نتیجے کے طور پر اپنے تعمیر کردہ جہنم میں محبوس ہیں جہاں تخلیق کے دروازے بند ہو چکے ہیں اور یہ لوگ اپنے جذبات کی تسکین اور ذات کی شناخت کے لیے مکمل طور پر ایک دوسرے کے دست نگر ہیں اور اس پر یہ طرہ کہ ان میں سے کوئی کسی دوسرے سے کوئی بامعنی رشتہ قائم کرنے کا اہل نہیں۔[9]

سارتر کا فلسفہ وجودیت کی افہام وتفہیم ہے جہاں انسان کوئی جامد شئے نہیں بلکہ انسان خود اپنے داخلی جذبات واحساسات، وجودی تجربات، انتخاب اور عمل کے ذریعہ اپنی شناخت قائم کرتا ہے وجودیت کا فلسفہ جبر کے خلاف انفرادی آزادی کے حق میں ایک بغاوت ہے یہ انسان کو ایک فعال رکن بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ سارتر نے بھی اپنے فلسفہ میں باشعور اور بے شعور وجود کے تضادات کو نمایاں کیا ہے اس نے اپنے فلسفہ کو ڈرامائی انداز میں پیش کیا اس کے لیے اس نے یونانی دیومالائی عناصر کو تجسیم کا روپ دے کر پیش کیا ہے۔

''بند کمرہ'' کے علاوہ بھی سارتر کے دوسرے کئی اہم ڈرامے ہیں جن میں TheFlies1943،
The Devil and Good ،The Reprive،The Age of Reason،The Wall،Oreste
Lord افسانوی مجموعہ Intimacy ناول Nausea وغیرہ ہیں جو انسانی وجود کی اتفاقیت اور اس سے پیدا شدہ بے کیفی، ذہنی کشمکش اور نفسیاتی کشمکش کی بہترین مثال ہیں۔ سارتر کی کچھ تنقیدی کتابیں بھی اس کے فلسفے کے بنیادی تصورات کو واضح کرنے میں کافی معاون ہیں جن میں psychology and Critique ،Transcendence of ego،Being and nothingness،imagimanatin of Dialactical Reason، وغیرہ اس کی فلسفیانہ فکر کو سمجھنے میں نمایاں اہمیت کی حامل ہیں۔

مینول دی پیدرولو

مینول دی پیدرولو۔ Catlonia میں پیدا ہوا لیکن اسپین جنگ کے بعد وہ Bancelona چلا گیا اور وہیں مستقل سکونت اختیار کی۔ پیدرولو ابسرڈ ڈرامے کا اہم فنکار تھا اس کے یہاں ہمیں وہ تمام خصوصیت مل جائیں گی جو ابسرڈ ڈرامے کی حامل ہیں اس نے ناول، ڈرامہ، شاعری اور ترجمہ نگاری میں اہم کارنامے انجام دئے ہیں اس نے 1949 سے 1985 تک 72 ناول لکھے اس کی زیادہ تر تخلیقات کا انگریزی میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے اس کے نمایاں ڈراموں میں کرونا، انسان اور نہیں، ستا سیویلس، اور کمرہ خاص طور سے اہم ہیں۔

کمرہ

زاہدہ زیدی نے پیدرولو کے ڈرامہ ''کمرہ'' کا اردو ترجمہ کیا ہے یہ ڈرامہ تین ایکٹ پر مشتمل ہے اور اس میں سات کردار نظر آتے ہیں جن میں تین مرد اور چار عورتیں ہیں یہ تمام کردار اسی ایک کمرہ میں رہتے ہیں آپس میں ایک دوسرے سے تعلقات بھی قائم کرتے ہیں جس کے نتیجے میں ان کرداروں کے خدوخال اور ان کی فطرت بھی سامنے آتی ہے یہ ساتوں لیڈی لینڈ کے ذریعہ کمرہ میں لائے جاتے ہیں اس کمرہ میں صرف دو دروازے ہوتے ہیں ایک میں سے جب لیڈی لینڈ انہیں کمرہ میں داخل کرتی ہے اور دوسرا وہ جب یہ سب لیڈی لینڈ کی آواز پر یہاں سے واپس جاتے ہیں۔

ان کرداروں کے نام بیلٹ، کلیڈ ا۔ الونا، والو، سمیر، کلک اور کانسا ہیں یہ سب ایک ساتھ رہتے ہیں

کمرہ میں بہت سی چیزیں رکھی ہیں جیسے دو بڑے دیوان، ایک بڑی الماری، کچھ دوسری چیزیں جیسے ہتھوڑا، درانتی کچھ پنسلیں، چابیوں کا گچھا، ہتھکڑیاں، پہیہ، جعلی چہرہ، بیڈ اور ایک ٹوٹی سائیکل۔

کلک اور کا نسا، والوا ور سمیر آپس میں محبت کرتے ہیں الونا کا مزاج دوسروں سے الگ تھلگ رہنے والا ہے بیلٹ اور کلیڈا دونوں جارحانہ قسم کا مزاج رکھتے ہیں اور پورے کمرے پر اپنی حکمرانی چلاتے ہیں کلک ایک writer ہے اور وہ اپنی دنیا میں کھویا ہوا رہتا ہے دوسری طرف والوا اور سمیر ہیں یہ دونوں آزاد طبیعت پسند ہیں اور جمہوریت کو ترجیح دیتے ہیں سمیر بیلٹ کے رویہ کو پسند نہیں کرتا وہ اس کے حکم کی تعمیل کرنے کے بجائے اس سے بحث کرتا ہے چونکہ بیلٹ کے پاس چاقو ہے جو ہر وقت مارنے کی دھمکی دیتا ہے اس کی وجہ سے سمیر کو اس کا حکم ماننا پڑتا ہے کلیڈا کا مزاج بیلٹ سے ملتا جلتا ہے اس لیے بیلٹ کی اس سے دوستی ہے وہ دوسروں پر ظلم کرنے میں اس کا ساتھ دیتی ہے۔الونا اگر چہ خاموش مزاج ہے لیکن اس کی عقل مندی اور ہوش مندی سے ایک دن سمیر بیلٹ سے چاقو چھین لیتا ہے اور پھر اس کی حکومت ختم کر دیتا ہے اور بیلٹ اور کلیڈا کو اسی طرح سزائیں دیتا ہے جس طرح وہ دوسروں کو دیتا تھا لیکن آخر میں لیڈی لینڈ کی آواز پر ایک ایک کر کے سب کو پورا کمرہ خالی کرنا ہوتا ہے ان سب کے جانے کے بعد لیڈی لینڈ پھر اسی طرح ایک نئے مہمان کی آمد پر استقبال کرتی ہے جس طرح ان ساتوں کا ہوا تھا اور پھر سے اسی طرح ایک نیا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

پیدر ولو کا یہ ڈرامہ ایک علامتی ڈرامہ ہے جو زندگی کی حقیقتوں کی وضاحت کرتا ہے یہاں ہمیں انسان کی زندگی میں ہونے والے ظلم، جبر، سیاسی و سماجی حالت، ڈکٹیٹر شپ، حکمرانی تشدد، جمہوریت بغاوت اور مساوات جیسے کئی پہلو نظر آئیں گے غرض کہ اس ڈرامے میں زندگی سے موت تک پیش آنے والے واقعات کو ڈرامائی انداز میں پیش کیا گیا ہے انسانی زندگی کی طرح اس کمرے میں بھی ایک دوسرے پر مغلوب ہونا، اس پر ظلم وزیادتی کرنا اور دوسرے کے ظلم وزیادتی کے خلاف آواز بلند کرنا دکھایا گیا ہے لیکن جس طرح حقیقی زندگی میں جدوجہد کی ہوئی چیز پر فتح پا لینے کے بعد زندگی سست رفتار ہو جاتی ہے اسی طرح یہاں بھی ہمیں یہ چیز نظر آئی اور یہ جب اقتدار جدوجہد اور بغاوت کرنے والے کے ہاتھ میں آ جاتا ہے تو وہ خود بھی انہیں خامیوں کا حامل ہو جاتا ہے جس کے لیے اس نے بغاوت کی تھی اور نتیجہ طور پر پھر سے وہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔زاہدہ زیدی

اس ڈرامے کے حوالے سے لکھتی ہیں:

اس کے ڈرامائی ایکشن میں تہ در تہ معنی پوشیدہ ہیں اور جیسے جیسے ڈرامہ ارتقاء پذیر ہوتا ہے زندگی کے مختلف پہلو ہماری آنکھوں کے سامنے بے نقاب ہوتے ہیں اور حیات و کائنات کے اسرار کھلتے جاتے ہیں اور ہمیں احساس ہوتا ہے کہ ڈرامے کا منظر، پس منظر، کردار، واقعات اور چھوٹی بڑی سبھی تفصیلات گہری علامتی معنویت کی حامل ہیں اور فنکار نے اس محدود ڈرامائی پیش کش کے پردے میں بڑی گہرہ اور عالمگیر حقیقتوں پر روشنی ڈالی ہے۔10

ابسرڈ ڈرامہ نگاروں کی طرح پیدرولو کے یہاں بھی علامتی سریلسٹ اور ڈرامائی تمثیل دیکھنے کو ملتی ہے ڈرامہ ''کمرہ'' کو بھی جدید مغربی ڈرامے میں ایک مخصوص استعاراتی ڈرامے کی حیثیت سے مقبولیت حاصل ہے۔لیکن اس ڈرامے کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ابہام نہیں ہے اس کو اگر وسیع نظر سے مشاہدہ کیا جائے تو اس کے معنی سمجھنے میں مشکل در پیش نہیں آئے گی بلکہ اس کے معنی و مفہوم کی گرہیں کھلتی جائیں گی جسے ہم اپنی ذاتی زندگی کے آئینے میں بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔

انتون چیخوف کے ڈرامے:

ڈرامے کی صنف سب سے قدیم صنف ہے خاص کر یونان میں اس کی شروعات صدیوں پہلے ہوئی ہے یونان اور ایلزبیتھن کے عہد کو ڈرامے کے لیے خاص طور سے اہم مانا جاتا ہے اور ڈرامہ کی اس صنف کو خوب ترقی بھی ہوئی مغرب کے قدیم ترین ڈراموں کو کافی اہمیت حاصل ہے انہیں تھیٹر اور اسٹیج پر بھی کامیابی کے ساتھ دکھایا جاتا رہا ہے جن میں انسانی زندگی کے اہم مسائل کو ڈرامائی انداز میں پیش کیا جاتا تھا جس کا اثر لوگوں پر بہت معنی خیز ہوتا تھا ڈرامے کی اس صنف میں طربیہ، رزمیہ اور المیہ سبھی کو مقبولیت حاصل ہوئی لیکن المیہ اور ٹریجڈی ڈراموں کو زیادہ پسند کیا جاتا تھا جس کے ذریعہ انسان اپنا تزکیہ نفس (اندر کی کیفیت) کو باہر نکالتا تھا۔

قدیم دور کے برعکس جدید صنف کو بھی کافی مقبولیت ملی جدید ڈرامہ نگاروں نے قدیم ڈرامے کی تکنیک، فورم، اسلوب، زبان اور طرز اظہار سبھی کو متاثر کیا اور ایک نئی طرز کی طرح ڈالی ان جدید ڈرامہ نگاروں نے کائنات کے وسیع تر امکانات اور کائنات میں پوشیدہ پیدہ مسائل کا انکشاف کیا انسان کی ازلی ابدی زندگی

اوراس کی ذہنی ونفسیاتی کشمکش،خود کی تلاش وجستجو،خوف و دہشت اور انسان کے داخلی مسائل کا مطالعہ کر کے اپنے فن میں جگہ دی اور نفسیاتی وفلسفیانہ بصیرتوں کا اظہار کیا ہے۔انسان کے شعوری اور لاشعوری زندگی کا آئینہ دکھایا جس کے نتیجے میں ڈرامہ کے موضوعات میں تبدیلی کے ساتھ ساتھ ڈرامہ کے تکنیک اور ظاہری فورم میں بھی تبدیلی ہوئی ان ڈرامہ نگاروں نے علامت نگاری کی تحریک کو بھی فروغ دیا اور سائنس وٹکنالوجی ترقی کو عصری مسائل اور داخلی کیفیات کو علامتوں استعاروں اور پیکر تراشی کے ذریعہ ڈرامہ کے فن کے قالب میں ڈھالا جس کی وجہ سے علامت نگاری،سریلزم اور اظہاریت کی پوری تحریک پروان چڑھنے لگی اور مغرب کے ہر ملک وشہر میں اس کا اثر دکھائی دینے لگا۔

ان عظیم ڈرامہ نگاروں میں کئی اہم نام شامل ہیں جنہوں نے اپنے اپنے دور میں کافی مقبولیت حاصل کی ان میں ہنرک ابسن،سٹرنڈ برگ،برناڈ شو اور انتون چیخوف جدید مغربی ڈرامے کے پہلے دور سے تعلق رکھتے ہیں جب کہ لوئی جی پراندیلو،ژال پال سارتر،یوجین اونیل،ٹی۔ایس۔ایلیٹ،انوی ژاں ژرادو،یوجین وآئنیسکو،آرتھر اواموف،ہیرالڈ پینٹر،ایڈورڈ آبی،فرناوارابال،ژال ژینے اور مینول دی پیدرولو دوسرے دور سے تعلق رکھتے ہیں۔

جدید مغربی ڈرامہ نگاروں میں ہنرک ابسن،اوگسٹ سٹرنڈ برگ،برناڈ شو اور انتون چیخوف کا نام سرفہرست ہے ان جدید اولین مغربی ڈرامہ نگاروں نے اپنی فکری صلاحیتوں اور نئی بصیرتوں سے آنے والی نسل کے ڈرامہ نگاروں کو بھی خاصا متاثر کیا ان ڈرامہ نگاروں کو جدید مغربی ڈرامہ نگاروں میں بنیادی ستون کی اہمیت حاصل ہے جن کا تعلق انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کی ابتدا سے ہے۔

ان جدید اولین ڈرامہ نگاروں نے ڈرامہ کے فن کو نئی بصیرت گہری وسعت اور شدت فکر واحساس سے روشناس کیا اور انسان کی ذہنی وداخلی کشمکش کو شدت سے محسوس کیا اور انہیں مسائل کو اپنے ڈراموں میں جگہ دی خاص کر انسانی وجود اور داخلی کشمکش کے ساتھ سماجی مسائل اور فرد کی تنہائی کو موضوع بنایا اور عملی زندگی کو فن کے قالب میں ڈھالا۔

انہیں ڈرامہ نگاروں میں انتون چیخوف کو بھی اہمیت حاصل ہے چیخوف نے کئی بہترین فسانوں کے

ساتھ طویل اور مختصر ڈرامے بھی تخلیق کئے ہیں چیخوف نے اپنے ڈراموں میں تہ داری، معنی آفرینی اور گہری سماجی اور نفسیاتی بصیرتوں کا انکشاف کیا ہے وہ زندگی کی دھوپ چھاؤ کو ایک نئے انداز سے پیش کرتا ہے اس کا خیال تھا کہ اگر چہ زندگی میں روزمرہ معمولی اور معمولی واقعات پیش آتے ہیں لیکن ان معمولی واقعات میں بھی کچھ غیر معمولی عناصر شامل ہوتے ہیں جنہیں ایک ڈرامائی انداز میں دکھایا جاتا ہے جس کی تہ داری میں نئے معنی پوشیدہ ہوتے ہیں۔

ان میں انتون چیخوف ایک روسی ڈرامہ نگار اور افسانہ نگار تھا اسے افسانہ نگار کی حیثیت سے کافی شہرت بھی ملی انتون چیخوف کے ڈراموں یوں تو آٹھ طویل اور مختصر ڈرامے ہیں لیکن ان میں آبی پرندہ، ماموں وانیاں، چیری کا باغ کو خاصا اہمیت حاصل ہے ان ڈراموں میں چیخوف نے معمولی معمولی چیزوں کو ایک نیا رنگ و آہنگ عطا کر کے اپنے ڈرامائی اسلوب میں پیش کیا ہے موسم، فطرت، بہار خزاں، جنگلات، آگ روشنی، اندھیرا وغیرہ کو نئی علامتوں کے پیکر میں ڈھال ہے۔ چیخوف کے ڈراموں میں سماجی و معاشرتی ماحول کو زیادہ اہمیت حاصل ہے اس کی توجہ کا مرکز صرف ہیرو ہیروئن نہیں ہوتا بلکہ پورا ایک شوسل گروپ ہوتا ہے جہاں ہر ایک کے خیالات و تصورات اور ذہنی و داخلی کشمکش اور ان کی فکر کو اہمیت حاصل ہے جس میں المیہ، طربیہ دونوں عوامل کا امتزاج نظر آتا ہے۔ زاہدہ زیدی نے آبی پرندہ (The Seagull)، چیری کا باغ (The Cherry Orchard)، تین بہنیں (Three sisters) اور حبیب ماموں (Uncle Vnya) کا اردو ترجمہ کیا ہے۔

حبیب ماموں:

ڈرامہ میں چیخوف نے ایک خاندان کی زندگی کو پیش کیا ہے جن کی داخلی و ذہنی حالت اور سماجی و معاشرتی زندگی کو دکھایا ہے یہ ڈرامہ چار ایکٹ پر مشتمل ہے پہلے ایکٹ میں کرداروں کا تعارف اور گھر کا، ماحول نظر آتا ہے جہاں ایک بوڑھا رٹائر پروفیسر اپنی جوان بیوی دردانہ اور بیٹی سلمہ کے ساتھ رہتا ہے وہ اب چونکہ رٹائر ہو چکا ہے اور شہر کے اخراجات کو برداشت نہیں کر سکتا اس لیے اپنے گاؤں واپس آ گیا ہے اس کی طبیعت ناساز ہے پھر بھی وہ اپنے لکھنے پڑھنے کے کام میں مشغول رہتا ہے اور ہر ایک کو اپنی خدمت پر آمادہ کئے رہتا ہے اس گاؤں میں اس کے ساتھ اس کی پہلی بیوی کی ماں فخر النساء اور بھائی حبیب کے ساتھ فروفیسر کی بیٹی سلمہ بھی

ہے جنھوں نے اسی قصبے میں اپنی پوری زندگی گزاری فخر النساء ہمیشہ نئے نئے رسالوں کی ورق گردانی اور تعلیم نسواں کے موضوع پر اظہار خیال کرتی رہتی ہیں جب کہ حبیب ماموں نے اپنی پوری زندگی پروفیسر کے لیے وقف کر دی تھی اس نے اور سلمہ نے زمین کی دیکھ بھال کی اور خود پیسہ خرچ نہ کر کے پروفیسر کی ضرورتوں کے لیے ہمیشہ پیسہ بچاتے رہے۔لیکن اب وہ اس سے بیزار ہو چکا ہے اور وہ اب ذہنی مرض میں مبتلا ہو چکا ہے اس کو اس بات کا شدید احساس ہے کہ اس نے اپنی پوری زندگی پروفیسر کی جھوٹی اور کھوکھلی زندگی پر برباد کر دی اب وہ 47 سال کا ہو چکا ہے اس لیے اسے اب زندگی کو دوبارہ خوشگوار بنانے کا موقعہ نہیں مل سکتا کیوں کہ اس نے اپنی زندگی کے حسین ترین لمحات کو دوسروں کی خاطر برباد کر دیا اسی لیے وہ اب پروفیسر سے اکتاہٹ اور بیزاری محسوس کرتا ہے اور اپنی بربادی کا ذمہ دار پروفیسر کو ٹھہراتا ہے۔

ان کرداروں کے علاوہ ایک بوڑھی خادمہ اور ایک وفا شعار خادم محمد شریف ہے جنھوں نے ساری زندگی اس گھر کے لوگوں کی خدمت میں گزار دی ہے۔ڈرامے کے دوسرے سین میں ڈاکٹر سلمان کا کردار متحرک ہے اسے جنگلات سے دلچسپی ہے اس نے اپنی قابلیت سے بہت سے جنگلات کو کٹنے سے بچایا ہے اسے جنگلوں سے عشق ہے وہ انہیں مستقبل کے لیے بچانا چاہتا ہے اور ان جنگلات کا رشتہ اخلاقیات اور کلچر سے جوڑتا ہے۔

پروفیسر کلیم کی بیٹی سلمہ کا کردار ایک جفاکش عورت کا ہے وہ دل ہی دل میں ڈاکٹر سے محبت کرتی ہے اس کی زندگی میں کوئی غیر معمولی حرکت نہیں بس سست رفتار اور پرسکون ہے اسی سلمہ کی سوتیلی ماں اور پروفیسر کی دوسری بیوی دردانہ کا کردار ہے جو بے حد حسین عورت ہے اس نے بہت چھوٹی عمر میں پروفیسر کی علمیت اور شہرت سے مرعوب ہو کر شادی کی تھی جسے اس نے محبت کا نام دیا تھا لیکن آہستہ آہستہ اسے اپنی خواہشات کا احساس ہو کہ اسے بھی کسی نوجوان کی محبت کی ضرورت ہے کیوں کہ وہ پروفیسر کے طعن وتشنہ اور بدمزاجی سے تنگ آچکی تھی وہ ہر طرح اس کی خدمت کرتی ہے لیکن پھر بھی پروفیسر کو محسوس ہوتا ہے کہ اس کی بیوی اس کے مرض اور ضعیفی سے اکتا چکی ہے جس کا طعنہ وہ ہمیشہ دیتا رہتا ہے۔

دراصل پروفیسر صاحب دوسرے معمولی استاد کی طرح رٹائر ہو کر گم نام ہو چکے ہیں لیکن اس کے باوجود ہر ایک سے اپنی علمیت کا اعتراف چاہتے ہیں اور یہ سوچتے ہیں کہ لوگ ان کے مرض سے بے زار ہو چکے

ہیں اوران کے حقوق کی کسی کو کوئی پرواہ نہیں اسی لیے ہر وقت بدمزاجی کا مظاہرہ کرتے ہیں اب پروفیسر گاؤں کی زمین بیچ کر دوبارہ شہر جانا چاہتے ہیں جس پر حبیب ماموں اور پروفیسر کی اچھی خاصی بحث ہو جاتی ہے اور حبیب ماموں اپنی پستول سے پروفیسر پر دو بار وار کرتے ہیں لیکن دونوں بار نشانہ چوک جاتا ہے اس کے بعد حبیب ماموں خودکشی کرنے کی بھی کوشش کرتے ہیں آخر کار صلح کا راستہ نکلتا ہے کہ پہلے کی طرح زمین کی آمدنی سے پروفیسر کو شہر میں زندگی گزارنے کے لیے پیسہ بھیجا جائے گا اور پھر پروفیسر اوراس کی بیوی دردانہ شہر چلے جاتے ہیں ان کے جانے کے بعد ڈاکٹر بھی اپنے قصبے چلا جاتا ہے اوران سب کے جانے کے بعد سلمہ اور حبیب ماموں کی زندگی پھر ایک باراسی سست رفتاری پر چلنے لگتی ہے۔

یہاں ایک بات اور قابل ذکر ہے کہ ڈاکٹر سلمان اور حبیب ماموں دونوں پروفیسر کی بیوی دردانہ کے حسن اور عشق میں گرفتار ہیں حبیب ماموں دردانہ سے گاہے گاہے اپنی محبت کا اظہار کر کے اپنے دل کا غبار نکالتے رہتے ہیں لیکن دردانہ کوان سے کوئی عشق نہیں ۔ڈاکٹر سلمان بھی اپنے کاروبار کو چھوڑ کر روز دردانہ سے ملنے آتا ہے دردانہ بھی ڈاکٹر میں دلچسپی لیتی ہے لیکن اپنے شوہر سے بے وفائی ان کی محبت کے آڑے آتی ہے اسی لیے جب پروفیسر قصبہ کی زندگی سے بیزار ہو کر شہر جانے کا فیصلہ کرتا ہے تو وہ ان کے ساتھ خوشی خوشی چلی جاتی ہے۔اس ڈرامے کا مجموعی تاثر کو زاہدہ زیدی اپنے الفاظ میں اس طرح بیان کرتی ہیں:

> یہ ایک تہ دار معنی آفرین اور دلکش ڈراما ہے جس میں ذاتی زندگی کے نشیب وفراز اور کرداروں کی حساس اور باریک پیش کش کے ساتھ ساتھ چیخوف نے وسیع تر سماجی، اخلاقی اور سائنٹفک مسائل کا احاطہ بھی کیا ہے اوران کے توسط سے مستقبل کا ایک وژن بھی پیش کیا ہے اس میں علامتوں اور ڈرامے کے ہمہ جہت زبان کا استعمال بھی بڑے سلیقے سے کیا گیا ہے اور یہ حساس کردار نگاری، نفسیاتی دروں بینی، سماجی بصیرتوں اور مستقبل کے ایک تخیل آفریں تصور سے مالا مال ہے۔11؎

تین بہنیں:

انتون چیخوف کا دوسرا ڈرامہ ''تین بہنیں'' چار ایکٹ پر مشتمل ایک طویل ڈرامہ ہے یہ ڈرامہ روس کے ایک قصبہ پر محیط ہے جہاں ایک گھر میں تین بہنیں سکونت پذیر ہیں جن کا نام ماشا، اولگا اور ارینا ہے ان کے

ساتھ ان کا ایک چھوٹا بھائی اندرے اور اس کی بیوی نتاشا بھی قیام پذیر ہیں ان کا باپ جنرل پروزوروف ایک ملٹری افسر تھا جس کا انتقال ہو چکا ہے۔اسی قصبہ میں ایک ملٹری رجیمنٹ بھی رہتا ہے جن کا ان کے گھر آنا جانا ہے ان بھائی بہنوں کے علاوہ ایک خادمہ انفسا اور نوکر فیراپونٹ بھی ہے۔

اس ڈرامے میں ایک خوبصورت گھر کا منظر پیش کیا گیا ہے جہاں یہ سارے بھائی بہن قیام پذیر ہیں۔ پہلے یہ سب اپنے والدین کے ماسکو میں رہتے تھے لیکن پروزوروف کا تبادلہ روس ہوا تب وہ سب یہیں سکونت اختیار کر گئے۔ یہ سارے بھائی بہن اپنے ماضی کو یاد کرتے ہیں اور ماسکو جانے کے خواب بنتے رہتے ہیں۔ کیوں کہ روس کے برعکس ماسکو ان کی نظر میں ایک مہذب اور شائستہ شہر ہے جہاں پڑھے لکھے لوگ رہتے ہیں اور جہاں سے ان کی بچپن کی خواشگوار یادیں وابستہ ہیں ان کی نظر میں روس کے زیادہ تر لوگ جاہل ہیں یہاں پڑھے لکھے اور مہذب لوگوں کی کافی کمی ہے۔

اس ڈرامے کی شروعات اولگا کی سالگرہ سے ہوتی ہے سب اس کو مبارک باد اور دعائیں دیتے ہیں لیکن وہ اپنے باپ کی موت کو یاد کر کے دکھی ہوتی ہے آج ان کی برسی ہے جو اس کی سالگرہ کے دن ہے اس لیے وہ بہت غم زدہ ہے اولگا ایک نرم دل 20 سالہ لڑکی ہے وہ اسکول میں مسٹرس ہے عادتاً بہت سنجیدہ اور ذمہ دار ہے۔اس سے بڑی ارینہ ہے وہ ایک چنچل اور الہڑ قسم کی لڑکی ہے ایک جنرل توزن باخ اس کی محبت میں گرفتار ہے اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہے لیکن ارینا ہر وقت ماسکو کے خواب دیکھتی ہے اس کا خیال ہے کہ وہ ماسکو جا کر اپنے خوابوں کے شہزادے سے ضرور ملے گی جس سے وہ اپنے خوابوں میں عشق کرتی چلی آ رہی ہے۔ان میں سب سے بڑی ماشا ہے جو نہایت حسین وجمیل ہے جب وہ بیس سال کی تھی تب اس نے ایک اسکول ماسٹر کو لی گن سے شادی کر لی تھی جس سے اسے کوئی محبت نہیں وہ بس بے کیف اور بے ضرر زندگی گزار رہی ہے لیکن اس کی ملاقات دو بچیوں کے باپ جنرل وارشین سے ہوتی ہے جس کا ان کے گھر سے دیرینہ تعلق ہے جو اپنی بیوی کی فضول حرکتوں سے بہت پریشان ہے ماشا اور جنرل دونوں ایک دوسرے کو پسند کرنے لگتے ہیں۔

تینوں بہنوں کے مقابلے میں ان کا بھائی اندرے ماسکو جا کر پروفیسر بننے کے خواب دیکھتا ہے لیکن اس کے خوابوں کی تکمیل نہ ہونے کے باعث اب وہ سست اور کاہل ہو چکا ہے اسے ایک لڑکی نتاشا سے عشق ہو جاتا

ہے۔جس سے وہ شادی کر لیتا ہے اندرے کے مقابلے میں نتاشا بہت چالاک اور شاطر قسم کی عورت ہے جو رفتہ رفتہ نہ صرف سارے گھر پر اپنا قبضہ کر کے تینوں بہنوں کو گھر سے الگ کر دیتی ہے بلکہ اپنے عاشق کو بھی اس گھر میں رکھتی ہے جس سے اس کی ایک لڑکی بھی ہوتی ہے نتاشا کا کردار کافی متحرک ہے جو اس خاندان کی تخریب کا باعث بنتی ہے اور چالاکی اور عیاری سے سارا گھر بار اپنے قبضے میں کر لیتی ہے اس کا کردار ظالمانہ اور مصنوعی ہے۔اس ڈرامہ میں ایک کردار ہے جے بوتکن جو عمر رسیدہ ہے اور ہمیشہ اخبار کی ورق گردانی کرتا رہتا ہے وہ اس گھر کے لیے وفادار تو ہے لیکن اپنی ذمہ داری سے بے پرواہ ہے۔ڈرامے کا سب سے جاندار کردار جو ڈرامے کی فضا کو خوشگوار بناتا ہے وار اشین ہے جو ماشا کو چاہتا ہے وہ اکثر فلسفیانہ موضوعات پر دلچسپ بحث کرتا ہے وہ اپنی بیوی کی نازیبا حرکتوں سے تو پریشان ہے لیکن پھر بھی ایک روشن مستقبل کے خواب بنتا ہے جس کی وجہ سے ماشا بھی اس کی طرف بے حد کشش محسوس کرتی ہے کیوں کہ وہ بھی اپنے عمر رسیدہ ماسٹر شوہر سے مایوس ہے۔

چیخوف کا یہ ڈرامہ بھی انسانوں کی نفسیاتی الجھنوں اور ذہنی کشمکش کو پیش کرتا ہے اور سماجی و معاشرتی ماحول کی پس ماندگی و اخلاقی قدروں کے زوال کی طرف بھی اشارہ ہے۔اس ڈرامے کے تمام کردار کسی نہ کسی ذہنی الجھن کا شکار ہیں ان کے ذہنوں میں ماضی کی تصویریں ہیں اور اپنے شاندار ماضی کی یادوں کو بار بار دہراتے ہیں اور موجودہ زندگی سے بیزار نظر آتے ہیں لیکن انہیں ایک پر مسرت امید بھی ہے زندگی میں ہونے والی پریشانیوں اور مایوسیوں میں وہ لوگ ضرور ہیں لیکن آنے والی نسلیں ضرور چھٹکارا حاصل کر لیں گی بلکہ وہ اپنی آنے والی زندگی کو مسرت وسکون کے ساتھ گزارنے کا وعدہ کرتے ہیں اس طرح اس ڈرامے کے مایوس کن کردار پر امید نظر آنے لگتے ہیں جس کی خوش آمدید رجمنٹ کا بجنا ہے۔

زاہدہ زیدی اس ڈرامے کے متعلق لکھتی ہیں:

> تین بہنیں آفاقی بصیرتوں کے ساتھ سماجی بصیرتوں سے بھی مالا مال ہے اور نہ صرف ماحول کی پس ماندگی، بے حسی، جہالت، تنگ نظری اور اخلاقی ابتذال کا منظر ابھر کر سامنے آتا ہے بلکہ یہ احساس بھی سر اٹھاتا ہے کہ اس پس ماندہ اور دور افتادہ قصبے میں بھی ترقی اور روشن خیالی کی کونپل پھوٹ سکتی ہے پورا ڈرامہ گونا گو موضوعات، افکار، ذہنی کیفیت، جذبات، احساسات، تخیل آفریں تصورات، معنی خیز علامتوں اور بصیرت افروز اشاروں کا ایک دلکش منظر

ہے جوسب ایک دوسرے میں پیوست ہیں اور جنہوں نے اس ڈرامے کی ساخت کو ایک symphony سے قریب کر دیا ہے وراس منظرنامے کی تشکیل میں تھیٹر کی ہمہ جہت زبان اور زبان اور مالا مال ترسیلی وسائل کا استعمال بہت ہے یہی تخیل آفریں اور شاعرانہ ہے۔12؎

چیری کا باغ:

چیری کا باغ چیخوف کا سب سے مشہور ڈرامہ ہے جس میں چیخوف نے مٹتے ہوئے سرمایہ دارانہ نظام کی تصویر کشی کی ہے اس کہانی کا مرکز چیری کا باغ ہے جس کی مالک ایک جاگیردار خاتون ''رانوسکایا'' اور اس کا بھائی ''گاویو'' ہے جن کی جائداد اب ختم ہوتی جا رہی ہے بلکہ سرمایہ دارانہ نظام کے خاتمے کو چیخوف نے علامت بنا کر چیری کے باغ کو پیش کیا ہے رانوسکایا کی جائداد تو ماسکو میں ہے لیکن وہ کچھ عرصہ سے اپنے شوہر اور بیٹے کے انتقال کے بعد اپنے عاشق کے ساتھ روس میں رہنے لگی تھی اور اس کی عیاشیوں کا خرچ بھی برداشت کر رہی تھی اس کی ایک بیٹی آنیا سترہ سالہ ہے جو ایک یونیورسٹی کے طالب علم تروفی موف کو نہ صرف پسند کرتی تھی بلکہ اس کے ترقی پسند خیالات سے بھی مرعوب تھی آنیا کو ماضی اور آباؤاجداد کی جائداد سے کوئی سروکار نہیں بلکہ وہ ماضی کو ایک نئے انداز سے دیکھتی ہے اور نئے مستقبل کا ستقبال کرنے کے لیے بھی تیار ہے۔ رانوسکایا کی ایک منہ بولی بیٹی واریا بھی ہے وہ ایک سنجیدہ اور ذمہ دار عورت ہے اپنے روپئے کی قدر و قیمت جانتی ہے بلکہ رانو کو بھی اس کی فضول خرچی سے بھی آگاہ کرتی ہے لیکن رانو اپنے زمیندار ہونے کی وجہ سے اس کے اندر وہی ساری خصوصیات موجود ہیں جو ایک سرمایہ دار میں ہوتی ہیں اسے اور اس کے بھائی کو اپنی جائداد کے نیلام ہونے کا افسوس تو ہے لیکن وہ اس کو بچانے کے لیے کوئی قدم نہیں اٹھاتے بلکہ کاہل وسست ہیں اور پوری طرح سے قرض میں ڈوبے ہیں۔

انہیں کی طرح ایک اور سرمایہ دار کا بیٹا فیرس بھی قرض میں ڈوبا ہوا ہے اس کی بھی تمام جائداد نیلامی کے داؤ پر لگی ہوئی ہے ان سرمایہ داروں کے علاوہ ان کے ملازم اور ملازمائیں بھی ابھی تک خود کو سرمایہ داروں کے خادم سمجھتے ہیں جس طرح وہ پہلے ہوا کرتے تھے بوڑھی گورنس شارلوٹا جو حقیقت سے نظریں چرائے صرف جادوگری دکھانے میں مشغول رہتی ہے دوسری ایک اور نوجوان خادمہ دونیاشا ہے جو ہر وقت سجنے سنورنے میں

لگی رہتی ہے جس پر رانو سکایا کا ایک کلرک گیا دونی بائیس فریفتہ ہے ایک اور خادم پاشا ہے جس کو رانو اپنے ساتھ ماسکو سے لائی ہے۔ یہ سب حقیقی زندگی سے نظریں چرائے اپنے مالکوں کی طرح ماضی کے اندھیرے میں ڈوبے ہوئے مستقبل سے بے خبر ہیں۔

ان سب میں یونیورسٹی کا طالب علم اور سکایا کی بیٹی آنیا کا عاشق کے خیالات کچھ حد تک متاثر کن ہیں وہ اگر چہ یونیورسٹی میں کئی مرتبہ فیل بھی ہو چکا ہے لیکن اس کے خیالات میں بغاوت ہے اور مزاج انقلاب پسند ہے وہ ایک نئے مستقبل کی آمد کا منتظر ہے جہاں سرمایہ داری نہیں بلکہ برابری موجود ہوگی اور سب سماجی حیثیت سے برابر ہوں گے لیکن اسے رانو کے چیری کے باغ کے نیلام ہونے کا بھی بہت دکھ ہے رانو سکایا سے اسے پوری ہمدردی ہے لیکن پھر بھی وہ نئے نظام کا زیادہ منتظر ہے۔ ڈرامے کا ایک اور اہم کردار لوپاخن ہے جو ایک غریب کسان کا بیٹا ہے اس کے آباءاجداد رانو کے گھر کے خادم تھے اور اسی کی زمین پر کام کرتے تھے لیکن آج لوپاخن ایک امیر و کبیر آدمی ہے اس کے پاس پیسہ ہے جائداد ہے اور سب سے اہم بات یہی لوپاخن رانو کے آباء کا چیری کا باغ خریدتا ہے اور جب چیری کا باغ کی نیلامی ہوتی ہے تو وہ سب سے زیادہ رقم دے کر نیلامی کا ختم کرتا ہے۔ اور چیری کے باغ کا مالک بن جاتا ہے۔

اور یہی اس ڈرامے کا علامتی پہلو ہے جہاں ایک غریب کسان کا بیٹا اس لائق ہو گیا ہے کہ وہ اپنے مالکوں کی جائداد خرید لیتا ہے اور وہ زمین دار اور سرمایہ دار جن کی کسی زمانے میں ہر طرف شور و غل تھا ان کا اب خاتمہ ہو چکا ہے جس کا مطلب صاف ہے کہ سماجی ڈھانچے میں تبدیلی ہو رہی ہے اور سرمایہ دار اپنی بے عملی اور کاہلی و سستی سے اپنے خاتمے کی طرف جا رہے ہیں جس کو چیخوف نے ایک علامتی اور مضحکہ خیز انداز میں پیش کیا ہے۔ زاہدہ زیدی اس طرح اظہار خیال کرتی ہیں؛

> چیری کا باغ اس ڈرامے کا مثبت پہلو مرکزی علامت ہے جس کے وسیلے سے ہم نہ صرف مختلف کرداروں کی ذہنی کیفیات اور فلسفیانہ حیات سے روشناس ہوتے ہیں بلکہ کئی گہری سماجی اور آفاقی بصیرتوں کا عرفان بھی کرتے ہیں رانو سکایا کے لیے یہ باغ بچپن کی حسین یادوں کا گہوارہ ہے اور گایو کے لیے خاندان کی روشن یادگار، تروفی موف کے لیے یہ سماجی ناانصافی اور استحصال کی علامت ہے اور آنیا کے لیے ایک ایسی محبوب شئے جو اب اپنی دلکشی کھو چکی ہے فیرس

کے لیے ایک ایسے آئیڈیل نظام اور طرز زندگی کی علامت جسے اب کوئی سمجھ بھی نہیں سکتا اور لوپاخن کے لیے یہ ایک بہت پرانا باغ ہے جو اپنی موجودہ صورت حال میں تو بالکل نفع بخش نہیں لیکن اس کو کٹوا کر زمین سے دولت کمائی جا سکتی ہے مجموعی طور پر اسے جاگیرداری نظام کی علامت کہا جا سکتا ہے جو اب اپنی توانائی کھو چکا ہے اور جسے دیر یا سویر سرمایہ داری اور صنعتی نظام کے ہاتھوں پامال ہونا ہے۔13

دراصل چیخوف کے اگر ان سب ڈراموں کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ چیخوف کا طرہ امتیاز کرداروں کی ذہنی اور نفسیاتی کشمکش کو پیش کرنا ہے جہاں بیش تر کردار حقیقی زندگی سے نظریں چرائے فرار کی راہیں تلاش کرتے نظر آتے ہیں چیخوف نے انہیں کرداروں کی نفسیاتی گرہوں کو بڑے فنکارانہ اور ڈرامائی انداز سے کھولا ہے اس کے ڈرامے غیر معمولی اثر انگیزی رکھتے ہیں اور تاثراتی اظہار اور علامت نگاری کا دلکش امتزاج ہیں۔

انصاف کا دائرہ:

مشہور مغربی ڈرامہ نگار بارتول بریخت کا ڈرامہ ہے جسے زاہدہ زیدی نے اردو میں ترجمہ کیا ہے اس ڈرامے میں دو کہانیوں کو الگ الگ پس منظر میں پیش کیا گیا ہے پہلی کہانی ایک غریب لڑکی گروشا وشناورنے کی ہے جو ایک امیر گورنر جورج ابالی کے گھر باورچی میں کام کرتی ہے گورنر کی بیوی کا نام ناتیلا اباشولی ہے اس کا ایک دودھ پیتا بچہ بھی ہے جس کا نام مائیکل ہے گروشا کا منگیتر سائمن ہے وہ ایک سپاہی ہے وہ جنگ پر گیا ہوا ہے۔ دوسری کہانی ایک جج اژدک کی ہے جو غریبوں کا ہمدرد، مسیحا اور ان کا انصاف پرور ہے وہ ہمیشہ غریب اور مظلوں کے حق میں فیصلہ کرتا ہے اس کا فیصلہ کرنے کا بھی اپنا الگ انداز ہے وہ امیروں سے پیسے تو وصول کرتا ہے لیکن فیصلہ ہمیشہ غریب اور مظلوم کے حق میں ہی دیتا ہے۔ یہ کہانی دونوں الگ الگ بیان کی گئی ہیں لیکن آخر میں دونوں کو آپس میں پیوست کر دیا گیا ہے۔

کہانی 1945 کے موسم سرما سے شروع ہوتی ہے کیشیا کے ایک گاؤں میں کچھ لوگ اکٹھا بیٹھے ہیں کیشیا جو کہ اب جنگ میں برباد ہو چکا ہے سب لوگ آپس میں دوران جنگ ہونے والے نقصانات اور جنگ میں پیش آنے والے واقعات کا ذکر کر رہے ہیں سیب کا باغ، ڈیری کا فارم اور چراگاہیں سب برباد ہو چکی ہیں اور ان کی کچھ وادیاں بھی جنگ میں دشمنوں کے قبضے میں چلی گئی ہیں جسے وہ دشمن سے واپس لینے کے منصوبے بناتے ہیں

ان کی پرانی ہر چیز برباد ہو چکی ہے نئی چیزیں انہیں اب وہ مزہ نہیں دیتیں جس کی مثال وہ ایک پنیر کے ٹکڑے سے دیتے ہیں کہ اس میں اب وہ ذائقہ نہیں رہا جو پہلے تھا ایک ڈیلی گیٹ اس بات کی دلیل اس طرح پیش کرتا ہے:

کامریڈ ذرا سوچیے ہر شخص اپنے وطن سے اتنی محبت کیوں کرتا ہے صرف اس لیے کہ وہاں کی روٹی زیادہ مزیدار معلوم ہوتی ہے اور ہوا خشبودار نظر آتی ہے لوگوں کی آوازیں زیادہ خوشگوار ہوتی ہیں اور زمین ہموار ہوتی ہے جس پر چلنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔[14]

اس لیے وہ سب جنگ میں کھوئی ہوئی اپنی وادی کو دشمن سے واپس لینے کا وعدہ کرتے ہیں اور ایک رپورٹ بناتے ہیں جس میں اپنے وطن میں مختلف چیزوں کی سہولیت اور فراوانی کرنے کا تہیہ کرتے ہیں۔ان میں ایک شخص کہتا ہے جس کا نام کاٹو ہے:

میں نے ایک آب پاشی کا منصوبہ تیار کیا ہے اگر ہم پہاڑی جھیل پر ایک باند باندھ دیں تو تین سو میٹر ہیکٹر بنجر زمین کو سیراب کیا جا سکتا ہے اور اسی صورت میں ہمارا کلخوزنہ صرف عام پھلوں کی کاشت میں خاطر خواہ اضافہ کر سکتا ہے بلکہ انگور کی کاشت میں بھی ممکن ہے جس سے شراب کشیدہ کی جا سکتی ہے البتہ اس منصوبے کی کامیابی کا انحصار اس بات پر ہوگا کہ ''روزالکز میرگ'' نام کی وادی بھی اس میں شامل کر لی جائے۔[15]

تو دوسری طرف ایک بوڑھا کہتا ہے کہ رپورٹ میں یہ بھی لکھ دیا جائے کہ ہم وہاں ایک گھوڑوں کا فارم بھی بنانا چاہتے ہیں۔[16]

اور پھر اس رپورٹ کو تیار کرنے اور اس کا نقشہ بنانے کے بعد سب خوشی میں ایک پارٹی کا انعقاد کرتے ہیں جس میں مغنی کارکادی تشیدزے کے ذریعہ ایک ڈرامہ کی پیش کش ہوتی ہے جس میں وہ اسی غریب لڑکی گروشا کی کہانی پیش کرتا ہے۔جو کیشیا کے ایک شہر کے ظالم گورنر جورج اباشولی کی باورچن تھی۔اباشولی کے پاس کے مانند خزانہ تھا اس کی بیوی ناتیلا اور بچہ مائیکل تھا اور اس گورنر کی فوجیں ایران محاذ پر گئی ہوئی تھیں لیکن اب خبر آرہی تھی کہ اس کی فوجیں پیچھے ہٹ رہی ہیں اور دشمنوں کی فوجیں شہر کے اندر داخل ہو رہی ہیں اور دشمن کی نظر محل کی طرف ہیں اور آخر کار دشمن محل کی طرف پہنچ جاتے ہیں گورنر دو مسلح سپاہیوں کے درمیان زنجیروں

سے جکڑا ہوا ہے اس کے افسر اسے بھاگ جانے کو کہتے ہیں لیکن مسلح سپاہی گورنر کو لے جاتے ہیں۔

گورنر کی بیوی کو بھی اس کے افسر جلد از جلد بھاگنے کے لیے کہتے ہیں اور ساتھ ہی محل کے دوسرے خادم اور خادماؤں کو بھی۔اور یہ تاکید کرتے ہیں کہ ساتھ میں صرف ضرورت کی کچھ ہی چیزیں لی جائیں لیکن گورنر کی بیوی اپنے لباس اور زیورات کے صندوق جمع کرنے میں لگی ہوئی ہے آخر کار دشمن آ پہنچتے ہیں اور پھر وہ اپنے معصوم بچے کو بھی چھوڑ کر نہ جانے کہاں بچ نکلتی ہے لیکن گروشا جو ایک معصوم خادمہ ہے جس سے اس کے منگیتر سائمن نے آج ہی منگنی کی تھی اور اس سے پیار محبت کی باتیں کر کے جنگ کی محاذ سے واپس آنے کا وعدہ کر کے جا چکا تھا۔وہ بھی جان بچا کر بھاگ نکلنے کے لیے دوڑتی ہے لیکن راستے میں اسے مائیکل نظر آجاتا ہے جسے اس کی ماں چھوڑ کر جا چکی تھی گروشا کو اس پر رحم آجاتا ہے اور اٹھا کر اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔لیکن دشمن سپاہی اس کے پیچھے پڑ جاتے جاتے ہیں وہ کسی طرح بھاگتی ہوئی اور پتھروں کا راستہ طے کرتی ہوئی اپنے بھائی کے گھر پہنچ جاتی ہے جس کا گھر وادی سے دوسری طرف ہے راستے میں وہ بچے کو ایک کسان عورت کے دروازہ پر ڈال دیتی ہے لیکن سپاہی وہاں بھی پہنچ جاتے ہیں آخر کار گروشا کسی طرح دوبارہ بچے کو لے کر وہاں سے بھاگنے میں کامیاب ہو جاتی ہے اور پھر اپنے بھائی کے گھر پہنچتی ہے۔

لیکن اس کی بھابی مذہبی قسم کی عورت تھی جو کسی دوسرے مرد کا بچہ بنا شادی کے اپنے گھر میں رکھنے کو تیار نہیں ہوتی اس لیے اس کا بھائی ایک بیمار کسان سے گروشا کی شادی کر دیتا ہے تاکہ گروشا اور اس کے بچے کو باپ کا نام اور گروشا کو رہنے کو سر پر چھت مل جائے اس کے عوض اس کے بھائی کو اس مرد کی ماں کو کافی رقم بھی دینی پڑتی ہے اور پھر کسی طرح شادی مکمل ہو جاتی ہے۔مگر شادی ہوتے ہی وہ بیمار آدمی ٹھیک ہو جاتا ہے پھر اس کے بعد گروشا کو اس آدمی اور اس کی ماں کی خدمت اور ان کے ظلم وستم سہنے پڑتے ہیں۔ایک دن اچانک سائمن محاذ سے واپس آجاتا ہے اور وہ اب گروشا کے سامنے کھڑا تھا۔اب گروشا مجبور تھی اس نے اپنے پیارے مائیکل کے لیے ساری مصیبتیں اور پریشانیاں برداشت کی تھیں حتیٰ کہ اس کو باپ کا نام دینے کے لیے سائمن کے وعدے کو توڑ کر کسی اور سے شادی بھی کر لی۔اب وہ سائمن کے پاس نہیں جا سکتی تھی اور سائمن جو شاید اسے بے وفا سمجھ رہا تھا لیکن گروشا نے سائمن کو سب کچھ سچ سچ بتا دیا اور پھر کچھ عرصہ بعد جب کہ مائکل بڑا ہونے لگا تھا

اس پر اس کی اصلی ماں نے مقدمہ درج کر دیا تھا جس وجہ یہ تھی کہ وہ جورج اباشولی کا وارث تھا اور جب تک مائکل واپس اپنے محل نہیں جائے گا ناتیلا اباشی کو جائداد میں حصہ نہیں ملتا اس لیے اب اس نے مائکل کو واپس حاصل کرنے کے لیے مقدمہ کر دیا تھا۔

اور اس کا مقدمے کا فیصلہ اسی جج کے پاس جاتا ہے جو دوسری کہانی کا کردار ہے اس کا نام اژدک ہے وہ بہت ذہین اور غریبوں کا ہمدرد ہے اس نے قانون کے خلاف بہت سے فیصلے دیئے ہیں لیکن ان فیصلوں میں بھی اس کا انصاف اور ہمدردی نظر آتی ہے اس کا خیال ہے کہ امیروں سے پیسے لے کر غریبوں میں تقسیم کرنا چاہئے اور وہ اسی روش پر چلتا ہے امیروں کی جیبوں سے پیسے نکلواتا ہے لیکن فیصلہ غریب اور مظلوں کے حق میں کرتا مغنیٔ اژدک کا تعارف اس طرح کرواتا ہے:

جب شہر آگ کے شعلوں کا لباس پہنے تھا
اور خون کے دریاؤں میں طغیانی تھی
کیڑے مکوڑے ہر دراڑ سے جھانک رہے تھے
اور دربار میں سازشوں کا بازار گرم تھا
گرجا گھروں میں مذہب پر چھینٹے اچھالنے والوں کی ریل پیل تھی
تو اس وقت جج کی کرسی پر اژدک جلوہ افروز تھا۔ 17

اژدک نے کئی اہم معاملات کی سنوائی کی اور بہت سے رشوت خوروں کو سزا دی اور ظالموں سے رشوت لینے کے بعد بھی ان کے حق میں فیصلہ کر کے ہمیشہ مظلوموں کی فریادسنی۔

جب مائکل کا مقدمہ لے کر ناتیلا اباشی اس کے پاس جاتی ہے جس نے ہمیشہ غریبوں سے نفرت کی تھی جسے جھگی جھونپڑی سے بدبو آتی تھی اسے اژدک پسند نہیں آتا پھر بھی اس کے فیصلے کا انتظار کرتی ہے کیوں کہ اصلی ماں وہی تھی لیکن مائکل کو حاصل کر کے دولت اور شہرت اس کا مقصد تھا۔ گروشا بھی اژدک کو سب کچھ بتا دیتی ہے کہ کتنی مشکلوں کا سامنا کر کے اس نے مائکل کو پالا پوسا تھا اور اب وہ مائکل کو واپس نہیں دے سکتی جس کے لیے اس نے دنیا بھر کی تکلیفیں اٹھائی ہیں

اژدک فیصلہ سنانے سے پہلے مائکل کو ایک گولے میں کھڑا کر دیتا ہے اور دونوں یعنی گروشا اور ناتیلا کو حکم دیتا ہے کہ جو مائکل کو اپنی طرف کھینچ لے گی بچہ اسی کا ہے ناتیلا بچے کو کھینچ لیتی ہے کیونکہ گروشا مائکل کا ہاتھ چھوڑ دیتی ہے دوسری مرتبہ جج نے پھر یہی حکم دیا اور گروشا پھر مائکل کا ہاتھ یہ کہ کر چھوڑ دیتی ہے کہ میں نے اس بچے کو اتنی مشکل سے پالا ہے اس کی ہڈی پسلی کیسے توڑ سکتی ہوں اور پھر یہ سنتے ہی اژدک مائکل گروشا کے حوالے کر دیتا ہے اور ناتیلا کو ڈانٹ ڈپٹ کر بھگا دیتا ہے۔ اتنا ہی نہیں اژدک کے پاس ایک بوڑھا جوڑا طلاق لینے آتا ہے جنہیں وہ طلاق نہ دے کر گروشا اور کسان کی طلاق پر دستخط کر دیتا ہے اس طرح سائمن اور گروشا بھی مل جاتے ہیں اور اژدک کے انصاف پر یہ ڈرامہ ختم ہو جاتا ہے۔

مغنی ان دونوں کہانیوں کو لگ الگ پس منظر میں پیش کرتا ہے لیکن آخر میں دونوں کہانیوں کو ایک مرکز پر جمع کر دیتا ہے جو اژدک کے انصاف پر ختم ہو جاتی ہیں۔ زاہدہ زیدی اس ڈرامے کے متعلق لکھتی ہیں:

> انصاف کا دائرہ 1945 بارتول بریخت کے آخری دور کا ایک شاہکار ڈرامہ ہے جس میں مصنف نے اپنے ایپک تھیٹر کے تصور کو بڑے معنی خیز اور تخیل آفریں انداز سے پیش کیا ہے ڈرامے کا بیانیہ انداز، اس میں مغنی کا اہم رول ،ڈرامے کے ایکشن میں تضادات کی بیک وقت پیش کش، نغموں کی فراوانی اور اداکاری کا انداز جس میں کردار اپنے رول کو جذباتی انداز سے پیش کرنے کے بجائے معروضی انداز سے پیش کرتے ہیں۔ کچھ ایسی خصوصیات ہیں جو اسے ایپک انداز کا ایک نمائندہ ڈرامہ بناتی ہیں۔ اس ڈرامے کی بنیاد ایک چینی کہانی پر ہے۔ جسے بریخت نے اپنے ہی انداز سے پیش کیا ہے اور اس میں امن اور جنگ، قانون اور انصاف، سماجی نابرابری اور عوام کے حوصلوں جیسے مسائل کو بڑی چابکدستی سے سمویا ہے۔ 18

انسان اپنی تلاش میں:

یہ کتاب زاہدہ زیدی نے رولو مے کی کتاب Man,s search for himself,1953 ترجمہ کی ہے۔ Roll Reese May ایک امریکی فلوسفر تھا جو وجودی نظریہ کا حامل اور شہرہ آفاق کتاب Loreand will,1969 کا مصنف تھا۔ رولو مے کی پہلی کتاب The Art of counselling 1939 ہے جس میں اس نے اپنے Counselling کے تجربات و مشاہدات کا ذکر کیا ہے۔ کتاب میں کچھ دوسرے عنوانات کو بھی

شامل کیا گیا ہے جیسے مذہب، ہمدردی،نفسیات اور ذہنی کشمکش۔اوران چیزوں کے بارے میں رولو مے نے اپنا نظریہ بھی پیش کیا ہے کہ انسان ان پریشانیوں کو کس طرح حل کر سکتا ہے۔

رولو مے چونکہ نفسیاتی معالج تھا اس لیے اس نے انسان کی شخصیت ،اس کے کردار،اس کے ذاتی و شخصی مسائل،زندگی میں پیش آنے والی مختلف ذہنی ونفسیاتی پریشانیوں اور داخلی واندرونی مسائل کا نہ صرف مطالعہ ومشاہدہ کیا بلکہ ان مسائل سے نپٹنے اوران کو حل کرنے کے لیے اپنا نظریہ پیش کیا ہے۔رولو مے کی بھی درجنوں کتابیں ہیں جن میں کچھ کا ذکر کیا جاتا ہے۔

1۔The spring of creative living(A study of human nature and god,1940)

2۔The meeting of anxiety,1950

3۔Existence ,1958

4۔Psychology and human Dilemma ,1962

5۔Love and will,1962

6۔Power and innocence:A search for the sources of violence,1972

7۔Pauls:Reminiscence of a friendship,1973

8۔The courage to create,1975

9۔Freedom and Destiny,1981

10۔The Discovery of being:Writings in Existential psychology,1983

11۔My Quest for beauty,1985

12۔The cry for myth,1991

13۔The psychology of Existence

رولو مے کو اس کی بہت سی کتابوں پر مختلف انعامات سے بھی نوازا گیا ہے love and will کے لیے The ralph waldo emerson award,1972 میں ملا۔ The power and

The American psychologiscal ۔میں ملا J.R award1987 کے لیے innocence

کے Lifetime contribution میں foundation gold medal award,psychology لیے۔

زاہدہ زیدی نے رولومے کی کتاب Man,s search for himsel کا اردو ترجمہ ''انسان اپنی تلاش میں'' کے نام سے کر کے 1986 میں ترقی اردو بیورونئ دہلی کے زیر اہتمام شائع کیا۔ یہ کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے اوران ابواب میں بھی ذیلی عنواتات قائم کئے گئے ہیں۔

اس کتاب میں دورجدید میں انسان کی تنہائی اورتشویش سے متعلق مسائل کو بیان کیا گیا ہے جو انسان آج کے بحرانی دور میں جھیل رہا ہے۔آج سماج میں ایک طرح کی اتھل پتھل ہے۔چاروں طرف انسان کی شکست وریخت کا منظر بر پا ہے جنگ کا خوف لوگوں کو اپنے سر پر نظر آتا ہے۔ایسے میں انسان کے اندر ایک طرح کا خوف اور دہشت ہے۔انسان کو خود اپنی ذات اور مستقبل پر سے بھروسہ اٹھ گیا ہے۔وہ ہمہ وقت اسی کشمکش میں ہے کہ وہ کیا ہے اوراس کی ذات کا کیا مقصد ہے اسی طرح کے سوال اس کے ذہن میں بار بار اٹھتے ہیں وہ شدید غیر محفوظیت محسوس کرتا ہے اور پھر اسے اس کا ذہن اس بات پر اکساتا ہے کہ اندرونی یک جہتی کے حصول میں وہ کامیاب ہوسکتا ہے یا نہیں۔رولومے نے انہیں اب باتوں اورانسانی پریشانیوں کو نمایاں کر کے اس کے متعلق اپنا نظریہ پیش کیا ہے اوران مسائل کا حل کرنے کی تدبیر بھی بتائی ہے۔

پہلے باب میں دورجدید کے انسان کی تنہائی اورتشویش کو بتایا ہے کہ انسان کس طرح آج تنہائی کا شکار ہے جس کی وجہ سے وہ اندر کھوکھلا سے ہوتا جارہا ہے اورآج کے انسان کا سب سے بڑا مسئلہ اس کا یہی خالی پن کا احساس ہے۔جس کے نتیجے میں انسان ادھر ادھر بھٹک رہا ہے اور زندگی میں ہونے والی مختلف پریشانیوں سے جوجھتا ہے اور کبھی خود سے مطمئن نہیں ہوتا ،کبھی اپنے عشقیہ جذبات کی وجہ سے کبھی شادی شدہ اور گھریلوزندگی میں سکون کی کمی یا جنسی خواہشات کی تکمیل نہ ہو پانا۔یہ تمام چیزیں لوگوں کو ذہنی پریشانی میں مبتلا کرتا ہے۔جس کی حقیقت ررولومے نے لوگوں کے لیے جنس میں ایک خالی خولی میکانکی اور سطحی تجربہ بتایا ہے۔رولومے نے ٹی۔ایس۔ایلیٹ کے کچھ اشعار کا حوالہ بھی دیا ہے۔جس میں داخلی تجربات کی صدائے

بازگشت کومحسوس کیا ہے جس کا ترجمہ زاہدہ زیدی نے اس طرح کیا ہے:

ہم ہیں انسان سب کھوکھلے
ہم ہیں انسان بھوسہ بھرے
سب کے سب دوسرے پر ٹکے
سر میں بھوسہ بھرے۔ہائے افسوس 19؎

دور حاضر کی یہ ایک اہمیت ہے کہ انسان اپنے آپ کو اکیلا اجنبی اور دوسروں سے کٹا ہوا محسوس کرتا ہے۔لیکن ایک سب سے بڑا مسئلہ یہ بھی ہے کہ انسان کو خود یہ نہیں معلوم کہ وہ کیا چاہتا ہے جس سے اسے اپنی خواہشات کو رہبری کرنے میں مدد ملے۔اسی لیے اسے ہر جگہ خالی پن اور تنہائی کا احساس گھیرے رہتا ہے اور یہ احساس تنہائی میں آج کے دور میں کچھ الگ قسم کا کہ لوگ بھیڑ میں پارٹی میں اور لوگوں کے مجمع میں بھی خود کو اکیلا محسوس کرتے ہیں جو اسی کا اشارہ ہے کہ انسان کا خالی پن اسی کی ذات کا خالی پن ہے اور پھر وہ خود سے دوسروں سے فرار اختیار کرتا ہے انسان کے اس کھوکھلے پن تنہائی اور خالی پن کا اصل مقصد تشویش بتایا ہے جس کو زاہدہ زیدی نے رولوے کا اس طرح ترجمہ کیا ہے؛

عہد حاضر کے انسان کی تیسری خصوصیت یعنی تشویش،احساس تنہائی اور خالی پن کے احساس کی نیست زیادہ بنیادی ہے۔شاید ہم تنہائی اور خالی پن سے اسی قدر خائف نہ ہوتے اگر یہ احساسات اس نفسیاتی اذیت اور ہیجان کا پیش خیمہ نہ ہوتے جس کو تشویش کہا سکتا ہے۔20؎

اسی طرح اس نے پورے قوم کی الجھنوں اور پریشانیوں کا سبب تشویش کو بتایا ہے جس کی وجہ سے عقل منداور ذہین بھی لایقینی کی زندگی گزار رہا ہے اور بے یقینی کی دلدل میں پھنسا ہوا ہے جو نفسیاتی الجھنوں اور داخلی اتھل پتھل کی صورت میں نمودار ہورہی ہے اور جس کے سبب انسان حقیقت سے فرار اختیار کر رہا ہے یا حقیقی مسائل پر کسی نہ کسی طرح پردہ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے کیوں کہ انسان کسی سے آنکھیں ملانے اور جرات مندانہ سامنا کرنے کی ہمت نہیں رکھتا ہے۔

اس کے بعد اس کتاب میں ان سب مسائل کی جڑ سوسائٹی میں اقدار کے مرکز کی گمشدگی ،احساس

ذات کا زیاں، ذاتی ترسیل کی زبان کا زیاں، فطرت میں ہمارا اختیار نہ ہونا اور ان سب المیوں کا احساس زیاں عنوانات کے تحت اس بات پر بحث کی ہے کہ آج وہ کون سے مسائل ہیں جن کے باعث انسان اس قدر الجھن اور حیرانی کا شکار ہے۔ پھر اس کی تلاش، سوسائٹی اور معاشرہ میں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے جس کی وجہ ہماری قدیم اقدار گم ہو جاتا ہے دوسرا انسانی احساس کی ترسیل کا بھی کوئی معنی نہیں رہ گئے ہیں اب محبت اور رشتے اپنی اصل معنی کھو چکے ہیں ان کا صرف میکانکی وجود باقی ہے۔

حصہ دوم میں ذات کی بازیافت کے بارے بتایا گیا ہے کہ انسان کی ذات کی کس طرح نمود ہو سکتی ہے۔ لوگ خود آگاہی کس طرح حاصل کر سکتے ہیں اپنے وجود کے لیے کس طرح جدوجہد کریں اور شعور ذات تک کی منزل کو کس طرح پا سکتے ہیں۔ اس حصہ میں پہلے باب میں ذات کی نمود، تجربہ، خود آگاہی، انسان کا طرہ امتیاز، خود نفرتی، خود منزلی کا بدل، خود آگاہی باطن بینی کا مترادف نہیں، اپنے جسم اور جذبات کا تجربہ۔ دوسرے باب میں جدوجہد، نفسیاتی ڈور کا انقطاع، ماں کے خلاف جدوجہد، اپنی دست نگری کے خلاف جدوجہد، شعور ذات کی منزلیں وغیرہ عنوانات ہیں۔ جس میں فرداً فرداً ان موضوعات پر بحث کی گئی ہے اور مثالوں سے اس کی وضاحت کی ہے کہ کس طرح آج ہمارا معاشرہ خالی پن اور تشویش کا شکار ہوا اور اب ہم ان سے کس طرح چھٹکارا حاصل کر سکتا ہے۔

حصہ سوئم یک جیتی کی منزل مقصود۔ اس حصہ میں بھی اسی تشویش اور خالی پن کے موضوع سے بحث کی گئی ہے۔ جس میں مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت اس تشویش، تنہائی اور خالی پن کی مکمل بحث اور اس مسئلہ کا حل پیش کیا گیا ہے۔

پہلا باب۔ آزادی اور داخلی قوت، وہ شخص جسے پنجرے میں قید کر دیا گیا ہے، آزادی کیا نہیں ہے، آزادی کیا ہے، آزادی اور سماجی ساخت۔

باب دوم۔ تخلیقی خیر، آدم اور پرومیتھیوس، مذہب۔ انسانی کمزوری یا قوت کا سرچشمہ؟، ماضی کا تخلیقی استعمال، فرد کی قدر شناسی اور اثبات اقدار کی صلاحیت۔

باب سوم۔ جرات پختہ شخصیت کا امتیاز، جرات، اثبات ذات، محبت۔ ایک پیش لفظ، حقیقت کا سامنا

کرنے کی جرات۔

باب چہارم۔انسان فاتح وقت کی حیثیت سے،انسان گھڑی کی سوئی کا غلام نہیں،لمحہ تخلیق،ابدیت کی روشنی میں،اورزمانے بھی ہیں۔

اس طرح اس پوری کتاب میں آج کے بحران زدہ سماج کے لیے انسان کی ذاتی ، داخلی اورنفسیاتی الجھنوں کے مسائل کی عکاسی کی گئی ہے جواس جنگی اور بحرانی دور کی نمایاں خصوصیات بن چکی ہیں۔اور جس میں انسان تنہائی،کھوکھلے پن اورتشویش کا شکار ہےاوران سب مسائل کا حل اسے اپنی ذات سے خودآ گاہی حاصل کر کے ہی مل سکتا ہے کیوں کہ آج سماج میں ان مسائل کی وجہ سے چھوٹا سے چھوٹا بچہ بھی ذہنی مریض نظر آتا ہے۔ یہ کتاب انسان کواپنی خودآ گاہی اوراپنی مدد آپ کرنے کا زیادہ نہیں تو کچھ اہم اشارے ضرور فراہم کرسکتی ہے جس کی مدد سے انسان خود کا،اپنی ذات اوراپنے اندرون کا ضرور جائزہ لے سکتا ہے۔رولومے نے اپنی کتاب کے مقدمے میں بھی اس کی وضاحت کی ہے؛

> یہ کتاب نفسیاتی علاج کانعم البدل نہیں اور نہ اپنی مدد آپ کرنے کا کوئی سستا اور آسان نسخہ ہے جس کی مدد سے چٹکی بجانے میں یہ مسائل خود بخود حل ہوجائیں۔لیکن ایک گہرے اوراہم معنوں میں ہراچھی کتاب اپنی مدد آپ کرنے کا وسیلہ بن سکتی ہے۔کیوں کہ اس کے آئینے میں ایک قاری اپنے تجربات اور مسائل منعکس دیکھ کر ذاتی یکجہتی کی جدوجہد میں ایک نئی روشنی حاصل کرسکتا ہے۔21؎

زاہدہ زیدی کے ان تراجم کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات ذہن نشین ہوجاتی ہے کہ ان کے ان تراجم سے اردوترجمہ نگاری کی صنف میں نہ صرف وسعت پیدا ہوئی ہے بلکہ انگریزی ادب کے مایہ ناز ادیبوں کی تخلیقات کا اردوزبان میں مطالعہ کرنے کا موقعہ بھی فراہم ہوا ہے۔دوسرے یہ کہ زاہدہ زیدی کے ان ترجموں کا مطالعہ کرتے ہوئے جواہم بات ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ ان کی انگریزی ادب پر مضبوط گرفت کا نتیجہ تھا کہ تراجم کے اصل متن کی روح کہیں بھی مجروح نہیں ہونے پائی بلکہ یہ خودزاہدہ زیدی کی تخلیقات کا ہی عکس معلوم ہوتی ہیں۔جو کسی بھی بڑے ترجمہ نگار کی مخصوص خصوصیات کا حصہ ہیں۔

اردو تنقید:

اردو ادب میں تنقید کا باقاعدہ رواج یوں تو مغرب کے زیر اثر ہوا۔لیکن اس کے ابتدائی نقوش ہمیں اٹھارہویں صدی کے اواخر سے ملنے شروع ہو جاتے ہیں۔جب شعراء نے تذکرے لکھنے کی ابتدا کی جس میں اردو کے یہ شعراء اپنے سے پہلے اور معاصر شعراء کے کلام پر اظہار خیال کرتے تھے۔اور ان کے کلام پر اپنی رائے بھی پیش کرتے تھے۔ان تذکروں میں میر تقی میر کو اردو کا پہلا تذکرہ نگار شمار کیا جاتا ہے۔اور ان کے تذکرے ''نکات الشعراء'' کو اردو کا پہلا تذکرہ۔ جو 1752 میں لکھا گیا۔اس میں میر نے اپنے عہد کے بہت سے شعراء کے کلام پر اظہار خیال کیا تھا۔میر تقی میر کے ''نکات الشعراء'' کے بعد بہت سے تذکروں کا ذکر ملتا ہے۔جن میں سید فتح علی گردیزی کا ''تذکرہ ریختا گویان''، قیام الدین قائم کا ''مخزن نکات''، محمد ابراہیم خلیل کا ''گلزار ابراہیم''، لچھمی شفیق نرائن کا ''چمنستان شعراء''، قدرت اللہ شوق کا ''طبقات الشعراء''، میر حسن کا ''تذکرہ شعراء اردو''، مصحفی کا ''تذکرہ ہندی''، مصطفیٰ خاں شیفتہ کا ''گلشن بے خار'' اور قدرت اللہ قاسم کا ''مجموعہ نغز'' کے علاوہ اور بھی بے شمار تذکرے مل جاتے ہیں۔

ان تذکروں کے علاوہ محمد حسین آزاد کے تذکرے ''آب حیات'' کو اہمیت حاصل ہے۔جو 1880 میں شائع ہوا۔جس میں آزاد نے نہ صرف اردو شعراء کے کلام پر اظہار خیال کیا ہے۔ بلکہ ان کی اس تصنیف سے اردو تاریخ نویسی کی عہد بہ عہد ترقی کے بارے میں بھی معلومات حاصل ہوتی ہے۔اسی طرح علامہ شبلی نعمانی نے بھی ''شعر العجم'' لکھ کر تنقید کی طرف توجہ کی۔اور شاعری کی تنقید پر اظہار خیال کیا۔

لیکن اردو میں تنقید کی طرف باقاعدہ سب سے پہلے جس ادیب نے توجہ دی وہ مولانا الطاف حسین حالی ہیں۔جنہوں نے اردو میں نہ صرف مغربی طرز پر بنیاد ڈالی بلکہ ان کی تنقید کو باضابطہ عملی تنقید کہا جاتا ہے۔جس کی اصل بنیاد ان کی تصنیف ''مقدمہ شعر و شاعری'' ہے۔1893 میں شائع ہوئی۔اس کتاب میں حالی نے ادب کے اصول و ضوابط انگریزی، عربی اور فارسی ادب کے حوالے سے بیان کئے۔حالی نے اپنی اس

تصنیف میں ادب کی ہر صنف غزل، قصیدہ، مرثیہ اور مثنوی کے متعلق بحث کی ہے۔ اور اس بات کا بھی ذکر کیا ہے کہ شاعر کو اپنی تخلیق کے وقت کن باتوں کا خیال رکھنا چاہئے۔

اس طرح حالی سے اردو با قاعدہ تنقید کا آغاز ہوا اور پھر اس کے بعد اس صنف کو روز بروز ترقی ہوتی گئی۔ کچھ لوگوں نے اس کی مخالفت بھی کی کہ تنقید ادب پارے کے لیے مضر ہے۔ کیوں کہ کچھ لوگ ادب میں حسن و جمال اور فنی خوبیوں کے قائل تھے تو کچھ ادب کو سماج کا آئینہ قرار دیتے ہیں ان کے لیے فنی خوبیاں معنی نہیں رکھتیں بلکہ ادب کو عوام کے لیے انہیں کی زبان میں پیش کر دینا ہی کافی ہے۔ اسی نقطۂ نظر کی بنیاد پر تنقید میں بہت سے نظریات بھی قائم ہوگئے۔ انہیں ہم تنقیدی دبستان کے نام سے جانتے ہیں۔ ان میں جمالیاتی، تاثراتی، سماجی اور نفسیاتی تنقید خاصی مقبول ہوئی۔

بہر طور آج اردو میں تنقید کو ایک با قاعدہ صنف کی حیثیت سے دیکھا جاتا ہے۔ جس کی بنیاد پر ہم کسی فن کار کے فن پارے کو ادب کی فنی اور ادبی خصوصیات کی روشنی میں اس کا مطالعہ کر کے اس فن پارے کی خوبیوں اور خامیوں کا اندازہ کر کے ادب میں اس کا صحیح مقام و مرتبہ متعین کرتے ہیں۔ اردو تنقید میں بہت سے اہم نقاد پیدا ہوئے جن میں کچھ تو مشرقی تنقید سے اور کچھ مغربی تنقید سے زیادہ متاثر نظر آتے ہیں۔ اور وہ اردو ادب کو بھی مغربی ادب کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں جن میں کلیم الدین احمد کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ کلیم الدین مغربی ادب سے بہت متاثر تھے اور اردو ادب کو بھی مغربی ادب کے اصولوں پر پرکھنے کے قائل تھے۔ ان کی تنقیدی تصنیف میں ''اردو شاعری پر ایک نظر، اردو تنقید پر ایک نظر، فن داستان گوئی، اقبال ایک مطالعہ، عملی تنقید، سخن ہائے گفتنی، قدیم مغربی تنقید'' وغیرہ خاص طور سے اہم ہیں۔ ان کے علاوہ اردو کے اہم نقادوں میں احتشام حسین، آل احمد سرور، خلیل الرحمٰن اعظمی، پروفیسر قمر رئیس، محمد حسن عسکری، محمد حسن، وزیر آغا، فرمان فتح پوری، عقیل رضوی، گیان چند جین، گوپی چند نارنگ، شمیم حنفی، وقار عظیم، عبد القادر سروری، مجنوں گورکھپوری، عبادت بریلوی، شمس الرحمٰن فاروقی اور بہت سے نقاد ہیں جو موجودہ ہیں اور تنقیدی میدان میں اپنے اہم کارنامے انجام دے رہیں۔

تنقید کے میدان میں اگر ہم خواتین کی تصنیفات کا جائزہ لیں تو ہمیں اس میدان میں خواتین کی

شمولیت تو نظر آتی ہیں لیکن خواتین حضرات نے اس میدان میں بہت زیادہ نمایاں کارنامے انجام نہیں دیے۔ لیکن ایسا نہیں کہ ہمیں اردو کی کوئی خواتین یہاں نظر نہیں آتی بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ تنقید نگاری میں ان کی تصانیف کی تعداد بمقابلہ شاعری، ناول نگاری، افسانہ نگاری، ڈرامہ نگاری اور ادب کی دوسری صناف کے مقابلے میں بہت مختصر نظر آتی ہے۔

اردو ادب کی جن خواتین نے تنقید نگاری کی صنف میں طبع آزمائی کی ان میں سیدہ جعفر، صالحہ عابد حسین، ممتاز شیریں، رفیعہ سلطان، الطاف حسین فاطمہ، شہناز نبی، ترنم ریاض، ساجدہ زیدی اور زاہدہ زیدی کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ ہم یہاں تمام خواتین کی تنقید نگاری کا تفصیلی جائزہ لینے کے برعکس ان کی تصانیف کا ذکر کرنے پر اکتفا کریں گے۔ اور پھر اس کے بعد زاہدہ زیدی کے تنقیدی تصانیفات کا جائزہ لیا جائے گا ان کی روشنی میں ان کی تنقیدی صلاحیت اور اردو تنقید میں ان کی تنقیدی کاوشوں کا تعین کیا جائے گا۔ مذکورہ خواتین کی تنقیدی تصانیف کی فہرست درج ذیل ہے۔

1۔ تنقید اور انداز نظر، فن کی جانچ۔۔ سیدہ جعفر

2۔ معیار تنقید، منٹو نوری نہ ناری، مغربی افسانے کا اثر اردو افسانے پر۔ ممتاز شیریں

3۔ اردو ناول کا سماجی و سیاسی مطالعہ، جدید خواتین افسانہ نگار، نظریہ اور تجزیہ، نظر اور توسیع۔ صالحہ زریں

4۔ انتخاب مراثی، خواتین کربلا کلام انیس کے آئینہ میں، ادبی جھلکیاں، بات چیت، اور انیس سے تعارف۔۔۔ صالحہ عابد حسین

5۔ تلاش بصیرت اور گزر گاہ خیال۔ ساجدہ زیدی

6۔ اردو نثر کا آغاز وارتقاء، اردو کی ترقی میں خواتین کا حصہ۔۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ

7۔ تانیثی تنقید۔ شہناز نبی

8۔ بیسویں صدی میں کواتین کا اردو ادب۔ ترنم ریاض

9۔ نجمہ رحمانی۔ آزادی کے بعد اردو شاعرات

زاہدہ زیدی کے تنقیدی مضامین:

اردو ادب کی جن خواتین نے تنقید نگاری کی صنف میں طبع آزمائی کی ان میں سیدہ جعفر، صالحہ عابد حسین، ممتاز شیریں، رفیعہ سلطان، الطاف حسین فاطمہ، شہناز نبی، ترنم ریاض، ساجدہ زیدی اور زاہدہ زیدی کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ جن کی تصانیفات کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ یہاں زاہدہ زیدی کے تنقیدی تصانیفات کا جائزہ لیا جائے گا ان کی روشنی میں ان کی تنقیدی صلاحیت اور اردو تنقید میں ان کی تنقیدی کاوشوں کا تعین کیا جائے گا۔

1۔ رموز فکر وفن

یہ کتاب زاہدہ زیدی کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو انہوں نے مختلف سیمینار یا جو کسی ادبی رسالے میں شائع ہونے کے لیے لکھے گئے تھے اور جنہیں بعد میں زاہدہ زیدی نے کتاب کی شکل میں شائع کروا تھا۔ اس کتاب میں کل نو مضامین شامل ہیں۔ جن کا تجزیہ کچھ اس طرح ہے۔

پہلا مضمون جو کہ ''میر انیس کی شاعری میں ڈرامائی عناصر'' کے نام سے ہے۔ اس مضمون میں زاہدہ زیدی نے میر انیس کے مراثی میں ڈرامائی عناصر کی نشان دہی کی ہے۔ اس میں زاہدہ زیدی نے پہلے تو اس بات کو ثابت کیا ہے کہ عظیم شاعری کی ایک اہم خصوصیت ہے کہ اس میں ڈرامائی عناصر نظر آتے ہیں اور یہ کہ عظیم شاعری اور ڈراما ایک دوسرے میں پیوست ہیں دونوں کا ایک دوسرے سے باہمی رشتہ ہے اس بات کے ثبوت میں زاہدہ زیدی نے حوالے کے طور پر سوفو کیز، اس کلیز، یورپی ڈیز، شیکپیئر، کالی داس، راسین کورنیل، گوئٹے، ایلیٹ وغیرہ ڈرامہ نگاروں اور شاعروں میں دانتے، چوسر، ملٹن، کولرج، ایلیٹ، اقبال، کیٹس، انیس اور نظیر اکبرآبادی کے نام پیش کئے ہیں۔

اس کے بعد انہوں نے انیس کی شاعری کے ڈرامائی پہلوؤں کی وضاحت کی ہے اور بتایا ہے کہ انیس کی شاعری بنیادی طور پر ڈرامائی شاعری ہے جس میں انیس نے انسانی رشتوں اور انسانی نفسیات کو فطری اور ڈرامائی انداز میں پیش کیا ہے اور اس کے ذریعہ انیس نے جن و انس، ملائک، چرند، پرند، ارضی و سماوی عناصر، مظاہرات، آسمان وزمین، کوہ ودریا، شمشیر وعلم، حباب، ذرہ، لہریں اور دوسری معمولی سے معمولی اشیاء کو

بھی دلچسپ اور فعال کردار بنا کر اپنے مرثیوں میں دکھایا ہے۔

ان کی شاعری میں کہیں ملائک سجدہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں تو کہیں آفتاب وکوہ حضرت امام حسین کو سجدہ کرتے ہوئے ملیں گے۔کبھی زمین وآسمان باہم گفتگو ہیں تو کہیں نہر علقمہ امام حسین کی قدم بوسی کرتی ہے۔میر انیس نے اپنے تخیل سے مجرد چیزوں کو بھی مجسم بنا کر پیش کیا ہے۔ان فطری چیزوں کے علاوہ زاہدہ زیدی نے انیس کی شاعری کی ایک اور اہم خصوصیت انسانی رشتوں اور جذبات کی ڈرامائی عکاسی کی نشاندہی ہے جس میں انیس نے حضرت امام حسین اور ان کے رشتہ داروں کی دلی جذبات اور نفسیات اس انداز میں پیش کی ہے جس کی مثال اردو شاعری میں کہیں اور نہیں ملتی۔امام حسین کے ساتھ ان کے رشتہ داروں بھائی بہن اور ان کے جانثار اور عزیز و اقارب شامل ہیں جن میں حضرت فاطمہ،علی اکبر،علی اصغر، زینب، سکینہ،عون و محمد، حضرت علی،عباس، ہندہ اور شیریں ہیں۔ جو نیک و کار کرداروں کی فہرست میں شامل ہیں ان نیک کرداروں کی سیرت میں جرات، بہادری سخاوت اور عزو انکساری کی صفات نظر آتی ہیں۔ان نیک کرداروں کے علاوہ دوسری طرف دشمن کی فوج کے لوگ بھی ہیں جن میں ابن سعد،شمر، یزید اور ارزق اور رواج کی فوج کے لوگ ہیں۔زاہدہ زیدی لکھتی ہیں؛

> ان عناصر میں سب سے اہم امام حسین کے بزرگوں کی ارواح مقدس ہیں جو گویا اس ڈرامے کے مستقل کرداروں کا درجہ رکھتی ہیں۔ان ارواح کو ان تمام مسائل سے تعلق قلبی ہے جو امام حسین کو درپیش ہیں وہ ہر المناک حادثے سے متاثر ہوتی ہیں۔آہ وفغاں کرتی ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ اپنی اولاد کو تسلی بھی دیتی ہیں وہ ہر شہید کی روح کو لینے آتی ہیں اور بحیثیت مجموعی اس ارضی ڈرامے کی روحانیت اور عظمت کی نشاندہی کرتی ہیں۔[1]

زاہدہ زاہدی نے اس بات کی وضاحت بھی کی ہے کہ انیس نے اگر چہ مذہبی نیت کے ساتھ ان مراثی کو لکھا ہے اور ان کے کردار و موضوعات بھی ایک ہی تھے امام حسین اور واقعہ کربلا لیکن میر انیس کا کمال یہ تھا کہ انہوں نے ان محدود موضوعات میں بھی تنوع پیدا کیا کہ ان مختصر موضوعات کو پڑھ کر کہیں یکسانیت اور تکرار محسوس نہیں ہوتی کیوں کی انہیں مکالمہ نگاری، پس منظر،کرداروں کی نقل و حرکت، زبان کی صفائی وستھرائی اور جذبات نگاری پر پوری قدرت حاصل تھی۔حضرت حر کی موت کے منظر کا حوالہ دیتے ہوئے زاہدہ زیدی نے

انیس کے درج ذیل اشعار کا حوالہ دیا ہے۔

مجھ کو لینے چلے آتے ہیں فرشتے یا شاہ ملک الموت بھی کرتا ہے محبت کی نگاہ
خلد سے شیر خدا نکلتے ہیں اللہ اللہ لو برآمد ہوئے شبیر بھی پدر کے ہمراہ
ننگے سر احمد مختار کی پیاری آئی
لیجئے آپ کے نانا کی سواری آئی 2

انیس کی اس ڈرامائی خصوصیت کے بارے میں زاہدہ زیدی نے جس بات کی طرف اشارہ کیا ہے وہ یہ کہ انیس کی شاعری کی یہ ڈرامائی خصوصیت فرداً فرداً نہیں یعنی مراثی منظوم ڈرامے نہیں ہیں کیوں یہ ان میں منظوم ڈرمے کی فورم یا ڈرامائی تکنیک کو پوری طرح نہیں برتا گیا ہے بلکہ انیس نے اپنے تخیل کی کارفرمائی سے ان مراثی میں ڈرامائی خصوصیت پیدا کی ہے۔اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ میر انیس ان ڈراموں کو خود ہاتھ چشم اور ابرو کی مدد سے مجمع میں پیش کرتے تھے۔اس مقالے میں زاہدہ زیدی نے انیس کی ان ڈرامائی خصوصیت اور دوسری اہم خصوصیات جن میں مکالمہ نگاری، منظر نگاری، پس منظر اور زبان و بیان کی دلکشی کی بنا پر انہیں دنیا کے عظیم شاعروں میں میر انیس کو جگہ دی ہے۔

دوسرا مضمون ''کلام اقبال کی عصری معنویت کے چند پہلو'' کے نام سے ہے اس مضمون میں زاہدہ زیدی نے ایک عظیم شعری کارنامے کے لیے تین خصوصیات بتائی ہیں ایک تو یہ کہ اس شعری کارنامے کی جڑیں تاریخی تناظر میں پیوست ہیں اور جو عصری تناظر میں بھی سیاق وسباق رکھتی ہوں دوسرا وہ شعری کارنامہ وقت کی حدود سے آزاد ہو اور جو آفاقی ہو تیسرا اس شعری کارنامے کو اپنے مسائل اور تجربات کی روشنی میں اس کی بازیافت کرسکیں۔

اس شعری خصوصیات کو مدنظر رکھ کر کسی شاعر کے کلام کا مطالعہ کیا جائے اور اس میں یہ خصوصیات پائی جائیں تو بلاشبہ اس کو عظیم شاعری کہا جاسکتا ہے۔اسی عظیم شاعری کی خصوصیات کے مدنظر زاہدہ زیدی نے اقبال کے کلام کی خصوصیات اور اس کی عصری وآفاقی معنویت کو واضح کیا ہے اور اقبال کی شاعری کے فکری پہلوؤں کو نمایاں کیا ہے خاص کر دور حاضر میں کلام اقبال کی معنویت کیا ہے اور کس طرح ان کا کلام آفاقی ہے اور وقت کی

حدود سے عہد آبرہ ہو کر لافانی ہو گیا ہے۔

آج کے دور میں ہر طرف سیاسی چال بازیاں نظر آتی ہیں تخریب کے اس دور میں جس طرح ہر ملک کو نیوکلائی جنگ کا خطرہ نظر آرہا ہے اور نئے نظام کی بنیاد سیاسی بالادستی، معاشی وسماجی استحصال اور عدم مساوات پہ منحصر ہو چکی ہے۔ ہر طرف فرقاوارانہ فسادات اور نفرت پھیلی ہوئی ہے اخلاقی وتہذیبی اور تاریخی قدروں کا زوال نظر آتا ہے ایسے میں اگر اقبال کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان تمام مسائل کا ذکر ان کے کلام میں بھی ہے۔ وہ لکھتی ہیں کہ اب اگر اس پریشان کن صورت حال کا ایک سرسری جائزہ لینے کے بعد ہم اقبال کی شاعری پر اپنی توجہ مبذول کرتے ہیں تو ہمیں اس میں نہ صرف ان مسائل کا عکس نظر آئے گا بلکہ اس کے انتہائی پریشان کن اور نا قابل قبول ہونے کا احساس بھی اور ساتھ ہی اس میں ایسی اعلی اور مثبت اقدار کی بازیافت کا عمل اور ان کی کارفرمائی بھی دیکھی جاسکتی ہے جن کی مدد سے انسان مایوسی اور ذہنی افلاس کی دلدل سے نکل کر ایک باہمی اور بامقصد زندگی کی شاہراہ پر گامزن ہوسکتا ہے۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اقبال نے آج سے ستر، اسی سال پہلے ہی سامراجی نظام کے ان تباہ کن اور تخریبی پہلوؤں کا ادراک حاصل کرلیا تھا۔ جن کی زیادتیاں حالیہ برسوں میں اپنی انتہا کو پہنچی ہیں۔ مثال کے طور پر خضر راہ کے یہ الفاظ:

یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزی کاری ہے　　　نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی
ہوس کے پنجہ خونیں میں تیغ کارزار ہی ہے 3　　　وہ حکمت ناز تھا جس پر خرد مندانِ مغرب کو

اس کے علاوہ زاہدہ زیدی نے اقبال کی شاعری میں ایک آئیڈیل معاشرے کے پہلو کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ اقبال اپنی شاعری کے ذریعہ عوام کے دلوں کو عزم آزادی اور اپنے حقوق کے لیے گرمانا چاہتے تھے۔ انہوں نے روس کے انقلاب کا بھی خیر مقدم کیا۔ تاکہ مزدوروں کو ان کا حق مل سکے اور ایک آزاد معاشرے کی تشکیل ہوسکے لیکن اقبال پوری طرح اس مارکسی نظریہ سے بھی متفق نہیں تھے بلکہ اقبال مذہب کے مقابلے میں مارکسی نظریہ کے حامل نہ تھے وہ چاہتے تھے کہ مظلوموں اور کمزور عوام کو ان کا حق اور آزادی مل جائے اور وہ اپنا فیصلہ خود کرسکیں۔ زاہدہ زیدی نے اس سلسلے میں چند اشعار نقل کئے ہیں:

بندہ مزدور کو جا کر میرا پیغام دے
خضر کا پیغام کیا ہے یہ پیام کائنات
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گر
شاخ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
اٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے
کرمک ناداں طواف شمع سے آزاد ہو
اپنی فطرت کے تجلی زار میں آباد ہو 4

اقبال عوام کی آزادی کو بہت اہمیت دیتے تھے ان کی شاعری میں آزادی کا مفہوم تہ دار اور مرکزی پہلو کی حیثیت سے نمایاں ہے وہ انفرادی آزادی کو اجتماعی آزادی سے وابستہ کرتے ہیں۔ بقول زاہدہ زیدی؛

اقبال کی شاعری میں آزادی کا تصور کافی تہ دار اور مرکزی اہمیت کا حامل ہے جس میں انفرادی اور اجتماعی دونوں پہلو اہم ہیں۔ اگر ایک طرف انفرادی و آزادی کا تصور اجتماعی زندگی سے وابستہ ہے یعنی

فرد قائم ربط ملت سے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں ۔5

تو دوسری طرف جس کا اشارہ زاہدی زیدی نے کیا ہے:

اقبال کا آزادی کا تصور سرمایہ دارانہ نظام میں دولت بٹورنے کی آزادی اور جمہوری طرز حکومت کے بلند بانگ دعووں سے یکسر مختلف ہے جیسا کہ ان اشعار سے منکشف ہے؛

ہے وہی ساز کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
اس سراب رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو
آہ نادان قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو6

ان خصوصیات کے علاوہ زاہدہ زیدی نے اقبال کی قومی زندگی پر بھی گفتگو کی ہے جن کی معنویت آج بھی ہے اقبال اپنے وطن سے بے پناہ محبت کرتے تھے اور اس کی حالت پر بھی افسوس کرتے تھے اسی لیے انہوں

نے قومی،محبت ، ہمدردی اور ہم آہنگی جیسے الفاظ اپنی شاعری میں بار بار استعمال کئے ہیں وہ نہ صرف قومی یکجہتی کی بات کرتے ہیں بلکہ ملت اسلام کا اتحاد ان کی نظر میں سب سے زیادہ اہم اور ضروری ہے جو آج کے معاشرتی استحصال اور جنگی نظام میں کافی اہمیت کا حامل ہے۔آج بھی سامراجی قوتیں اسلام کو دنیا کے نقش قدم سے مٹا دینا چاہتی ہیں۔اس لیے عصری تناظر میں بھی اتحاد اسلام اور اسلامی ممالک کا آپس میں تنازعات ختم کر دینا بہت ضروری ہے۔

اس کے بعد زاہدہ زیدی نے اقبال کی شاعری کے جس پہلو کو عصری تناظر میں پیش کیا ہے وہ ہے داخلی جذبات کی پاکیزگی۔آج ہر طرف افراتفری نظر آتی ہے اور جنگی مسائل ہر طرف آمادہ ہیں ایسے میں فطرت کی بے زباں اشیاء بھی اس کی زد میں آچکی ہیں۔درخت، چرند، پرند اور قدرتی ماحول کو ہر طرف خطرہ ہے۔انسان خودغرضی، لالچ اور ذاتی مفاد کی خاطر ان اشیاء کو بھی نقصان پہچانے سے نہیں چوکتا ایسے ماحول میں ہمیں اقبال کی شاعری فطرت سے والہانہ عشق اور گہری وابستگی کا پیغام دیتی ہے۔اقبال خود بھی مناظر فطرت کے پرستار اور دلدادہ تھے۔یہاں زاہدہ زیدی نے اقبال کی نظم آرزو کے کچھ اشعار کا حوالہ دیا ہے:

مرتا ہوں خامشی پر یہ آرزو ہے میری — دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو
لذت سرود کی ہو چڑیوں کی چہچہوں میں — چشمے کی شورشوں میں باجا سا بج رہا ہو
صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں — ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو
ہو دلفریب سیسا کوہسار کا نظارا — پانی بھی موج بن کے اٹھ اٹھ کے دیکھتا ہو
پانی کو چھو رہی ہو جھک جھک کے گل کی ٹہنی — جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو 7

ان اشعار سے اقبال کا فطرت سے والہانہ عشق ظاہر ہوتا ہے جو آج بھی ہمیں غور وفکر کی دعوت دیتا ہے کہ ہم اپنے ذاتی مفاد اور خودغرضی سے فطرت اور قدرتی وسائل کو تباہ و برباد نہ کریں۔

اس کے علاوہ زاہدہ زیدی نے اقبال کی شاعری کی سب سے بڑی جس خصوصیت کا بیان کیا ہے اور جو موجودہ عہد میں سب سے اہم ہے وہ ہے خودی۔جس کو کلام اقبال میں مرکزی خوصیت حاصل ہے۔احساس ذات اور خود کی صلاحیتوں کو پہچاننے کی تاکید اقبال کے کلام میں بار ہا ملتی ہے۔انسان خود کی صلاحیتوں کو پہچان کر خود کو خوب سے خوب تر بنا سکتا ہے جس میں خودداری خود سپردگی اور فقر و بے نیازی شامل ہے۔اور اس کے

زریعہ انسان اپنی ذات کے نہاخانوں کو راشن کر سکتا ہے۔

ذات عرفان اور خودی کی صلاحیتوں کے علاوہ زاہدہ زیدی نے اقبال کی شاعری کی دو اور اہم خصوصیت عشق اور مرد مومن کے تصور کی بھی وضاحت کی ہے۔عشق اقبال کی نظر میں انسان کی اخلاقی اور روحانی صلاحیتوں کو نمایاں کرتا ہے اور اس کی تخلیق کی کاوش کو بھی آشکار کرتا ہے۔

بے خطرہ کود پڑا آتش نمرود میں عشق ‏ ‏ ‏ ‏ عقل ہے محو تماشالب بام ابھی

جب عشق سکھاتا ہے آداب خود آگاہی ‏ ‏ ‏ ‏ کھلتے ہیں غلاموں پر اسرار خداگاہی

جہاں تک اقبال کے مرد مومن کا تعلق ہے تو زاہدہ زیدی کی نظر میں یہ مرد مومن مرد کامل ہے جس کو اقبال نے اسلامی فکر کے تناظر میں دیکھنے کی کشش کی تھی جو آفاقی اور عصری تقاضوں کو پورا کرتا ہو اور جس کا دل بنی نوع انسانی کی محبت سے سرشار ہو اور وہ غیر معمولی ذہانت کا حامل ہو خواہ وہ کسی بھی مذہب سے ہو اور جو ہر شخص کے لیے آئیڈئل اور مشعل راہ ہو۔نہ کہ مرد مومن سے مراد صرف ایک معمولی مسلمان جو کاہل اور سست ہو جس کے دل میں کوئی ولولہ نہ ہو،کوئی جوش نہ ہو۔اس کی مثال زاہدہ زیدی نے رشید احمد صدیقی کے ان الفاظ میں بھی کی ہے جو رشید احمد صدیقی نے اپنے ایک مضمون ''پیغام اقبال'' میں کہا تھا۔''۔۔۔۔وغیرہ آسکتے ہیں۔8

یعنی یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک ایسا انسان جو جوش عمل اور مسلسل جدو جہد کا حامل ہو جس کے اندر تخلیقی صلاحیتیں موجود ہوں اور اس کے عزم و حوصلے فولاد کی طرح مضبوط ہوں۔مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ زاہدہ زیدی نے اس مضمون میں اقبال کی شاعری ان تمام خصوصیات کا ذکر فرداً فرداً کیا ہے جو ان کی شاعری کو نہ صرف آفاقی بناتی ہیں بلکہ آج موجودہ عہد میں بھی ان کی معنویت اور اہمیت میں اسی طرح برقرار ہے جس وقت اقبال نے ان کا ذکر کیا تھا۔

اردو ڈراما آزادی کے بعد:

جیسا کہ ہم جانتے ہیں زادہ زیدی کا دلچسپ میدان ڈراما اور ڈرامے کی پیش کش ہے بلکہ وہ مغربی ڈرامہ خاص طور سے جدید مغربی ڈرامے میں خاص دلچسپی رکھتی ہیں۔لیکن انہوں نے اس مضمون میں مغربی ڈرامے یا جدید مغربی ڈرامے کے خدوخال ابھارنے کے بجائے صرف اردو ڈرامے پر اظہار خیال کیا ہے ان

کے نزدیک ڈرامہ ایک ایسا فن ہے جو ہماری سیاسی، سماجی، معاشرتی، معاشی اور ثقافتی زندگی میں ہمہ وقت جاری وساری ہے۔ اور ہم شعوری وغیر شعوری طور پر اس سے وابستہ ہوتے ہیں اور ہماری رازمرہ کی زندگی کا نظم وضبط بڑی حدتک ڈرامائی عناصر کا مرہون منت ہے۔

اس مضمون میں زادہ زیدی نے آزادی کے بعد کے ڈرامے کے فن پر تفصیلی گفتگو کی ہے جب ڈرامہ داستانوی دنیا اور خیالی باتوں سے نکل کر حقیقی زندگی کا آئینہ بن چکا تھا۔ یعنی اندر سبھا، طلسم ہوش ربا، لیلی مجنوں، بے نظیر بدر منیر کا دور ختم ہونے کے بعد عابد حسین (پردہ غفلت)، انارکلی (امتیاز علی تاج)، کربلا (پریم چند) اور محمد مجیب (خانہ جنگی)، کا دور شروع ہو چکا تھا اس کے بعد زاہدہ زیدی نے دوسرے ڈراموں دھرتی کا لال (خواجہ احمد عباس)، سرائے کے باہر (کرشن چندر)، نئی دنیا کو سلام (سردار جعفری)، محل سرا (محمد حسن)، دھانی بانکپن (عصمت چغتائی)، حبہ خاتون (محمد مجیب) کا ذکر کیا ہے۔ جس میں کہ ڈرامہ کے فکری اور سنجیدہ مسائل داخل ہو چکے تھے۔ اور یہ نیا ڈرامہ لوگوں کی تفریح کے بجائے غور وفکر کا مرکز بن جاتا ہے۔ اور یہ نئے موضوعات ورجحانات ہماری عصری زندگی سے ہم آہنگ تھے۔ زاہدہ زیدی نے ان ڈرامہ نگاروں کی طرف بھی توجہ مبذول کی ہے جنہوں نے افسانہ نگاری میں نہ صرف بہترین افسانے تخلیق کیے بلکہ ڈرامہ کے میدان میں بھی کئی اہم ڈرامے پیش کیے جن میں راجندر سنگھ بیدی، پریم چند، کرشن چندر، عصمت چغتائی، خواجہ احمد عباس، سردار جعفری، اور منٹو کے نام اہم ہیں۔ ان میں زاہدہ زیدی نے خواجہ احمد عباس کے ڈراموں کو بہترین ڈراموں کی فہرست میں جگہ دی ہے ان ڈراموں میں زبیدہ، یہ امرت ہے، ایٹم بم اناس، تین پہیے، دھرتی کے لال اور کچرہ گاڑی اہم ہیں۔ زاہدہ زیدی نے ان ڈراموں کو چست رواں دواں متنوع اور دلچسپ بتایا ہے۔

خواجہ احمد عباس کے علاوہ عصمت چغتائی کے سانپ، شامت اعمال، دھانی بانکپن اور دلہن کیسی ہے کا ذکر کیا ہے جن میں ہلکا طنز اور مزاح کی آمیزش ہے۔ زاہدہ زیدی نے عصمت کی کردار نگاری، طرز احساس کی انفرادیت، فورم، زبان اور محاورے پر عصمت کی دسترس کو سراہا ہے۔ لیکن چونکہ عصمت نے ڈرامے کے فن پر پوری توجہ نہیں دی اسی لیے انہوں نے بہت کامیاب ڈرامے تخلیق نہیں کیے۔ زاہدہ زیدی نے عصمت کا مقابلہ انگلش کے مایہ ناز ڈرامہ نگار ''شو'' سے کیا ہے۔ عصمت شو سے بہت متاثر تھیں عصمت کے ڈرامے سانپ کو شو

کے ڈرامے"man and superman" سے خیال،کردار اور ڈرامائی صورت حال میں متاثر بتایا ہے۔سانپ کے علاوہ عصمت کے ڈرامے تنہائی کا زہراور دھانی بانکپن کے موضوع،ڈرامائی فورم اور تکنیک کی بھی زاہدہ زیدی نے تعریف کی ہے۔

اس مقالے میں کرشن چند کے ڈراموں کی مقبولیت کو بھی زاہدہ زیدی نے سراہا ہے۔دروازے کھول دو، کتاب کا کفن، دروازہ،قاہرہ کی ایک شام اور نیلکنٹھ وغیرہ کرشن چندر کے اہم ڈرامے ہیں ان کے ڈرامے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بھی کثرت سے اسٹیج کئے جاتے تھے۔کرشن چندر کے ڈراموں میں انسانی ہمدردی اور سماجی حقیقت زیادہ نمایاں ہے۔دروازے کھول دو کی بنیاد قومی ہم آہنگی اور نیل کنٹھ میں سماجی خرابیوں کی نقاب کشائی کی گئی ہے۔ان کے ڈرامے ان داتا کو زاہدہ زیدی نے زمانہ طالب علمی میں اسٹیج بھی کیا تھا۔ان کے ڈراموں کے علاوہ ناولوں اور افسانوں میں بھی ڈرامائی عناصر کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔یہ بات بھی اہم ہے کہ فکشن کی دنیا میں کرشن چندر زیادہ کامیاب ہوئے برعکس ڈرامے کی صنف کے۔اس وجہ سے زاہدہ زیدی نے ڈرامے کے فورم اور تکنیک پر ان کی نامکمل دسترس بتائی ہے۔

اس کے بعد سردار جعفری کے ڈرامے "یہ کس کا خون ہے" کا ذکر ہے جو اپٹا کے لیے لکھا گیا تھا۔دوسرا نئی دنیا کو سلام ہے اس کو بھی زاہدہ زیدی نے زمانہ طالب علمی میں اسٹیج کیا تھا۔سردار جعفری نے بھی ڈرامے کے فن پر قابل قدر توجہ نہیں دی تھی۔زاہدہ زیدی نیا اختر الایمان کی منظوم نظم "سب رس" کا بھی ذکر کیا ہے اس کے کرداروں میں زمان،مکان،قوت نمو اور آدم کے علاوہ جنگل کے جانوروں چیتا، بندر، چڑیا اور گدھے کی تمثیلی پیش کش کی بھی وضاحت کی ہے۔

البتہ زاہدہ زیدی نے بیدی کو اہم ڈرامہ نگار تسلیم کیا ہے۔بیدی نے متعدد ڈرامے لکھے جن میں خواجہ سرا، نقل مکانی، تلچھٹ، رخشندہ اور چانکیہ وغیرہ شامل ہیں۔وہ بیدی کے بارے میں لکھتی ہیں:

> بیدی کے ڈراموں میں فکر واحساس کی شدت اور زندگی کی سفاکی اور المناکی کا احساس۔معاشرے میں پیوست ظلم ناانصافی کے خلاف احتجاج کی لہر،طنز کی زیریں لہریں understatement کا فن،کردار نگاری میں نفسیاتی دروں بینی اور دردمندی کا سنگم،زندگی کی پریشان کن،ناقابل برداشت اور اکثر شرمناک حقیقتوں سے آنکھیں چار

کرنے کی جرات اور الجھے ہوئے سوالوں کو بڑے قدرتی انداز سے پیش کرنے کی صلاحیت بیدی کے ہر قابل لحاظ ڈرامے میں ایک مرکزی خیال کی کارفرمائی اور غیر ضروری تفصیلات سے گریز اور ان کے بہترین ڈراموں میں سماجی اور نفسیاتی بصیرتوں کا انکشاف۔ 9

زاہدہ زیدی نے خواجہ سرا اور تلچھٹ کو زیادہ کامیاب ڈرامے بتایا ہے جب کہ ''ایک عورت کی نہ'' کو انہوں نے فضول ڈرامہ بتایا ہے۔زاہدہ زیدی نے بیدی کے یہاں انگلستان کے مایہ ناز ڈرامہ نگار ہیرالڈ پینٹر کا اثر بتایا ہے بیدی کے یہاں بھی ہیرالڈ کی طرح نفسیاتی ،جنسی اور انسانی رشتوں کی الجھنوں کی کش مکش ملتی ہے۔

بیدی کے فکشن نگار ڈراموں کا جائزہ لینے کے بعد زاہدہ زیدی نے ترقی پسند دور کے تھیٹر کے نئے رجحانات کی طرف توجہ مبذول کی ہے جنہوں نے ایک نئی سرحد میں قدم رکھا اور اس میں اپٹا indian people theater associationاور پرتھوی تھیٹر کی خدمات ناگریز ہیں۔پرتھوی تھیٹر نے جہاں فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے موضوعات پیش کئے وہیں اپٹا نے متنوع اور پیچیدہ مسائل کی طرف توجہ کی۔پرتھوی تھیٹر کے پیش کردہ ڈراموں میں زیادہ اکہرہ پن اور میلوڈرامہ کے عناصر کا ذکر تھا جب کہ اپٹا کے پیش کردہ ڈراموں میں زاہدہ زیدی نے خلوص انفرادیت اور حقیقت نگاری کی عکاسی کا ذکر کیا ہے۔پرتھوی تھیٹر کے پیش کردہ ڈراموں میں دیوار اور پٹھان اور اپٹا میں خواجہ احمد عباس کے کچرہ گاڑی کو مقبولیت حاصل ہوئی۔

تھیٹر ڈراموں کے ذکر کے بعد زاہدہ زیدی نے قدسیہ زیدی کے ان ڈراموں کا ذکر کیا ہے جو قدسیہ زیدی نے سنسکرت سے شکنتلا،مٹی کی گاڑی ،ان کے علاوہ مغرب سے ترجمہ کئے ہوئے ڈراموں میں خالد کی خالہ،گھڑیا کا گھر(ابسن)اور برناڈشو کا آزر کا خواب شامل ہیں۔یہ ڈرامے بہت زیادہ مقبول بھی ہوئے۔لیکن زاہدہ زیدی کے خیال میں قدسیہ زیدی کے یہ ڈرامے ہندوستانی تھیٹر میں نئی روح پھونکنے میں زیادہ کامیاب نہ ہو سکے۔اس کے برعکس زاہدہ زیدی نے نیشنل اسکول آف ڈرامہ اور اس کے بانی القاضی کی فنکارانہ پیش کش کو سراہا ہے۔جس کے تحت شطرنج کے مہرے(پریم چند)،آگرہ بازار (حبیب تنویر) جیسے ڈرامے وجود میں آئے۔اور جن کامیابی کا سہرا حبیب تنویر اور نیاز حیدر جیسے باشعور اور باصلاحیت فنکاروں کے سر ہے۔اور پھر اس کے بعد حبیب تنویر کے تھیٹر نے ہندوستانی تھیٹر کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔

ہندوستانی ڈرامہ میں نیشنل اسکول آف ڈراما نے کئی مغربی شاہکار ڈرامے کے آزاد ترجمہ کئے جن میں سوفو کیز، مولیر، برناڈ شو، شیکسپیئر، ابسن ،انوی، ژرادو، بریخت، ایونیسکو اور جون اوزبورن کے ڈرامے شامل ہیں۔زاہدہ زیدی کے مطابق ان مغربی ڈرامہ نگاروں کے علاوہ ہندی اور اردو کے ڈراموں کے ترجمے اور کئی اہم شاعروں کی زندگی پر بھی اہم ڈرامے پیش کئے گئے۔جن میں حبیب تنویر کا آگرہ بازار،نظیرا کبر آبادی کی زندگی پر، کہرے کا چانداور محمد حسن کا تماشا تماشائی غالب کی زندگی پر، رفعت سروش کا فکر غالب اور سید محمد مہدی کا غالب کون ہے، شامل ہیں۔ان کے علاوہ کچھ اور ڈرامے خواجہ آتش، اکبر الہ آبادی، فیض، اقبال، میر تقی میر، انشا، مومن اور مجاز پر بھی ڈرامے پیش کئے گئے۔یہ سب ادبی ڈرامے تھے۔جو اردو ادب کے طالب علموں کے لیے زیادہ اہم تھے ان ڈراموں نے اردو ڈرامہ نگاری میں ایک نئی راہ ہموار کی اور یہ کافی مقبول بھی ہوئے۔

ڈرامے کے اس دور عروج کے بعد زاہدہ زیدی نے اس دور پر بھی نظر ڈالی ہے جب اردو ڈرامہ کی ترقی رک جاتی ہے۔اور ڈرامہ ایک بے کیفی کی فضا میں گھر جاتا ہے اور اب ڈرامہ نگاری نشری قسم کے ڈراموں میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔جو بہت عامیانہ، سطحی اور محدود قسم کے ہوتے ہیں ۔اور ان میں کسی گہری بصیرت کا فقدان نظر آنے لگتا ہے۔لیکن اس کے بعد ڈرامے کے افق پر کچھ نئے لکھنے والے نمودار ہوتے ہیں ۔جنہوں نے ڈرامے کے فورم میں کچھ تبدیلی کی یا کچھ ضروری عناصر کی شمولیت کی۔جن میں زاہدہ زیدی نے آفاق احمد، انور عظیم، محمد حسن، ظہیر انور، اقبال مجید، کمار پاشی، ساجدہ زیدی، سلیم شہزاد، جاوید دانش، فضل الرحمٰن ، شمیم حنفی ،زاہدہ زیدی اور روشن تقی کے نام شامل کئے ہیں۔جنہوں نے موضوعات میں دولت ،قوت کی بالادستی، کرپشن اور صاحب اقتدار کی جنسی بے راہ روی کا ذکر خاص طور سے کیا ہے۔اور پھر آخر میں زاہدہ زیدی نے نکڑ ناٹک کا بھی ذکر کیا ہے۔جن کا مقصد سڑکوں پر خاص طور سے سیاسی پارٹیوں کا پرچار تھا۔اور نکڑ ناٹک کو انہوں نے سیاسی پروپیگنڈہ قرار دیا ہے۔آخر میں زاہدہ زیدی نے اس بات کی بھی وضاحت کی ہے کہ اگرچہ اردو ڈرامے پر کچھ زوال یا اجاڑ کا دور بھی گزرا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اردو میں ہنر منداور تخلیقی ذہن رکھنے والے ڈرامہ نگاروں یا بہترین اور سنجیدہ ڈراموں کی کمی ہے آج اگرچہ اردو میں بہت زیادہ بہترین ڈرامے تخلیق نہیں ہورہے ہیں لیکن اردو کے صلاحیت منداور تخلیقی ذہن رکھنے والے لوگ ڈرامے کے فن میں

دلچسپی لیں اوراس فن میں فعال اور غیر تجارتی ڈراموں کے برعکس اپنی فنکارانہ صلاحیت کا اظہار کریں تو آج بھی اردو میں فکر انگیز، سنجیدہ بصیرت افروزاور بہترین ڈرامے تخلیق کئے جاسکتے ہیں۔

خواجہ احمد عباس: سوانحی اور تنقیدی جائزہ

مذکورہ بالا عنوان سے زاہدہ زیدی نے اس کتاب میں یہ مضمون شامل کیا ہے۔اس مضمون میں زاہدہ زیدی نے خواجہ احمد عباس کے خاندان اوران کے آباء واجداد کا پہلے تعارف پیش کیا ہے خواجہ احمد عباس کا تعلق ایک علمی گھرانے سے تھا خواجہ الطاف حسین حالی ان کے پرنانا تھے اور نانا الطاف حسین حالی کے فرزند خواجہ سجاد حسین تھے جوایک ماہر تعلیم اور جید عالم تھے۔ان کے چچا خواجہ غلام الحسنین اور غلام الثقلین بھی ایک ممتاز دانش ور اور مفکر عالم تھے۔اور خواجہ احمد عباس کے والد خواجہ غلام السبطین عربی فارسی کے عالم اور مذہبی انسان تھے۔خواجہ غلام السیدین ان کے چچا زاد بھائی جو خواجہ غلام الثقلین کے فرزند تھے خود خواجہ احمد عباس اوران کی بہنوں نے سجاد حسین کے قائم کردہ اسکول میں تعلیم حاصل کی تھی۔اس طرح خواجہ احمد عباس کا دادی ہال اور ننہال نہ صرف تعلیم یافتہ تھا بلکہ اس خاندان کی کوششوں سے دوسرے لوگوں کو بھی علم وادب کے بے بہا خزانوں سے روشناس ہونے کا موقعہ ملا۔

خواجہ احمد عباس کے خاندان اور تعلیم کا ذکر نے کے بعد زاہدہ زیدی نے ان کے تخلیقی سفر کا ذکر کیا ہے۔جب ان کی غیر معمولی صلاحیتوں نے اپنے چچا خواجہ غلام السیدین کی رہنمائی میں اوران سے متاثر ہوکر علمی وادبی جوہر دکھانے شروع کئے۔انہوں نے بطور صحافی آزادی کی جدوجہد میں اہم رول ادا کیا۔وہ مارکسی اور کمیونسٹ نظریہ سے کافی متاثر تھے۔اگرچہ وہ باقاعدہ کبھی اس کمیٹی کے رکن نہیں بنے۔خواجہ احمد عباس کے تخلیقی سفر میں زاہدہ زیدی نے سب سے پہلے ان کی افسانہ نگاری کا ذکر کیا ہے۔جب وہ علی گڑھ میں تھے انہوں نے اپنا پہلا افسانہ ابابیل لکھا اس کا کئی زبانوں میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔اس کے بعد انہوں نے باقاعدہ صحافت کا پیشہ اختیار کیا تو وہ ممبئی کرانیل سے وابستہ ہوئے۔

1938 میں خواجہ احمد عباس نے مختلف ممالک کا سفر شروع کیا اورایک سفرنامہ ''ساری دنیا میری'' کے نام سے شائع کرایا۔جسے زاہدہ زیدی نے ان کے فکری اور سیاسی بالغ نظری کے سفر میں ایک سنگ میل کی

حیثیت قرار دیا ہے۔اس سفر نامہ کے علاوہ ان کی خودنوشت I AM NOT ISLAND بھی ہے جس میں انہوں نے اپنی زندگی کے دھوپ چھاؤں کا ذکر کیا ہے۔لیکن ان کے سفر نامے سے ہندوستان کی سیاسی حالت اور مختلف مما لک خاص طور سے نیویارک میں ہونے والی عالمی کانفرنس جس میں متعدد مما لک کے نوجوانوں نے شرکت کی تھی۔اس میں خواجہ احمد عباس نے نہ صرف ہندوستان بلکہ دوسرے مما لک کی آزادی کے متعلق ہونے والے مطالبات کا بھی ذکر کیا ہے۔اس کے علاوہ ان کا ایک اور سفر نامہ ''مسافر کی ڈائری'' بھی اہم ہے۔سفر ناموں کے علاوہ ان کی فلم ''پردیسی'' اور ''میرا نام جوکر'' نے بھی ان کی شہرت کا علم بلند کیا۔

افسانہ اور ناول کے میدان میں بھی ان کی غیر معمولی صلاحیتوں نے وسیع کارنامے انجام دئے ہیں۔ان کے افسانوں میں ایک لڑکی، زعفران کے پھول، پاؤں میں پھول، دیا جلے ساری رات، پیرس کی ایک شام، کہتے ہیں جسے عشق، نیلی ساڑی، نیا انتقام، مونتاژ، واپسی کا ٹکٹ، گیہوں اور گلاب، بیسویں صدی کے لیلیٰ مجنوں اور نئی دھرتی نئے انسان خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔جب کہ ناولوں میں انقلاب، دنیا میرا گاؤں، دو بوند پانی، بمبئی رات کی بانہوں میں، میرا نام جوکر، چار دل چار راہیں، شیشے کی دیوار، تین پہیے، فاصلہ، بولی، Boy meets girs، اور Tomorrow is our شامل ہیں۔ڈراموں میں زبیدہ، یہ امرت ہے، میں کون ہوں، اناس، ایٹم بم اور گلاب کی واپسی ہیں۔خواجہ احمد عباس کا یہ کام کئی دہائیوں پر مشتمل ہے جس میں ان کی شفاف اور پہلودار شخصیت کا عکس نمایاں ہے۔اردو کے علاوہ انہوں نے ہندی افسانے اور ناول میں کافی مقبولیت حاصل کی۔اور انگلش مصنف کی حیثیت سے توانہیں صف اول کے مصنفوں میں شمار کیا جاتا ہے۔بقول زاہدہ زیدی:

> ان کے مختلف النوع کارناموں کا احاطہ کرنا اور ان کی قدر و قیمت کا تعین کرنا جس قدر دشوار ہے اسی قدر ضروری بھی ہے کیونکہ یہ سبھی کارنامے عباس کی شفاف اور پہلودار تخلیقی شخصیت کا اظہار ہیں اور ان میں ایک گہرے ربط اور تسلسل کے نقوش ملتے ہیں۔ان کی گونا گوں سرگرمیوں اور متنوع تخلیقی اظہار کو اکثر حلقوں میں ان کی کمزوری گردانا گیا۔لیکن میری نظر میں یہی ان کی انفرادیت کی شناخت بھی ہے اور تخلیقی توانائی کی ٹھوس دلیل بھی۔10

خواجہ احمد عباس کے افسانوں مین سماج کے مظلوم کچلے انسانوں سے ان کی گہری ہمدردی نظر آتی ہے

ان افسانوں میں ان کے تجربہ،مشاہدہ اور ہمہ گیر وژن شامل ہے۔جس میں زندگی کی تمام دردمندی، اضطراب،خلش ،بے بسی اور بے چارگی ہے۔ وہیں ان کے ناول بھی عصری زندگی میں پیش آنے والی تبدیلیوں، بدلتی ہوئی قدروں اورنفسیاتی الجھنوں کےغماز ہیں۔اورفنی اعتبار سے بھی ان کے کارناموں میں کافی وسعت نظر آتی ہے۔

خواجہ احمد عباس کے ناول ''انقلاب اور دنیا میرا گاؤں'' کو تاریخی ناول قرار دیا ہے۔انقلاب میں 1917 سے1932 تک کے حالات کا ذکر ملتا ہے۔جس وقت آزادی کی جدوجہد شروع ہوئی تھی۔اس میں سامراجی استحصال، جاگیرداروں اورسرمایہ داروں کےظلم وتشدداور ہندوستانیوں کی غربت، جہالت اورپسماندگی کا ذکر ہے۔ساتھ ہی سیاسی تحریکوں اورحب وطنی کے جذبے کی بھی روداد ہےجس میں خواجہ احمد عباس نے ناول کے ہیروانور کے ذریعہ اپنی زندگی میں ہونے والے تجربات اورمشاہدات کو پراثر انداز سے پیش کیا ہے۔

دنیا میرا گاؤں 1938 سے شروع ہوتا ہے جب نیویارک میں فاشزم کے بڑھتے ہوئے خطرات کو روکنے کے لیے کانفرنس کی گئی تھی جس میں خواجہ احمد عباس نے خود بھی شرکت کی تھی۔

ان دو ناولوں کے علاوہ ''تین پہیے'' بھی ایک اہم ناول ہے۔یہ ایک علامتی ناول ہے جوممبئ کی سفاکی،سیدھے سادے انسان کا استحصال اوران کی مجبوری پرمنحصر ہے۔جس میں انسانی اقداراورتہذیب کے شکست وریخت کا المیہ بھی ہے۔جس کا کردار بھیلو ہے۔جسے پیٹ پالنے کے لیےممبئ کی سڑکوں پر بھیک مانگنی پڑتی ہے۔دوسرے ایک نوجوان لڑکی کی کہانی ہے جوملکہ حسن بننے کے لیےممبئ آئی ہوئی ہوتی ہے۔لیکن ایک دولت مند کی ہوس کا شکار ہوجاتی ہے۔تیسری ایک جلے ہوئے سٹوو کی کہانی ایک مظلوم عورت کی زبانی جواپنے شوہراورساس کے ہرظلم کو برداشت کرتی ہےلیکن پھربھی بچہ نہ ہونے کی صورت میں اسے اس وقت جلا دیا جاتا ہے جب وہ حاملہ ہوتی ہے۔اس کے بعد ایک 18 سالہ ساؤتھ انڈین لڑکے کی کہانی ہے جونوکری کی تلاش میں ممبئ میں آتا ہےاس کے علاوہ ایک بڑھئی کی داستان ہے جودوسروں کے بچوں کے لیے گڈ یلے بناتا ہےمگر جب اس کے یہاں بڑھاپے میں بچہ پیدا ہوتا ہےتواس کی بیوی اس کواوراس کے بچے کوچھوڑ کر بھاگ جاتی ہےاور بچے کو غنڈے اٹھا کر لے جاتے ہیں۔اورایک کہانی چھ خالی ڈبوں کی کہانی ہےفلمی دنیا کی جھوٹی اوردکھاوے کی زندگی

سے سمجھوتہ نہ کرنے پر سرمایہ داروں کے ظلم کا شکار ہو جاتا ہے۔اس طرح زاہدہ زیدی نے اس پوری کہانی کا تجزیہ کرتے ہوئے ان سب کہانیوں کا رشتہ اس گاڑی سے جوڑا ہے جس میں یہ چیزیں جمع کی گئی ہیں۔

خواجہ احمد عباس کے ناولوں، افسانوں اور صحافتی زندگی کا جائزہ لینے کے بعد زاہدہ زیدی نے فلم رائٹر اور فلم ڈائرکٹر کی حیثیت سے بھی ان کی زندگی پر مختصراً راشنی ڈالی ہے۔وہ ایک ناموراور ممتاز ڈائرکٹر بھی تھے۔ان کی متعدد فلموں کو بین الاقوامی انعامات سے بھی نوازا جاچکا ہے۔ان فلموں میں دھرتی کے لال، ہمارا گھر، منا، آوارہ، شری چار سوبیس، بھومی اور میرا نام جوکر ہے شامل ہیں۔

اس طرح زاہدہ زیدی نے اس پورے مضمون میں خواجہ احمد عباس کے خاندان، تعلیم وتربیت، ان کی صحافتی، تخلیقی اور فلمی زندگی پر فرداً فرداً روشنی ڈالی ہے جس کے ذریعہ ہم خواجہ احمد عباس کی پرخلوص شخصیت، ان کی ذہانت وذکاوت، ان کی فکر، ظرافت، سنجیدگی، وسعت نظر اوران کے فکری وژن کا اندازہ بخوبی لگا سکتے ہیں۔

اگلا مضمون ''اختر الایمان کی شاعری کا فکری اور فنی ارتقاء'' ہے۔جس میں زاہدہ زیدی نے اختر الایمان کی دس نمائندہ نظموں کے ذریعہ روشنی ڈالی ہے۔نہوں نے اختر الایمان کی شاعری کو کچلے ہوئے انسانوں کی بے کسی اور بے نوائی سے گہری ہمدردی اوران کے مقدر سے وابستگی بتائی ہے اختر الایمان نے اپنی ذاتی محرومیوں مایوسیوں کو پوری دنیا کے غم اور رنج میں ڈھال کر اپنی شاعری کو زندگی کے ادراک اور گہری بصیرتوں کے انکشاف کا ذریعہ بنایا ہے۔ان کی شاعری میں تنوع، وسعت، مرکزیت کے ساتھ ساتھ فورم اور تکنیک کی طرف بھی توجہ ملتی ہے۔اس مضمون میں زاہدہ زیدی نے ان کی اس نظموں میں جن میں مسجد، پگڈنڈی، پرانی فصیل، تنہائی میں، ایک لڑکا، یادیں، بازآمد، ایک منتاج، کالے سفید پروں والا پرندہ اور میری ایک شام، شیشے کا آدمی اور اپاہج گاڑی کا آدمی شامل ہیں۔جن کی فکری اور فنی خصوصیات کا زاہدہ زیدی نے جائزہ لیا ہے۔

پہلی نظم ''مسجد'' پر روشنی ڈالی ہے۔جو اختر الایمان کی ابتدائی نظموں میں شامل ہے۔اس میں اختر الایمان نے زندگی نے بہت سے تاریخ پہلوؤں کو روشن کیا ہے۔اور مسجد کو ایک علامت کے طور پر پیش کیا ہے۔اس نظم زاہدہ زیدی نے شعری اور حسیاتی منظر کی وضاحت بھی کی ہے۔ویران اور شکستہ مسجد اس کے ٹوٹے

ہوئے مینارے، محرابیں اور بجھی ہوئی شمعیں زندگی کا آخری نشان ہیں۔ لیکن اس شکستہ اور اجڑی ہوئی مسجد میں بھی زندگی کے تسلسل کی رعشہ دوانی نظر آتی ہیں۔ وہ لکھتی ہیں؛

اس شکستہ اور اجڑی ہوئی مسجد میں زندگی کے تیکھے آثار اس کے تسلسل اور دوام کی طرف بھی اشارہ کر رہے ہیں ٹوٹی ہوئی دیوار پر چنڈول کا گیٹ، ابابیل کی لنترانیاں، بوڑھا گدھا جو اس کی دیوار کے سائے میں اکثر سستا لیتا ہے اور وہ راہگیر جو مبہم خوف کے باوجود اسے چند لمحہ آرام کے لیے غنیمت جانتا ہے اس کی زندگی کی نشانیاں ہیں۔ جو اس ویرانی میں بھی اپنا جلوہ دکھا سکتی ہے۔ اور سب سے زیادہ وہ رعشہ زدہ ہاتھ جو ہر شام یہاں اگر ایک دیا جلا دیتے ہیں اور جنہیں اختر الایمان نے مذہب کا آخری نمائندہ کہا ہے انہیں وقت کی سازشوں کو ناکام بنانے کی ایک شعوری کوشش کے طور پر بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے وقت کی آندھی میں چراغ جلانے کی کاوشیں ہمیشہ تو کامیاب نہیں ہوتیں لیکن پھر بھی یہ کوشش کرتے رہنا انسان کا ایک اعلیٰ منصب ضرور ہے۔ نظم کا آخری بند جس میں قریب بہتی ہوئی ندی یہ اعلان کرتی ہے

کل بہا لوں گی تجھے توڑ کے ساحل کی قیود اور پھر گنبد و مینار بھی پانی پانی 11ے

پگڈنڈی اور پرانی فصیل بھی ابتدائی دور کی علامتی نظمیں ہیں۔ پگڈنڈی کو زاہدہ زیدی نے اقبال کی ''جوئے آب'' کے مماثل قرار دیا ہے۔ جس میں بصری اور حرکی پیکروں کو آپس میں پیوست کیا گیا ہے۔ اور جس میں اختر الایمان نے پگڈنڈی کے مادی خدوخال کی وضاحت کی ہے۔؛

نظم پگڈنڈی میں علامتی پیکر کے ساتھ زندگی حسن، انسانوں کی بے بسی، بیچارگی اور تنہائی کا بیان ہے لیکن اس نظم کا انجام مایوسی اور شکستہ خواب ہے۔ لیکن پھر بھی زندگی کے سفر کو کسی نہ کسی طرح جاری دکھایا گیا ہے۔

پرانی فصیل بھی علامتی نظم ہے اس میں بھی ہم زندگی کے کئی تاریک پہلوؤں کو دیکھتے ہیں۔ اور یہ ماضی کے کئی پہلوؤں کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے۔ چند مثالیں:

مرے رخنوں میں ہے الجھا ہوا اوقات کا دامن مرے سائے میں حال و ماضی رک کر سانس لیتے ہیں
یہاں سورج شعاعیں پھینک دیتا ہے یہ مجبوری مگر پھر بھی کسی گوشے میں کچھ تاریک سے خاکے
جنہیں کرنیں نظر انداز کر جاتی ہیں جلدی میں بنا کر ہیں، بنتے ہی رہے ہیں اک زمانے سے 12ے

اختر الایمان کی ایک اور ابتدائی نظم ''موت'' ہے جس میں عورت اور مرد کے آپسی تعلقات کا اشارہ ہے جس کو موت کے فریم میں پیش کیا گیا ہے۔ اسے زاہدہ زیدی نے ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی نظم Portrait of a lady سے متاثر بتایا ہے۔ اس نظم میں عورت اور مرد کے جذبات اور ان کے مبہم ارادوں کا بیان ہے۔ ساتھ ہی زاہدہ زیدی نے اس نظم کو نیم ڈرامائی نظم بھی قرار دیا ہے۔

اگلی نظم ''ایک لڑکا'' ہے جو اختر الایمان کی ایک طویل نظم ہے۔ جس میں اختر الایمان نے اپنا ذاتی کرب، سوز اور عصری آگاہی کی جھلک بھی دکھائی ہے اور پوری نظم یادوں اور بازیافت پر منحصر ہے پہلے نظم کا تعارف پھر شاعر کے بچپن کی نامعلوم یادیں اور پھر ایک بڑے اور صنعتی شہر کے نقوش اور اپنے ذاتی تجربات کو بیان کیا گیا ہے۔ اور ان سب کو اختر الایمان نے مخصوص ڈرامائی انداز میں پیش کیا ہے نظم کے ابتدائی اشعار کو زاہدہ زیدی نے حوالہ کے طور پر پیش کیا ہے۔

میرے شانوں پر ترا سر تھا نگاہیں نمناک   اب تو اک یاد سی باقی ہے سو وہ بھی کیا ہے

گھر گیا ذہن غم زیست کے اندازوں میں 13

اگلی نظم جس کی طرف زاہدہ زیدی نے توجہ مبذول کی ہے ''یادیں'' ہیں۔ اختر الایمان کی یہ نظم ایک طرح سے نظم ''ایک لڑکا'' کی توسیع ہے۔ جس میں انہوں نے آج کی مصروف ومشغول اور صنعتی وشہری زندگی اور اس کی چمک دمک کو پیش کیا ہے۔ اس کے پس منظر میں بھی پہلی نظم کی طرح ایک گاؤں کی یادیں وابستہ ہیں۔ جہاں کبھی دو دوست ایک ساتھ زندگی کے مزے لیا کرتے تھے۔ لیکن اب شہر کی طرف منتقل ہونے کے بعد زندگی بالکل بدل چکی ہے۔ اس صنعتی شہر میں ہر کوئی اپنی آرزوئیں اور تمنائیں پوری کرنے کی فکر میں ہے۔ کسی کے پاس دوسرے کے لیے وقت نہیں۔ لوگ ایک دوسرے سے کٹے ہوئے اجنبی دنیا میں تنہا زندگی گزار رہے ہیں۔ جس کا احساس شاعر کے ان اشعار سے ہوتا ہے جو زاہدہ زیدی نے پیش کیے ہیں:

شہر تمنا کے مرکز میں لگا ہوا ہے میلا سا   کھیل کھلونوں کا ہے ہر سو اک رنگین گلزار کھلا

وہ اک بالک جس کو گھر سے اک درہم بھی نہیں ملا   میلے کی سج دھج میں کھو کر باپ کی انگلی چھوڑ گیا

بھیڑ میں راہ ملی نہیں گھر کی اس آباد خرابے میں 14

دراصل اختر الایمان نے اس صنعتی شہر کی چمک دمک اور اس کی بکتی شرافت ونجابت اور محبت کو اپنی

آنکھوں سے دیکھا تھا وہ خود بھی اس بے حس زندگی کا کئی سال تک حصہ رہے تھے۔انہوں نے اس نظم میں بھی اس شخص کی نشاندہی کی ہے جو کبھی اپنے سے کمتر لوگوں کے سامنے سر جھکاتا ہے، کبھی اپنے فن کا سودا کرتا ہے اور کبھی یہ سب کرتے ہوئے اپنے ضمیر کا گلا گھونٹتا ہے۔لیکن اس شخص کو زندگی کے اس مشکل سفر میں سماجی اور سیاسی حالات سے آگاہی بھی ہوتی ہے۔اور پھر یہ شخص ان سیاسی سماجی چالبازیوں کو خاموشی سے برداشت کرنا سیکھ جاتا ہے۔اس سے فرار کی کشش کرتا ہے۔اس کے بارے میں زاہدہ زیدی کا خیال ہے:

> اس نظم کے سیاق وسباق میں یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ یہ آدمی اختر الایمان نہیں بلکہ شاعر کا ایک کسی قدر افسانوی روپ ہے جو ایک عام انسان کا استعارہ ہے۔اوراب یہ عام آدمی اختر الایمان کی شاعری میں ایک مستقل موضوع کی حیثیت سے نمودار ہوتا ہے جسے مختلف سیاق وسباق میں اور مختلف زاویوں سے پیش کیا گیا ہے۔عصر حاضر کے انسان کی پیش کش کے توسط سے اختر الایمان نے وسیع سے وسیع تر مسائل کا احاطہ کیا اور ساتھ ہی اس پیش کش میں ان کے لہجے کی بتدریج تبدیلی بھی قابل توجہ ہے۔15

زاہدہ زیدی نے اختر الایمان کی شاعری کی علامتی واستعاراتی اور پیکر تراشی کی خصوصیات کے علاوہ اینٹی ہیرو کی بھی نشاندہی کی ہے جو ہیرو نہیں بلکہ اینٹی ہیرو کا کردار ہے جو اس کھوکھلی اور بے معنی زندگی کا نہ صرف استعارہ ہے بلکہ ایک متوسط طبقے کا نمائندہ بھی ہے جس کے ذریعہ اختر الایمان کی شاعری میں طنز کی لہر زیادہ تیز ملتی ہے۔جوان کی نظم ''عمر گریزاں کے نام، ادھر نہ جاؤ، گونگی عورت سے، نظم کی تلاش اور شیشے کا آدمی میں خاص طور سے نظر آتا ہے۔شیشے کا آدمی میں اس اینٹی ہیرو کی مکمل اور واضح تصویر دیکھنے کو ملتی ہے۔یہ ایک مختصر نظم ہے اس نظم میں یہ آدمی اپنے روز وشب کی تفصیل بڑے مختصر نداز میں بیان کرتا ہے۔اس میں اختر الایمان نے متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے ایک غریب شخص کی المنا کی کو علامتی پیکر تراشی، تمثیلی اور نیم ڈرامائی انداز میں پیش کر کے اس کی پر درد داستان بیان کی ہے۔اختر الایمان کا یہ اینٹی ہیرو بے حس بے رحم یا انقلابی نہیں بلکہ ایک حوصلہ منداور جرات مند کردار ہے۔اختر الایمان نے اس اینٹی ہیرو کو زاہدہ زیدی نے انگلش شاعر ٹیڈ ہیوز TED HUGHES کا ایک کردار THE CROW اس کے شعری مجموعے THE CROW کا منتقل کردار بتایا ہے۔ Ted Hughes کے اس کردار کے بارے میں زاہدہ زیدی نے لکھا ہے:

یہ عجیب وغریب مخلوق ’’کوا‘‘ جو نہ صرف کوڑے کرکٹ اور غلاظت میں اپنا رزق تلاش کرلیتا ہے بلکہ نئی صورت حال میں نئے نئے پینترے بھی بدلتا ہے۔اور دلدل یا کوڑے میں پھنس جانے کے بعد پر بار لوٹ پیٹ کر باہر بھی نکل آتا ہے۔ایک علامتی کردار ہے اور ان نظموں کو غور سے پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ بنیادی طور پر یہ ’’کوّا‘‘ ایک surviver ہے جس نے نہایت گھناؤنے اور نامساعدات حالات میں بے حد معمولی اور کسی قدر مبتذل انداز ہی سے سہی جینے کا فن سیکھ لیا ہے۔اور ظاہر ہے یہ اینٹی ہیرو عصری منظرنامے کا ایک اٹوٹ حصہ ہے۔16؎

اس کے بعد زاہدہ زیدی نے نظم ’’اپاہج گاڑی کا آدمی‘‘ پر روشنی ڈالی ہے۔جس میں اختر الایمان نے اپنے ذاتی غم کو آفاقی اور کائناتی غم کے سانچے میں ڈھالا ہے۔جو نہ صرف اختر الایمان کا بلکہ عصر حاضر کے تمام انسانوں کا ذہنی وروحانی،اقدار کا زوال اور مادی و صنعتی اقدار کی بالادستی،زندگی کی بے یقینی اور سکون ومسرت کے فقدان کا المیہ ہے۔اس نظم میں واحد متکلم کا کردار آج کے انسان کا نمائندہ نظر آتا ہے۔

یہ لا کا سفر لا ہے گا کہ کچھ اس کا حاصل ہوا ہے؟
کہ جیسی تھی برسوں سے ویسی ہی تشنہ لبی ہے 17؎

اس نظم کو زاہدہ زیدی نے انسان کی بے بسی،بے کسی کا نوحہ،ظلم ودہشت گردی اور الجھی ہوئی زندگی کا عکس بتایا ہے جہاں مذہب بھی ایک عامیانہ تصور ہے اور مذہب کے ٹھیکیدار نہ صرف لوگوں کو آپس مین لرواتے ہیں بلکہ مذہب کی افیون کھلا کر سلا بھی دیتے ہیں اور اس صنعتی زندگی میں مذہب بھی ایک تجارت بن کر رہ گیا ہے۔

اس کے بعد زاہدہ زیدی نے ان دو نظموں باز آمد اور منتاج پر توجہ مبذول کی ہے۔جن میں گاؤں و دیہات کی زندگی کی منظر کشی کی گئی ہے ان نظموں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ نیم ڈرامائی نظمیں ہیں جو کہ اختر الایمان نے اکثر جگہ اپنی شاعری میں استعمال کی ہے۔

اگلی نظم ’’کالے سفید پروں والا پرندہ اور میری ایک شام‘‘ ہے اس میں گاؤں کے ایک عاشق ومعشوق کی کہانی ہے۔لیکن اس کے پس منظر میں ایک صنعتی شہر کی زندگی ہے۔دونوں میں گہری معنویت ہے جو زندگی کے تضادات کا اشاریہ بھی ہے اور زندگی کی المناکی اور پیچیدہ حقیقتوں کا احاطہ کرتی ہے۔

اس پورے مضمون میں زاہدہ زیدی نے اختر الایمان کی ان مذکورہ نظموں پر جو موضوعاتی اور فنی وفکری

لحاظ سے قابل توجہ ہیں روشنی ڈالی ہے۔خاص کر ان نظموں میں انہوں نے اختر الایمان کی ان نظموں کو شامل کیا ہے جو پیکر تراشی ،نیم ڈرامائی اور علامتی واستعاراتی اعتبار سے زیادہ کامیاب ہیں۔

اختر الایمان کی ان نظموں میں فنی رویوں کی شناخت کے ساتھ زندگی کے پیچیدہ پہلوؤں ،نفسیاتی الجھنوں ،زندگی کے تضادات اور ذاتی غم کو کائناتی غم میں ڈھالنے کے بہترین نمونے ملتے ہیں انہوں نے نہ صرف دیہات کی زندگی کو دیکھا تھا بلکہ صنعتی شہر ممبئی کو بھی قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا تھا جہاں فلمی دنیا سے ان کا وابستہ رہا تھا۔وہاں انہوں نے نہ صرف شرافت ونجابت کو بلکہ آبرو محبت کو بھی بکتے ہوئے دیکھا تھا انہیں سب چیزوں کا ذکر ہمیں ان کی شاعری میں پیکر تراشی اور علامتی انداز سے دیکھنے کو ملتا ہے۔زاہدہ زیدی کا خیال ہے کہ اختر الایمان کی شاعری میں زندگی کی ایک معنی خیز تصویر اور ایک المناک وژن کی تجسیم ہے۔اور اس میں انہوں نے روح عصر کو ایک بڑے تیکھے انداز سے بے نقاب کیا ہے۔18

اختر الایمان نے اردو شاعری کو اس منزل سے آگے بڑھایا جہاں ترقی پسندوں نے چھوڑا تھا انہوں نے اس روایت کی نہ صرف توسیع کی بلکہ بلکہ اپنے شعری اور فکری وفنی اعتبار سے اس کی آبیاری کی اور جدید نظم کو وجودی فکر کی گہرائی ،بصیرت اور فلسفیانہ وژن سے بھی روشناس کرایا۔

اگلا مضمون بھی اختر الایمان کی شاعری سے متعلق ہے۔جس کا موضوع ''اختر الایمان کی شاعری میں داستان وعشق'' ہے اس حسن وعشق کو زاہدہ زیدی نے اختر الایمان کی شاعری کا ایک اہم حصہ بتایا ہے۔ اختر الایمان کی شاعری کی یہ داستان حسن وعشق ان کے ماضی کی دھندلی یادوں اور خواب آلودہ فضاؤں میں ہوکر نامحرومیوں اور نارسائیوں کا شکار ہو جاتی ہے۔

اس مضمون میں زاہدہ زیدی نے اختر الایمان کی عشقیہ شاعری کو مختلف ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ابتدائی دور کی عشقیہ شاعری میں مآل ،لغزش ،محلکے ،ریت کے محل اور وداع کو شامل کیا ہے۔اس ابتدائی دور میں عاشق و معشوق دونوں کا کردار افسانوی ہے اس کے ساتھ وقت کی تیز رفتاری کا تصور ،محبت کی گریز پائی کا تصور ،خوابوں کی مسیحائی کا تصور اور لمحہ حال کی اہمیت کا تصور اہم خصوصیات بتائی ہیں نظم مآل میں محبت کے لمحاتی تصور کو فطرت کے تناظر میں لغزش خیال ،محبت کی نارسائی اور محرومی محبت کے دل شکن تجربے کو شکست کے فریم میں پیش کیا ہے

جبکہ نظم ''محکمے'' میں محبت کے ترقی پسند تصور کے اثرات ہیں۔

اس کے علاوہ ''محرومی'' بھی ایک عشقیہ نظم ہے۔ جو رومانی جذبے میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اس نظم میں داخلی جذبوں کا اظہار ہے لیکن ساتھ ہی لمحہ حال کی کربنا کی کو قبول کرنے کا احساس بھی۔ نظم ''وداع'' بھی ان کے حسن و عشق کی داستان ہے جس میں محبت کے نامکمل تجربے کو ڈرامائی اظہار میں پیش کیا گیا ہے۔ ماضی کی یادوں کے دھندلکوں کے ساتھ مستقبل کا عکس بھی ہے جہاں عاشق اپنی عشق کی یادوں میں گم نظر آتا ہے لیکن اب اسے صرف ایک کسک باقی ہے۔

اس دور کی ایک اور نظم ''ریت کے محل'' اس کا کردار بھی ایک ایسا عاشق ہے جو زندگی کے سفر میں تنہا گامزن ہے اور نظم کا انجام بھی رنج والم اور مایوسی ہے۔ اختر الایمان کی ان ابتدائی نظموں میں مرکزی کردار عشق ہی ہے جوان کے لیے ایک نامکمل اور پریشان کن تجربہ ہے۔ جس کو انہوں نے علامتی اور ڈرامائی انداز سے پیش کیا ہے۔

اس کے بعد اختر الایمان کی شاعری کا اگلا دور شروع ہوتا ہے اس دور کی نظموں میں زاہدہ زیدی نے سلسلے، ترک وفا، شکست خواب، محرومی اور آخری ملاقات کو پیش کیا ہے۔ یہاں اختر ایمان کا رومان اب خواب آلودہ فضاؤں اور افسانوی انداز چھوڑ کر براہ راست انداز اختیار کر لیتا ہے۔ جہاں اب وہ زندگی کی تگ و دو میں شامل ہو جاتا ہے اور زندگی کے پیچیدہ سفر اور گوناگوں مسائل سے دوچار ہوتا ہے۔ اور اپنی یادوں کو ذات کے نہاخانوں میں پہنچا دیتا ہے۔

نظم ''سلسلے اور ترک وفا میں'' عشق کا تجربے کے ساتھ زندگی کے مختلف تجربات و مسائل کا ذکر ہے جو آج کی الجھنون میں مجبور سہی لیکن کبھی کبھی اپنی محبوبہ کو بھی یاد کر لیتا ہے اور اس کے پاس جانے کی خواہش بھی ظاہر کرتا ہے اور اس کو یقین بھی ہے کہ وہ ضرور ایک دن اس کے پاس جائے گا۔

آخری ملاقات بھی ان عبوری دور کی نظموں میں ہے۔ اور ''شکست کا خواب'' بھی اختر الایمان کی اسی دور کی نظم ہے جہاں ایک طرف عاشق اپنے رومانی جذبے کا اظہار کرتا ہے تو دوسری طرف اس عشق کو وہ زمینی حقیقتوں سے بھی ملا لیتا ہے اور اپنی محبوبہ سے کچھ مطالبے کرتا ہے جو اس کی سادہ زندگی کے ہر گوشے کو روشن

کر دے۔اس دور کی نظمیں زیادہ تر وضاحتی ہیں جن میں جذبی عشق کو خوابوں سے نکال کر حقیقی زندگی سے روشناس کیا ہے۔

اگلے دور کی نظموں میں زاہدہ زیدی نے ''سر رہگزر رے'' اور ''شفقی'' کو شامل کیا ہے جہاں محبوب اور اس کے حسن و جمال کو مرکزی حیثیت حاصل ہے نظم سر رہگزر رے میں اس حسین و جمیل محبوب کا ذکر ہے جس کی طرف عاشق کو بے انتہا کشش محسوس ہوتی ہے جہاں جمالیاتی پہلو کافی نمایاں ہے۔ بقول زاہدہ زیدی؛

''سر رہگزر رے میں محبوب حسین و جمیل اور پرکالۂ آفت بھی ہے اور زمینی بھی۔اور خود شاعر کا عشق اس نوجوان عورت کے لیے بے انتہا کشش و لولہ انگیز بھی ہے۔سرشار بھی اور زمینی بھی جس میں اس نادر لمحے سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کی خواہش اور جمالیاتی پہلو زیادہ نمایاں ہیں۔اور اس خواہش کا اظہار بھی بڑے بے ساختہ اور دلفریب انداز سے ہوا ہے۔

دوسری نظم ''شفقی'' جس میں اختر الایمان نے اپنی ایک محبوبہ شفقی کا ذکر کیا ہے جو ایک افسانوی نام ہے اس نظم میں یادوں کا ایک نگار خانہ نظر آتا ہے جو ان کے اندر پیوست تھا۔اس کے علاوہ جن نظموں کو زاہدہ زیدی نے شامل کیا ان میں باز آمد، مونتاز اور کالے سفید پرندوں والا پرندہ اور میری ایک شام ہیں۔جن میں نو خیز عشق کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

پس دیوار زندہ اور ڈاسنہ اسٹیشن کا مسافر کا ذکر بھی اس مضمون میں شامل ہے۔جن میں عشق اور دیہاتی پس منظر کا ذکر ہے۔خاص کر ڈاسنہ اسٹیشن کا مسافر ان کی ایک معنی خیز نظم ہے جس میں عشق کے معصوم اور المناک تجربے کو بیان کیا گیا ہے جہاں عاشق اپنی محبوبہ قیصر کو چھوڑنے آیا تھا یہ نظم مونتاژ کی تکنیک کے قریب ہے۔جس میں ریل کے سفر کو ڈرامائی انداز سے پیش کیا گیا ہے۔زاہدہ زیدی لکھتی ہیں:

> اس نظم کا طرز اظہار بڑی حد تک ڈرامائی اور تکنیک مونتاژ سے قریب تر ہے۔اور صورت حال شمالی ہند میں ریل کا ایک سفر ہے جس کے دوران ڈاسنہ کا اسٹیشن جہاں کبھی وہ اپنی ایک محبوبہ قیصر کو پہچانے آیا تھا، شاعر کے ذہن میں اس پرانے عشق کی یادوں کو تازہ کر دیتا ہے۔19

آخری دور کی نظموں میں زاہدہ زیدی نے ان نظموں کو شامل کیا ہے جن کا تعلق اختر الایمان کی ڈھلتی

عمر اور احساس سے ہے ۔ان نظموں میں ترغیب اور اس کے بعد، بزدل، مفاہمت اور بنت لمحات شامل ہیں۔ان مین بنت لمحات کو خاص اہمیت حاصل ہے اس نظم میں اختر الایمان نے دیہاتی محبوبہ کے بجائے شہر کی پڑھی لکھی اور مہذب خاتون کا ذکر کیا ہے۔اس نظم میں رسمی تصور سے انحراف کیا ہے اور عشقیہ شاعری کا نیا تصور پیش کیا ہے جو لطافت، سوز و گداز اور جمالیاتی احساس کا منفرد انداز میں بیان ہے۔ان کی ایک اور نظم ''محبت'' جو اختر الایمان کی عشقیہ شاعری کا نقطہ عروج کہی جاتی ہے اور جس میں ان کے ذاتی غم کو کائناتی احساس میں ڈھال دیا ہے اور ذاتی غم میں بصیرت کا احساس بھی ہے۔زاہدہ زیدی کا اس کے متعلق خیال ہے؛

اپنی شاعری میں انہوں نے مصنوعی تصورات اور فرسودہ لفظیات کو ترک کر کے جذبہ عشق کی شدت، گیرائی، لطافت، بے نوائی، ندرت، گریز پائی اور المنا کی کو شعری اظہار کی گرفت میں لانے کی کوشش کی۔ساتھ ہی انہوں نے اس جذبے کو تیز رفتار تبدیلیوں، ثقافتی پس منظر، روایتی اقدار کے زوال اور سماجی مسائل کے تناظر میں سمجھنے کی کوشش بھی کی ہے۔یعنی اسے کسی خیالی یا روایتی ماحول میں پیش کرنے کے بجائے عصری زندگی کے سیاق و سباق میں پیش کیا اور ساتھ ہی اس ہمہ گیر اور پیچیدہ تجربے کو اظہار کے لیے ایک مناسب پیرایہ اظہار اور شعری اسلوب کی تلاش بھی برابر جاری رکھی۔20؎

آخر میں کہہ سکتے ہیں کہ زاہدہ زیدی نے اختر الایمان کی عشقیہ شاعری کے ابتدائی مراحل سے لے کر ان کی عمر کے ارتقائی سفر اور پھر ڈھلتی عمر تک کے مختلف تجربات و جذبات کو تفصیل سے بیان کیا ہے جہاں اختر الایمان کی شاعری کے مختلف اتار چڑھاؤ کا ہمیں بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اختر الایمان نے اپنی ذاتی اور عشقیہ شاعری کو کائناتی تجربے میں ڈھال کر وقت، فطرت اور زندگی کے وسیع تر امکانات کے تناظر میں پیش کیا اور اس جذبے سے انہوں نے ان پہلوؤں کی طرف بھی اشارہ کیا جو شخصیت کے کسی زیریں تہوں میں ڈھل کر فکر انگیز اور معنی خیز ہو جاتے ہیں۔

اس کے بعد کا مضمون ''مخمور سعیدی کی شعری کائنات'' کے عنوان سے ہے۔جس میں زاہدہ زیدی نے مخمور سعیدی کی شاعری کی مختلف فکری و فنی خصوصیات کا جائزہ لیا ہے۔زاہدہ زیدی کے خیال میں اگرچہ مخمور سعیدی کا شمار صف اول کے شعراء میں نہیں ہوتا لیکن ان کی شاعری میں ایک اچھی شاعری کے نمونے مل جاتے

ہیں ۔وہ ایک عام انسان تھے ان کی پریشانیاں اور الجھنیں بھی عام تھیں اور انہوں نے اپنی شاعری میں عام انسان کے جذبات و احساسات، پریشانیوں اور رنج وغم وغیرہ کو اظہار کا جامہ پہنایا انہیں فطرت سے خاص لگاؤ تھا وہ اپنے گردوپیش کی چیزوں سے بھی متاثر ہوتے تھے ان کی نظر روز وشب کی کوئی چیز اوجھل نہیں ہوسکتی تھی۔جس کا ذکر انہوں نے اپنی شاعری میں نہ کیا ہو زاہدہ زیدی لکھتی ہیں:

جب ہم اس معمولی انسان کے شعری سرمائے کو ذرا قریب سے دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس نگار خانے میں دل کش اور نظر نواز تصویروں کی کمی نہیں جن میں شاعر نے سوز وگداز، دردی مندی، آرزومندی اور حسن پرستی کے ہلکے اور گہرے رنگ بھرے ہیں اور اکثر انہیں یادوں اور خوابوں کے فریم میں جڑ دیا ہے۔ ہاں ایک رنگ جو بار بار ابھرتا ہے۔وہ بے بسی، محرومی، بے رسائی اور بیزاری کا سرمئی رنگ ہے جو کہیں ہلکا اور کہیں گہرا ہے۔

لذت لمس سے بیگانہ، ہراساں ،حیراں　　　نرم و نازک سا بدن خواب کے پیکر کی طرح
اس نے آواز میں آواز ملا دی تھی کبھی　　　آج تک ختم نہ ہوئی موسیقی جذبات ہوئی
رنگ و نکہت کا یہ موسم ہے کہ پیغام اس کا　　　لکھ گئی ہر ورق گل پہ صبا نام اس کا 21ے

وہ حسن پرست اور عاشق مزاج شاعر ہیں تو دوسری طرف ان کی شاعری میں ہر جگہ امیدی و نومیدی ،لطف و سرور اور یاس و محرومی چھائی رہتی ہے۔اور انہوں نے اس یاس و ناامیدی کو فطرت کے بیان کیا ہے۔اس یاس و ناامیدی کا حوالہ زاہدہ زیدی ان اشعار کے ذریعہ پیش کرتی ہیں؛

دل تھا آس کی لہروں پہ کنول کی صورت　　　یاس کی جھیل میں ڈوبا کسی پتھر کی طرح
آج امید کی لہروں پہ رواں ہے کشتی　　　کل اسے یاس کے ساحل پہ اترنا ہوگا 22ے

کبھی وہ اپنے دکھ درد کا بیان کرتے ہیں تو کبھی ان کا مداوا ڈھونڈتے ہیں۔ جہاں اس سے چھٹکارا پانے کے لیے اسے موت ہی منزل مقصود نظر آتی ہے۔تو وہ کبھی ماضی کی یادوں میں پناہ لینا چاہتا ہے اور کبھی اپنے اندرون میں پناہ لینے کی کوشش کرتا ہے۔لیکن یہ دکھ درد غم وسفا کی اس کی زندگی کا ایک حصہ بن چکی ہیں۔اس رنج والم کے علاوہ انہوں نے فرقہ وارانہ فسادات سے بھی متاثر ہوکر بہترین اشعار تخلیق کئے ہیں۔ اور انسانیت کے خاتمے پر دہشت گردی اور ظلم وستم کے خلاف نوحہ کیا ہے ان کربناک موضوعات کو انہوں نے اپنی شاعری کا حصہ بنایا ہے۔

موضوعات کے علاوہ ان کی شاعری میں فنی خصوصیات کا ذکر بھی زاہدہ زیدی نے کیا ہے۔جس میں ان کی شاعری کی ایک اہم خصوصیت شعری پیکر کا تذکرہ ہے جو کہ اردو کے شاعروں کے یہاں کم دیکھنے کو ملتا ہے لیکن زاہدہ زیدی کے خیال میں مخمور سعیدی کی شاعری میں اس کی کچھ مثالیں مل جاتی ہیں۔وہ ان کی شاعری کی فنی خصوصیات کے بارے میں لکھتی ہیں کہ مخمور سعیدی کی غزل اردو کی شعری روایت اور جدید طرز فکر کا ایک متوازن امتزاج ہے۔زبان و بیان پر قابل لحاظ دسترس، سادگی، بے ساختگی اور سوز و گداز ان کی اچھی غزلوں کی کچھ قابل قدر خصوصیات ہیں۔23ء

غزل کے بعد زاہدہ زیدی نے ان کی نظم نگاری کی طرف توجہ مبذول کی ہے۔ان نظموں میں رات کا سفر اور نیا سال جو کہ ان کے شعری مجموعے سیہ بر سفید میں شامل ہے۔ان کے علاوہ نظم شام، شنیدہ، تاریک جزیرہ، پرانا شہر، خرابے میں، سالگرہ، گریز پا، مراجعت اور قید و بند غم کا ذکر کیا ہے جن میں اختر الایمان فیض اور مجاز کا اثر نمایاں ہے مثلاً آباد خرابے میں اختر الایمان کی نظم مسجد، سالگرہ میں مجاز کی نظم ان کا جشن سالگرہ اور تاراایک جزیرہ پر بھی اختر الایمان کی ابتدائی نظموں کا اثر زاہدہ زیدہ نے بتایا ہے۔ان نظموں کے علاوہ مراجعت قید حیات رنج و غم، بلاوا، لمحوں کے چراغ، دائروں کے قیدی وغیرہ کو زاہدہ زیدی نے کامیاب نظموں کے زمرے میں شامل کیا ہے۔

مخمور سعیدی کی نظموں کا دوسرا مجموعہ ''آواز کا جسم'' ہے۔جلتی دوپہر کا سفر، اندھی گپھا میں موت، وہ شہر اسی جگہ ہے، لہو میں ڈوبتا منظر، خزاں کا موسم، خواب میں سمندر کا نوحہ، سفر رائگا، رات کی تاریکی میں، خاک و باد سے آگے اور لمحوں کا حسن وغیرہ ان کی بہترین نظمیں ہیں۔ان دو شعری مجموعوں کے علاوہ ''واحد متکلم'' ہے جو کہ تمام تر غزلوں پر مشتمل ہے۔ان کے علاوہ آتے جاتے لمحوں کی صدا، بانس کے جنگلوں سے گزرتی ہوا میں نظمیں شامل ہیں۔جن کی کچھ نظموں کا ذکر زاہدہ زیدی کی کیا ہے ان میں سفر کا آخری منظر، رفتگاں، خاک آلود شب و روز کی تنہائی میں، لہو تماشا، ہوا کو نہ روکو، اندھیری رات کا منظر وغیرہ شامل ہیں۔زاہدہ زیدی کے مخمور سعیدی کی شاعری پر اس تجزیے سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ مخمور سعیدی کا نام اگر چہ عصر حاضر کے بڑے شعراء میں نہیں ہوتا لیکن ان کا نام آج کے اہم شاعروں میں ضرور لیا جا سکتا ہے جنہوں نے اپنے معاشرے کے

ان مسائل کا خاص طور سے ذکر کیا ہے جو آج ہر انسان کے سامنے درپیش ہے۔تنہائی، ذات کا کرب، رنج وغم، موجودہ عہد کے انسان کا المیہ، زندگی کی سفا کی اوران سب سے بچنے کے لیے ماضی کی یادوں میں پناہ لیناوغیرہ ایسے موضوعات ہیں جوان کی شاعری میں ہر قدم پرنظر آتے ہیں۔اور جن کوانھوں نے اپنے ذاتی تجربے کی روشنی میں پیش کیا تھا۔

اگلا مضمون ''رفعت سروش کے منظوم ڈرامے'' کے نام سے شامل کیا گیا ہے۔جس میں زاہدہ زیدی نے رفعت سروش کے منظوم ڈراموں پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔پہلے تو زاہدہ زیدی نے انگلستان اورامریکہ میں منظوم ڈرامے کے احیاء کا ذکر کیا ہے۔جس میں ڈبلیو بی ییٹس اور ٹی۔ایس۔ایلیٹ، کرسٹوفرفرائی، میکسول انڈرسن اور فیلڈ جیسے عظیم شاعر شامل ہیں۔جنھوں نے منظوم ڈرامے کی اس پرانی روایت کواز سرنو زندہ کیا اور نئے ڈرامے کو بلندیوں تک پہچانے کے لیے نثر کے بجائے شعری اظہار کو وسیلہ بنایا جس وہاں منظوم ڈرامے کو کافی فروغ ہوا۔

امریکہ اور انگلستان کے ساتھ ہندوستان میں بھی منظوم ڈرامے کی روایت بہت قدیم ہے۔بیسویں صدی میں مغرب کے زیر اثر ہندوستان میں بھی بہت سے منظوم ڈرامے لکھے گئے۔اوراردو میں بھی کئی دہائیوں سے منظوم ڈرامے کوترقی ہوتی رہی ہے۔اگرچہ صف اول کے شعراء نے اس کی طرف خاص توجہ نہیں دی۔ان میں جن لوگوں نے بھی منظوم ڈرامے کی آبیاری کی ان میں رفعت سروش کا نام خاص طور سے اہم ہے۔ان کے منظوم ڈراموں کی تقسیم زاہدہ زیدی نے کی اس طرح کی ہے۔''ریڈیائی ڈرامے، اوپیرا ڈرامے، ڈانس ڈرامے''، جن میں تمثیلی ڈرامے، موضوعاتی ڈرامے، تاریخی اور نیم تاریخی ڈرامے اور عصری ڈرامے شامل ہیں۔

رفعت سروش کے تمثیلی ڈراموں میں زاہدہ زیدی نے جن ڈراموں کا ذکر کیا ہے ان میں پھولوں کی وادی، روحِ وقت، روشنی کا کارواں، زمین آدم ہیں۔ان میں روح وقت کے علاوہ باقی ڈرامے تمثیلی ڈرامے ہیں۔جن کو ڈرامائی تمثیل کے ذریعہ پیش کیا گیا ہے۔پھولوں کی وادی ایک سیاسی ڈرامہ ہے۔جس میں گاندھی جی اور اندرا گاندھی کے قتل کا ذکر ہے۔اور راجیو گاندھی کی مدح سرائی۔جب کہ ڈرامہ روشنی کا مینار کا موضوع حق وباطل کی جنگ اور زمین آدم تخلیق آدم سے متعلق ہے جب انہیں آسمان سے زمین کی طرف اتارا گیا تھا۔اس

ڈرامے کو اسلامی روایت کے مطابق پیش کیا گیا ہے۔ زمین آدم کو زاہدہ زیدی نے اقبال کی نظم ہمالہ، شعاع امید اور روح ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے سے متاثر بتایا ہے۔ وہ رفعت سروش کے تمثیلی ڈراموں کے متعلق لکھتی ہیں کہ یوں تو رفعت سروش کے تمثیلی ڈراموں میں کافی روانی اور تخیل آفرینی ہے لیکن فکری عناصر کی کمی اور سطحی پن نے انہیں کافی نادار کر دیا ہے یہ ڈرامے وقتی طور پر متاثر کر سکتے ہیں۔ لیکن کسی گہرے داخلی تجربے کا حصہ نہیں بن سکتے ہیں۔ 24؎

رفعت سروش کے موضوعاتی ڈراموں میں ''عورت'' اور ''فکرِ غالب'' ہیں۔ اس میں عورت کی تخلیق کو بہت ہتک آمیز دکھایا ہے۔ پہلے اس کی تخلیق ہوتی ہے اور پھر اسے مرد کا دل بہلانے کا ذریعہ بتایا ہے۔ جو اس کا قدرتی امر ہے۔ اس ڈرامے کو زاہدہ زیدی نے بہت ہی سطحی ڈرامہ بتایا ہے۔ جب کہ فکر غالب میں گہرے اور پیچیدہ موضوع کا انتخاب کیا گیا ہے۔ اس میں غالب کی اہمیت کو واضح کیا ہے اور اس کو پیش کرنے کے لیے وقت، تاریخ اور آواز کا سہارا لیا گیا ہے۔

جہاں تک بات رفعت سروش کے تاریخی ڈراموں کی ہے تو ان ڈراموں میں جہاں آرا، شاہ جہاں کا خواب، جہانگیر، انارکلی اور حبہ خاتون شامل ہیں۔ جن میں ''جہاں آرا'' طویل ڈرامہ ہے اس میں اس وقت کے واقعات اور کرداروں کو بھی دلچسپی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کے تاریخی اور نیم تاریخی ڈراموں کو زاہدہ زیدی نے کافی سراہا ہے۔

عصری اور عام لوگوں کی زندگی سے تعلق رکھنے والے رفعت سروش کے ڈراموں میں شعلہ افسردہ، اسی دیوار کے سائے میں اور گھر کی جنت شامل ہیں۔ جن میں گاؤں اور قصباتی زندگی، وہاں کے خاندانی رشتوں اور اجڑے شہروں کی صنعتی و مشینی زندگی کے تضادات کو دکھایا گیا ہے جس میں کرداروں کی داخلی نفسیات کو بھی نمایاں کیا ہے اور متوسط طبقے کے لوگوں کی عصری زندگی کے مسائل اور پیچیدگیوں کو اپنے منظوم ڈرامے میں پیش کیا ہے۔ ان منظوم ڈراموں پر روشنی ڈالنے کے بعد رفعت سروش کی منظوم ڈرامہ نگاری پر زاہدہ زیدی نے اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

اس تنقیدی مطالعے سے اس بات کا اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ رفعت سروش ایک پرگو اور تجربہ کار شاعر ہیں اور ان کا فطری

رجحان ڈرامے کی طرف ہے ان کے منظوم ڈراموں میں موضوعات،فورم اور شعری اسلوب کے اعتبار سے کافی تنوع ہے۔اور تقریباًاس کے ہر میدان میں انہوں نے قابل قدر کام انجام دیا ہے۔وہ اس معاملے میں بھی خوش نصیب رہے کہ انہیں اپنے ڈراموں کومختلف طریقے سے پیش کرنے اور معروضی طور پر ان کا جائزہ لیتے رہنے کے مواقع برابر ملتے رہے۔لیکن مجموعی طور پر ماس میڈیا سے ان کی یہ قربت ان کے لیے فال نیک ثابت نہیں ہوئی بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے فکری اور فنی ارتقاءاور انفرادیت کی تلاش میں یہ رشتہ ہمیشہ حائل رہا اور شاید یہی ان کے ادبی اور فنی سرمائے میں انداز فکر اور فکری کم مایگی کی بنیادی وجہ ہے۔25؎

اس کتاب کا آخری مضمون ''کبھی اک چیخ تھا اب خامشی ہوں'' کے عنوان سے سلیمان اریب کی شاعری پر مختصر جائزہ لیا گیا ہے۔جس کی روشنی میں زاہدہ زیدی نے ان کی شاعری کے کچھ فکری وفنی خصوصیات کو ذکر کیا ہے۔ان کے خیال میں سلیمان اریب کی شاعری خود ان کی ذات کا اظہار اور گردوپیش کے ماحول کا آئینہ ہے۔اس میں ان کی ذاتی الجھنوں ،محرومی ،انتشار اور سعی لاحاصل کا بڑی گہرائی و گیرائی اور وسعت ووارفتگی کے ساتھ ذکر ملتا ہے۔جس کی وجہ سے ان کی شاعری میں دردوغم کی کربناکی کا بیان ہے۔کچھ اشعار زاہدہ زیدی نے پیش کئے ہیں:

جیسے روتے ہوئے بچے کو کوئی چمٹائے
یوں غم دہر کو سینے سے لگا رکھا ہے

عالم آشوب میں آج اتنی کہاں ہے فرصت
سانس لینے کو بھی اب کل پہ اٹھا رکھا ہے

دنیا سے لڑائی توازل ہی سے رہی ہے
اب خود سے جھگڑنے کی بھی میں ٹھان رہا ہوں

کہاں تک مجھ کو سلجھاتے رہوگے
بہت الجھی ہوئی سی زندگی ہوں

مرا یہ حشر بھی ہونا تھا اک دن
کبھی اک چیخ تھا اب خامشی ہوں 26؎

ان کے ذاتی انج والم اور محرومی میں غیر معمولی اثر آفرینی خلوص،شدت،صوتی آہنگ سب کچھ شامل ہے لیکن موضوعات کی تکرار بار بار دیکھنے کوملتی ہے۔وہی انتشار،وہی محرومی اور انہیں الجھنوں کا ذکر ہے لیکن سلیمان اریب کا لہجہ اور آواز منفرد ہے۔جوان کی شاعری کا خاصہ ہے۔زاہدہ زیدی نے سلیمان اریب کی کچھ نظموں کا بھی ذکر کیا ہے۔جن میں فرسٹریشن نمبر10اہم نظم ہے۔یہ نظم علامتی معنویت کی حامل ہے۔جس میں تو بظاہر دو کتے پالنے کا ذکر ہے لیکن یہ اصل میں ایک بے معنی،بے مقصد اور اکتا دینے والی زندگی کی کہانی

ہے۔جس کا احساس پوری نظم پڑھنے کے بعد ہوتا ہے۔ایک اور نظم ڈیپ فریز بھی ایک کامیاب نظم ہے جس سے شعری پیکر تراشی سے کام لیا گیا ہے۔کچھ اور نظموں کا ذکر اس مضمون میں ملتا ہے یہ ہیں تخلیق کی مجبوری، تمہیں کیا، ایک صدی ایک پل، اس دھرتی کے ایک حصے میں، تم کس سے ملنے آئے ہو، کڑوی خوشبو، ایک حزنیہ، عرفان، پیشن گوئی، میرا کمرہ اور خود فراموشی وغیرہ شامل ہیں۔

ان میں نظم ''ایک صدی ایک پل''مختصر نظم ہے جسے زاہدہ زیدی نے کامیاب ترین نظم کہا ہے۔جبکہ تخلیق کی مجبوری کو ایک کمزور نظم بتایا ہے۔جس کا مرکزی خیال تخلیق عمل کا کردار ہے اور نظم ''میرا کمرہ''میں فنی مصوری کو بطور استعارہ استعمال کر کے شعری پیکروں میں ڈھالنے کی کوشش کی گئی ہے۔

بہر حال اس مختصر مضمون میں زاہدہ زیدی نے سلمان اریب کی شاعری کچھ خصوصیات کا تذکرہ کر کے ان کی اہمیت کو واضح کیا ہے اور عصری ادب میں ان کی کوششوں کو قابل قدر اضافہ بتایا ہے جو اگرچہ ان کی شاعری میں کچھ کمزوریوں کی وضاحت بھی کی گئی ہے ان میں وسعت کی گہرائی، وارفتگی اور کسی حد تک فکری عناصر کم ہیں۔

اس مختصر مضمون میں زاہدہ زیدی نے سلیمان اریب کی آخری دور کی شاعری کا خاص کر نظر ڈالی ہے۔ اور ان کی اس آخری دور کی نظموں اور غزلوں دونوں پر طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے زاہدہ زیدی نے ان کی شاعری کے بعض اہم پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا ہے جس سے سلیمان کی شاعری کے فنی وفکری نقوش ابھرتے ہیں بلکہ شاعری میں بھی ان کا مقام تعین کرنے میں معاون ثاوت ہوتے ہیں۔

2۔لذت آشنائی:

لذت آشنائی بھی زاہدہ زیدی کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔جس میں انہوں نے مختلف شعراء کے کلام کا جائزہ لیا ہے اور اپنے مشاہدہ ومطالعے اور بصیرت سے فرداً فرداً ان شعراء کے کلام کی خصوصیات کو واضح کیا ہے۔جن کی فہرست درج ذیل ہے:

غالب کی شاعری کی عصری معنویت کے چند پہلو (اردو غزل کے آئینے میں)

اقبال کی شاعری کے اسرار ورموز

فیض احمد فیض کی شاعری میں جذبہ وفکر کا توازن

سردار جعفری کی شاعری میں پیکر تراشی کی معنویت

سردار جعفری کی شاعری کی فکری اور فنی جہات

نئی دنیا کو سلام کا ڈرامائی اسٹرکچر

وحید اختر کے مراثی میں عصری اور آفاقی بصیرتوں کی بازیافت

آزاد نظم: تفاعل اور امکانات

عصری غزل کا منظر نامہ

انور عظیم: یادیں اور تاثرات

جھلستے جنگل: ایک مطالعہ

مرنے والوں کی جبیں روشن ہے اس ظلمات میں (جگن ناتھ آزاد کے چار شخصی مرثیے)

جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ اس کتاب کا پہلا مضمون ''غالب کی شاعری کی ہمہ گیر معنویت کے چند پہلو (اردو غزل کے آئینے میں)'' کے نام سے ہے اس مضمون میں زاہدہ زیدی نے غالب کو اردو شاعری اور فارسی کا عظیم شاعر بتاتے ہوئے غالب کو دنیا کے عظیم ترین شعراء سوفو کیز، شیکسپیئر، دانتے، گوئٹے، رومی، حافظ، ملٹن، ورڈز ورتھ، کالی داس، اقبال، ایلیٹ اور یوجینو مونتالے وغیرہ کے ساتھ کھڑا کیا ہے۔ بلکہ غالب کو ان سب شعراء پر فوقیت دی ہے۔ اور غالب وشیکسپیئر میں کچھ مماثلت کا بھی ذکر کیا ہے جیسے ان دونوں عظیم شعراء کے یہاں زندگی کو اس کی ہمہ گیری، رنگا رنگی، بوقلمونی، لطف ونشاط، تضادات، المناکی اور بے ثباتی کے ساتھ قبول کرنے کی صلاحیت نظر آتی ہے موضوعات کے برعکس یہ دنوں شعراء الفاظ اور شعری اظہار کے بیان میں بھی دوسرے شعراء پر فوقیت رکھتے ہیں۔ یہ دونوں شعراء مختلف میدان کے شہسوار ہیں۔ یعنی غالب شاعری کے اور شیکسپیئر ڈرامے کے بادشاہ ہیں۔

غالب کی شاعری کی بات کی جائے تو ان کے یہاں مطالعات ومشاہدات اور نادر بصیرتوں کا بیش بہا خزانہ نظر آتا ہے۔ انہوں نے غزل کے روایتی تصور سے انحراف کر کے اس کو غیر معمولی بصیرت زندگی کی

رنگارنگی، گونا گو تجربات، احساسات، افکارو مسائل اور زندگی کے بے شمار تضادات سے نوازا ہے۔
غالب کی غزل کی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے وہ لکھتی ہیں:

غالب کی شاعری شدت فکر اور شدت احساس کا نقطہ اتصال ہے اور اس کی کچھ نمایاں خصوصیات فکر کی ندرت اور انفرادیت، جذبات کی شدت اور لطافت اور شعری اسلاب کی تہ داری اور دبازت ہیں۔انہوں نے زندگی کو اپنی پوری شدت اور ولولہ انگیزی کے ساتھ انگیز کیا لیکن ساتھ ہی وہ زندگی کی ہماہمی کو ایک فلسفی کی طرح شان بے نیازی سے دیکھنے پر بھی قادر ہیں۔فلسفہ تفکر کی بھی ایک لہران کی بیشتر غزلوں میں رواں دواں ہے۔اور ان کے فلسفیانہ افکار کا دائرہ بہت وسیع ہے۔اور اس میں آئیڈیالزم اور تصوف سے لے کر فلسفہ وجودیت، حقیقت پسندی، عقلیت پسندی اور تشکیک (specticism) سبھی کی گنجائش ہے۔27؎

یعنی وہ ایک فلسفی کی طرح زندگی کی بے ثباتی کو بیان کرتے ہیں اور کبھی ایک بچے کی طرح ان تصورات کو کھیلتے بھی دیکھتے ہیں۔ان کے یہاں اپنے ذاتی اور داخلی تجربات کا بیان دنیا کے خارجی مسائل اور آفاقی بصیرتوں کی دنیا آباد ہے اس کے علاوہ ان کے اشعار ان کے دور کی سماجی وسیاسی حالات کی اتھل پتھل اور بحرانی کیفیات کو بھی بیان کرتے ہیں۔چند اشعار زاہدہ زیدی نے پیش کئے ہیں:

رگ وپے میں جب اترے زہر غم تو دیکھیے کیا ہو ابھی تو تلخی کام ودہن کی آزمائش ہے
غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک
نہ گل نغمہ ہوں نہ پردہ ساز میں ہوں اپنی شکست آواز
آتش دوزخ میں یہ گرمی کہاں سوز غم ہائے نہانی اور ہے
ظلمت کدے میں میرے شب غم کا جوش ہے اک شمع ہے دلیل سحر خموشی ہے
خزاں کیا فصل گل کہتے ہیں کس کو، کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں، قفس ہے اور ماتم بال وپر کا ہے28؎

اس مضمون میں زاہدہ زیدی نے غالب کی غزل کو عالمگیر معنویت میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔اور ان کی غزل کی عصری معنویت اور صورت حال جن میں نئی آنے والی زندگی کے نقوش، عقلیت پسندی اور سائنسی کرشموں اور فرسودہ روایات وافکار میں تبدیلی نظر آتی ہے۔مثلاً غالب کا یہ شعر ؎

ہوں گرمیِ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج   میں عندلیب گلشنِ ناآفریدہ ہوں 29؎

جس میں غالب آنے والی زندگی اوراس میں ہونے والی تبدیلیوں سے خوش تھے اوراس کا استقبال کرنے کو ہمہ وقت تیار رہتے تھے لیکن وہ اپنے دور کی سماجی و سیاسی حالت سے بھی متاثر ہوئے تھے انہوں نے اپنے ذاتی غم اورالمناک صورت حال کواس طرح پیش کیا ہے کہ ان کو آفاقی بنادیا ہے۔جس میں ان کی تخلیقی فکر کو خاص اہمیت حاصل ہے ان کا تخلیقی شعور جس قدر ولولہ انگیز تھا کہ انہیں ہمہ وقت نئے نئے چیلینج قبول کرنے اور نئی تبدیلیوں کی طرف اکساتا تھا مثلاً یہ اشعار زاہدہ زیدی نے پیش کئے ہیں:

ہر قدم دوریِ منزل ہے نمایاں مجھ سے   میری رفتار بھاگے ہے بیاباں مجھ سے30؎

غالب کا صوفیانہ اور فلسفیانہ کلام بھی ان کے اشعار میں جا بجا نظر آتا ہے جس کے ذریعہ وہ مظاہر کائنات کی گہرائیوں کو عیاں کرتے ہیں۔ان کے تخیل کی پرواز بہت بلند تھی جس میں زمین سے آسمان تک سبھی چیزوں پر ان کی گہری نظر تھی۔

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے   عرش سے ادھر ہوتا کاش کے مکاں اپنا

انہیں انسانی نفسیات پر بہت گرفت تھی وہ انسان کی داخلی، ذاتی اور خارجی بصیرتوں اور ذہنی الجھنوں کا گہرا شعور رکھتے تھے جس کی وجہ سے انسان کو انہوں نے اپنی شاعری میں ایک خاص اہمیت دی ہے۔جس کی طرف زاہدہ زیدی نے بھی اشارہ کیا ہے:

> انسان کو غالب کی شاعری میں ایک مرکزی مقام حاصل ہے اور کہیں کہیں تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہی تخلیق عالم کا جواز ہے۔اس کی ہستی سمندر کی مانند بے پایاں اور بے قرار ہے۔وہ کائنات کے راز ہائے سربستہ کو سمجھنے کے لیے ہردم بے قرار رہتا ہے۔اس کی ذہانت زندگی کے سوز و گداز اور تخلیقیت کا سرچشمہ ہے اور اس کی داخلی دنیا بجائے خود ایک مکمل کائنات ہے۔

ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو31؎

غالب کی شاعری میں عشق کو بھی اس کی ہمہ گیر معنویت میں دیکھا گیا ہے جہاں عشق لطف ونشاط سے

لے کر دردوغم کی وسیع پنہائیوں کا احاطہ کرتا ہے۔ان کا یہ عشق ان کے فکری رجحانات اور صوفیانہ میلانات سے بھی جاملتا ہے۔ جہاں عشق حسن جمال کی رعنائیوں کے ساتھ تصوف کے رنگ میں بھی پیوست ہوتا ہوانظر آتا ہے۔

غالب کے فلسفیانہ انداز بیان میں مختلف چیزوں پر سوال ملتے ہیں انہوں نے خالق ومخلوق اور موت و زندگی سبھی پر سوال قائم کئے ہیں جس کی وجہ سے اردو غزل میں فکر کا عنصر داخل ہوا ہر قدم پر انہوں نے زندگی کے پیچیدہ مسائل ،نا قابل حل سوالات اور تضادات کا ذکر کیا ہے اور ان کے یہ سوالات مختلف طرح سے ان کی شاعری میں بیان ہوئے ہیں کبھی قول محال ،رمز بلیغ اور طنز کی صورت میں اور کبھی استعارہ سازی اور پیکر تراشی کی صورت میں ۔غرض کہ زاہدہ زیدی نے اس مختصر مضمون میں بھی غالب کی شاعری کی انفرادی خصوصیات کا ذکر کر کے ان کی عالم گیر عظمت کو قبول کیا ہے۔

دوسرا مضمون ''اقبال کی شاعری کے اسرار ورموز'' ہے جس کو زاہدہ زیدی نے پروفیسر اسلوب احمد انصاری کی تصنیف ''اقبال کی منتخب نظمیں اور غزلیں'' کے حوالے سے لکھا ہے۔اور اسلوب احمد انصاری کی اس تصنیف کو تنقیدی نقطہ نظر سے دیکھتے ہوئے اپنی رائے کا اظہار بھی کیا ہے۔

اس تصنیف میں اقبال کی 16 اہم نظموں اور 10 غزلوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔جس کے حوالے سے پروفیسر اسلوب احمد انصاری نے اقبال کی شاعری اور ان کی شعری بصیرت پر بھی نظر ڈالی ہے۔اور ان نظموں کی طرف زاہدہ زیدی نے بھی توجہ مبذول کی ہے کہ اقبال کی شاعری فلسفیانہ قسم کی ہے۔جس میں تفکر کا عنصر اپنی پوری توانائی اور آب وتاب سے جلوہ گر ہے۔اقبال کی شاعری میں وژن ،بصیرت اور عالمگیر تفکر سب کچھ موجود ہے۔غزلوں کے علاوہ جہاں تک اقبال کی نظموں کا تعلق ہے ان کی نظموں کو اردو نظم نگاری کا نقطہ عروج بتایا گیا ہے اور انہوں نے اردو نظم کو فلسفیانہ افکار اور تخلیقی بار فتگی کے اظہار کا وسیلہ بنایا جس کی معنویت اور دو نظم میں غیر معمولی ہے۔جن سولہ نظموں کا ذکر اسلوب احمد انصاری نے اپنی تصنیف میں کیا ہے وہ درج ذیل ہیں:

تسخیر فطرت ،تنہائی ،شبنم ،ارتقاء ،والدہ مرحومہ کی یاد میں ،خضر راہ ،طلوع اسلام ،مسجد قرطبہ ،ذوق و شوق ،ساقی نامہ ،لالہ صحراء ،مسعود مرحوم ،لا الہٰ الا اللہ ،ابلیس کی مجلس شعراء ،شعاع امید ،ایک فلسفہ سیدزادے کے نام۔

اسلوب احمد انصاری کی تجزیہ کی ہوئی نظموں پر زاہدہ زیدی نے اس مضمون میں روشنی ڈالی ہے اور اسلوب احمد انصاری کی تنقیدی روشنی میں ہی ان پر گفتگو کی ہے۔ جس میں انہوں نے تسخیر فطرت، تنہائی اور شبنم کو اسطوری نظمیں قرار دیا ہے جہاں اقبال کا انداز بیان استعاراتی و علامتی ہے۔ جب کہ نظم ''ارتقاء'' کو فلسفیانہ قسم کی نظموں میں شمار کیا ہے۔ جو اقبال کی اسلامی فکر سے قریب تر ہے۔ ''والدہ مرحومہ کی یاد میں'' میں اقبال نے اپنے ذاتی غم کو کائناتی اور آفاقی بنا دیا ہے۔

نظم خضر راہ اور طلوع اسلام دونوں کو اسلوب احمد انصاری نے آپسی مماثلت قرار دیا ہے۔ جس کا تعلق اجتماعی موضوعات سے اور جو عصری حالات و مسائل کی عکاسی کرتی ہیں۔ اسی طرح نظم ''مسجد قرطبہ'' میں اقبال نے عشق کے شدید اور اس کی استقراری اور مدام خصوصیات کا بیان کیا ہے۔ جس کے ذریعہ اقبال نے مسجد قرطبہ کی علامتی معنویت پر روشنی ڈالی ہے۔ اگلی نظم ''ذوق و شوق'' ہے۔ جس میں اقبال کے شوق کا بیان ہے۔ جس کو اقبال نے روح انسانی کا ضروری عنصر قرار دیا ہے۔ جس کے بغیر زندگی کا عمل میکانکی عمل سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔

اس طرح اس مضمون میں اقبال کی باقی نظموں کے ذریعہ بھی ان کے وژن، فکر، ان کے تفکر، تخلیقی قوتوں، ان کی حریت، عشق، فقر اور حوصلہ مندی کی وضاحت کی گئی ہے۔ اسلوب احمد انصاری کی تجزیاتی نظموں کا جائزہ لیتے ہوئے زاہدہ زیدی بھی اقبال کی نظم نگاری پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے۔:

> اقبال کی نظمیں اردو نظم نگاری کا نقطۂ عروج ہیں۔ ان کے موضوعات گہرے، ہمہ گیر اور معنی خیز ہیں۔ اور ان کی ہر نظم ایک مکمل اکائی ہے جس میں ایک نفیس شعری منطق بھی بروئے کار لائی گئی ہے۔ ان کی نظموں میں خیال کا ارتقاء پر پیچ اور حیرت انگیز ہے۔ انہوں نے اردو نظم کو فلسفیانہ افکار اور تخلیقی طرفگی کے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ اور اس کی قدر و قیمت اور مرکزیت میں غیر معمولی اضافہ کیا۔ 32

نظموں کے بعد اسلوب احمد انصاری نے اپنی تصنیف میں اقبال کی جن غزلوں کا تنقیدی جائزہ لیا ہے اس پر بھی زاہدہ زیدی نے روشنی ڈالی ہے۔ اور ان پر ناقدانہ نظر ڈالتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار بھی کیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

نظم کی طرح اقبال نے غزل کو بھی ایک نئے طرز احساس اور طرز تکلم سے آشنا کیا اور اس کے معنوی امکانات میں وسعت پیدا کی۔ غالب کی طرح اقبال نے بھی غزل کو غیر متوقع سمتوں میں لے جا کر اسے توانائی بخشی اور خیال اور جذبے کی تنگ و تازاور رعنائیوں کو اس کے دامن میں سمیٹ لیا۔ اقبال کی غزلیں روایتی معاملات عشق کی آئینہ دار نہیں۔ بلکہ ان کے مابعد طبیعیاتی تصورات اور بصیرتوں کی ترجمان ہیں۔ اور اکثر ایک مخصوص تھیم پر مرکوز ہوتی ہیں۔ ایک طور سے اقبال کی نظمیں اور غزلیں ایک دوسرے کا تکملا کرتی ہیں۔ ان کے تخلیقی سرچشمے اور شعری محرکات مشترک ہیں۔ اور ان کے وژن کو اگر ہم ایک خاص فریم میں پیش کرنا چاہیں تو اسے اسلامک متھ کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اور یہ مصنف کے خیال کے مطابق ایک انقلابی متھ ہے جو کائناتی بصیرتوں کا خزانہ اور انسان کے بے پایاں امکانات کا اشاریہ ہیں۔ 33

اور پھر ان غزلوں پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ یہاں ان غزلوں کا ایک ایک مطلع پیش کیا جاتا ہے جو اسلوب احمد انصاری نے اپنی تصنیف میں پر روشنی ڈالی یہاں زاہدہ زیدی بھی نے ان غزلوں کو اس مضمون میں شامل کیا ہے۔

نہ تو اندر حرم گنجی نہ در بتخانہ می آئی

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں

ایں جہاں چیست صنم خانۂ پندار من است

ہر چیز ہے محو خود نمائی ۔۔ ہر برز رہ شہید کبریائی

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہے 34

وغیرہ پر اظہار خیال کیا گیا ہے کہ اقبال کی نظموں کی طرح ان کی غزلیں بھی ان کے ہمہ گیر اور عالم گیر تفکر کی آئینہ دار ہیں۔ جس میں اقبال کے جذبے کی نرمی، لہجے کی تر و تازگی، دلکشی، صوتی آہنگ، شعری پیکر اور الفاظ و تراکیبوں کا دائرہ نہایت وسیع ہے۔ اور انہوں نے نظموں کی طرح غزلوں کو بھی فلسفیانہ رنگ و آہنگ عطا کیا ہے۔ غرض کہ اس میں کہنا چاہوں گی کہ ایک طرف تو اس مضمون میں پروفیسر اسلوب احمد انصاری کے خیالات کا تجزیہ ہے جو انہوں نے اپنی تصنیف میں اقبال سے متعلق پیش کیا ہے دوسرے اس مضمون پر اظہار خیال کرتے ہوئے خود زاہدہ زیدی نے بھی اقبال کے متعلق اپنے خیالات کو شامل کرتے ہوئے اقبال کی

شاعری میں بہت سی اہم خصوصیات کا بھی ذکر کیا ہے۔جس کی وجہ سے یہ مضمون دو اہم نقاد کے خیالات کی روشنی میں اقبال کی شاعری کے مختلف گوشوں کو روشن کرتا ہے۔

اس کے بعد کا مضمون ''فیض احمد فیض کی شاعری میں جذبہ وتفکر'' ہے جس میں زاہدہ زیدی نے بیسویں صدی کے چار اہم شاعروں کے نام لئے ہیں جن میں اختر الایمان، ن۔م۔راشد، سردار جعفری اور فیض احمد فیض کے نام شامل ہیں۔ان کے علاوہ بھی اس صدی کے دوسرے اہم شعراء کا نام لیا ہے۔جن میں مجروح سلطان پوری، جذبی، مخدوم محی الدین وغیرہ کے نام ہیں۔ان شعراء میں فیض کو جو شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی وہ کسی دوسرے شاعر کے حصے میں نہیں آئی۔فیض کی اس شہرت اور مقبولیت کی ایک وجہ تو زاہدہ زیدی نے خارجی بتائی ہے۔جس کی خاص وجہ ان کا ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہونا، راولپنڈی سازش میں ان کا گرفتار ہونا اور اس کے علاوہ پاکستان کی مختلف جیل میں چار سال تک ان کا زندگی گزارنا، قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنا اور پھر سوویت یونین (روس) میں ان کی غیر معمولی اہمیت ومقبولیت۔یہی وہ خارجی وجوہات تھیں جنہوں نے فیض کی شہرت میں اضافہ کیا۔اس کے علاوہ انہیں ہندوستان کے سیاسی حلقوں میں بھی بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔جس کی وجہ سے ان کا پاکستانی حکومت کے زیر عتاب رہنا تھا۔انہیں خارجی وجوہات میں زاہدہ زیدی نے ان کی ایک اہم خصوصیت ان کی شخصیت کو بھی بتایا ہے۔جس کے بارے میں وہ لکھتی ہیں:

> خارجی وجوہات میں دوسری خاص وجہ یعنی فیض کی نرم وگداز اور دلکش شخصیت کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ان کی شخصیت بڑی پر کشش پر خلوص اور جاذب توجہ تھی اور کسی بھی محفل میں ان کی موجودگی اس کی گرمی، گداز اور صلابت میں اضافہ کرتی معلوم ہوتی ہے۔وہ کم گو تھے لیکن پھر بھی شمع محفل وہی معلوم ہوتے۔شغل مے نوشی کے وہ عادی تھے لیکن اس سے ان کی متوازن، مہذب اور کھری شخصیت کی آب وتاب اور بڑھ جاتی۔ان کی شخصیت کی دلکشی کا ایک اہم پہلو یہ بھی تھا کہ اگر چہ وہ طبعاً حسن پرست اور عاشق مزاج واقع ہوئے تھے لیکن عورتوں میں ان کی دلچسپی نہایت لطیف، شائستہ اور نرم گداز انداز کی تھی۔اور پاکستان اور ہندوستان اور دوسرے سبھی ملکوں میں عورتوں کے محبوب شاعر وہی تھے۔35؎

اس خارجی وجوہات میں ایک اہم خصوصیت جو بتائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ ہندوستان اور پاکستان

دونوں ملک کے بہترین نغمہ نگاروں نے ان کی بیشمار غزلیں اور نظمیں بڑے فنکارانہ انداز سے موسیقی کے ساتھ گایا۔جس کے باعث نہ صرف ان کی شہرت مین اضافہ ہوا بلکہ ان کی نظمیں اور غزلیں عوام میں حاصل ہوئی۔

جب کہ داخلی وجوہات میں خود ان کی شاعری کی غیر معمولی خصوصیات ہیں۔اس کے علاوہ بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ فیض کو نظم ہی پر نہیں غزل پر بھی یکساں قدرت تھی جب کہ ترقی پسند شاعروں نے نظم کو ہی اپنا ذریعہ اظہار بنایا تھا لیکن فیض کی غزلیں ان کے شعری سرمائے کا دلکش اور معتبر حصہ ہیں اور اپنی نغمگی ،لطافت، تشبیہات، معنی آفرینی، نظم وضبط اور اظہار کی بے ساختگی میں منفرد ہیں اور اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں رہتی کہ وہ نظم کے اچھے شاعر ہیں یا غزل کے۔ بلکہ انہیں دونوں اصناف پر پوری قدرت حاصل تھی اور یہی ان کی غیر معمولی مقبولیت اور عالمگیر شہرت کی وجہ ہیں۔

فیض کی ان خارجی اور داخلی خصویات کا جائزہ لینے کے بعد زاہدہ زیدی نے ان کی کچھ نظموں پر مختصر روشنی ڈالی ہے۔جس میں ان کے پہلے شعری مجموعے ''نقش فریادی'' سے کچھ نظموں کا انتخاب کیا ہے۔جن میں سرود شبانہ، یاس، ایک منظر اور تنہائی وغیرہ شامل ہیں۔سرود شبانہ اور یاس میں زاہدہ زیدی نے حسن وعشق کی کیفیات گہرے جذبے، علامتی معنویت اور پیکر تراشی کا ذکر کیا ہے۔نظم ''ایک منظر'' میں بھی علامتی منظر نگاری کے ساتھ بصری وسمعی اور لطیف خیالی ہے۔کچھ اشعار:

بام ودر خامشی کے بوجھ سے چور   آسمانوں سے جوئے درد رواں
چاند کا دکھ بھرا افسانۂ نور   شاہراہوں کی خاک میں غلطاں
مضمحل لے رباب ہستی کی   ہلکے ہلکے سروں میں نوحہ کناں 36

اگلی نظم ''میرے ندیم'' ہے اس میں یاس وغم کہ امید وبیم اور زندگی کی ولولہ انگیز کش مکش کو پیش کیا گیا ہے۔جو داخلی کیفیات کا اظہار کرتی ہے۔جب کہ نظم تنہائی، خود کلامی کے انداز میں ہے۔اسی طرح نظم ''یاس وامید'' کو آرزو خود فریبی اور خود شناسی کو علامتی اور پیکر تراشی کی مدد سے پیش کیا ہے۔اس نظم میں ڈرامائی انداز میں شاعر اپنے داخلی تجربات، جذبات اور کیفیات کا اظہار کرتا ہے۔

فیض کی دوسری نظمیں جن کا کینوس کافی وسیع اور متنوع ہے۔اور خاصی طویل اور وضاحتی انداز کی

ہیں۔ان میں زاہدہ زیدی نے ''رقیب سے،موضوع سخن،دوعشق اور مجھ سے پہلی محبت مرے محبوب نہ مانگ ہیں۔یہ سب عشقیہ انداز کی نظمیں ہیں۔جن میں جذبہ عشق کے ساتھ عاشق کو عصری مسائل بھی درکار ہیں۔یہ نظم ان کے ترقی پسند تصورات کو بھی پیش کرتی ہے۔

نظم ''رقیب سے اور مجھ سے پہلی محبت مرے محبوب نہ مانگ''میں اس جذبہ کو زیادہ گہرائی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔جو ان کے ترقی پسند خلوص کو بھی ظاہر کرتی ہے۔

تجھ سے کھیلی ہیں وہ محبوب ہوائیں جن میں
اس کے ملبوس کی افسردہ مہک باقی ہے
تجھ پہ برسا ہے اسی بام سے مہتاب کا نور
جس میں بیتی ہوئی راتوں کی کسک باقی ہے 37

اسی طرح کی ایک اور نظم ''چند روز اور میری جان اور دو عشق'' بھی اسی قبیل کی نظمیں ہیں۔

فیض کا دوسرا مجموعہ ''دست صبا'' ہے جس میں صبح آزادی،نثار تیری گلیوں کے،زنداں کی ایک شام اور زنداں کی ایک صبح'' شامل ہیں۔ان میں صبح آزادی۔زنداں کی ایک شام اور نثار تیری گلیوں کے سیاسی اور وطنی نظمیں ہیں۔ان نظموں کے کچھ اشعار:

یہ داغ داغ اجالا، یہ شب گزیدہ سحر — کہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں
کہیں تو ہوگا شب سست موج کا ساحل — کہیں تو جا کے رکے گا سفینۂ غم دل
کہاں سے آئی نگار صبا کدھر کو گئی — ابھی چراغ سر رہ کو کچھ خبر ہی نہیں 38

فیض کے ان مجموعوں نقش فریادی اور دست صبا کے مقابلے میں ''زنداں نامہ'' میں غزلوں کی تعداد زیادہ ہے لیکن اس میں بھی کچھ نظمیں شامل ہیں۔جیسے حبیب عبرت دست،درد آئے گا دبے پاؤں،ملاقات،اے روشنیوں کے شہر،ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے اور آج بازار میں پابہ جولاں چلو۔ان نظموں میں فیض نے داخلی،خارجی،سیاسی ،ذاتی اور کائناتی محرکات اور اہم تصورات کو بیان کیا ہے۔ان نظموں میں امیجری،پیکر تراشی،سادگی ، گہرائی ،جذبہ فکر وتوازن ،حسن اور اثر آفرینی موجود ہے۔ان نظموں کا کینوس بھی بہت وسیع ہے۔جن میں انقلابی نظریے سے بھی گہری وابستگی کا اظہار ہے۔کچھ اشعار زاہدہ زیدی نے پیش کئے ہیں۔

سبزہ سبزہ سوکھ رہی ہے پھیکی زرد دوپہر
دیواروں کو چاٹ رہا ہے تنہائی کا زہر
کون کہے کس سمت ہے تیری روشنیوں کی راہ
ہر جانب بے نور کھڑی ہے ہجر کہ شہر پناہ
تھک کر ہر سو بیٹھ رہی ہے شوق کی ماند سپاہ
خیر ہو تیری لیلاؤں کیان سب سے کہ دو
آج کی شب جب دیۓ جلائیں اونچی رکھیں لو 39؎

فیض کی آخری دور کی نظموں میں سجاد ظہیر کے نام اور شام شہر یاراں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ جو اپنی اثر آفرینی کے اعتبار سے بھی کافی اہم ہیں۔ سجاد ظہیر کے نام، ایک شخصی مرثیہ ہے۔ جس سے فیض اور سجاد ظہیر کے تعلقات پر روشنی پڑتی ہے۔ اس کے بعد زاہدہ زیدی نے فیض کی آخری دور کی کچھ عشقیہ نظموں کا بھی ذکر کیا ہے۔ ان نظموں میں رنگ ہے مرے دل کا ہے جس میں انہوں نے اپنے جذبۂ عشق کی ذاتی، داخلی اور لطیف جذبے کی عکاسی کی ہے۔ اس میں فیض احمد فیض نے پیکر تراشی سے بھی کام لیا ہے:

جب تم نہ آئے تھے تو ہر چیز وہی تھی جو ہے
آسماں حد نظر، راہگزر، راہگزر، شیشۂ مے شیشۂ مے
اور اب شیشۂ مے، راہگزر، رنگ فلک
رنگ ہے دل کا مرے خون جگر ہونے تک
آسماں، راہگزر، شیشۂ مے
کوئی بھیگا ہوا دامن، کوئی دکھتی ہوئی رگ
کوئی ہر لحظہ بدلتا ہوا آئینہ ہے 40؎

اس کے بعد نظم ''منظر'' کا بیان ہے۔ اس میں بھی فیض نے جذبۂ عشق کی لطیف کیفیات کو شعری پیکر تراشا ہے۔ اسی قبیل کی دوسری نظموں میں تیری سمندر آنکھیں، پاس رہو، سوچنے دو، ہارٹ اٹیک اور یہ کس دیار عدم میں، قابل توجہ ہیں۔ ان نظموں کے بارے میں زاہدہ زیدی لکھتی ہیں:

فیض احمد فیض کی شاعری کے آخری دور کی یہ نظمیں جنہیں عام طور سے نظر انداز کیا جاتا رہا ہے ان کی حقیقت پسندی اور خود شناسی کے سفر میں ایک نئے موڑ کا پتہ دیتی ہیں اور ان کی شاعری میں ایک نئے باب کا اضافہ کرتی ہیں یہاں جذبۂ وفکر کا توازن بھی مکمل ہے۔41

اس طرح اس پورے مضمون میں زاہدہ زیدی نے فیض کی مقبولیت، شہرت اور ان کی شاعری کی منفرد خصوصیات، ان کے جذبہ وفکر میں توازن وغیرہ کے ذریعہ ان کی شاعری کی عظمت کے راز کا نکشاف کیا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ نظم وغزل کے بادشاہ اور اپنے ہم عصروں میں اہمیت کے حامل ہیں۔

اس کے بعد کا مضمون ''سردار جعفری کی شاعری میں پیکر تراشی کی معنویت'' ہے۔ جس میں زاہدہ زیدی نے سردار جعفری کی شاعری خصوصیت کا اظہار کیا ہے۔ سردار جعفری ترقی پسند تحریک کے اہم نمائندے تھے اور انہیں ترقی پسندوں میں اہم مقام حاصل ہے اور دوسرے وہ جدید شعراء کی صف میں بھی نمایاں ہیں بلکہ انہیں زاہدہ زیدی نے موڈرن شعراء کی صف اول میں بتایا ہے جس کی وجہ سے ان کی شاعری میں وژن کی وسعت، شعری اسلوب کی بلند آہنگی، ڈرامائی طرز احساس اور پیکر تراشی کو ہے۔ جس کا دھارا زاہدہ زیدی نے انگریزی کی موڈرن شاعری کے امام ٹی۔ ایس، ایلیٹ اور ایزرا پاؤنڈ سے ملایا ہے۔

اس مضمون میں زاہدہ زیدی نے سردار جعفری کی شعری خصوصیات میں سے پیکر تراشی کی ندرت اور معنویت پر اپنی توجہ مبذول کی ہے۔ جس میں استعارہ سازی اور علامتی معنویت کو بھی دخل ہے۔ سردار جعفری ترقی پسند کے ان شعراء میں شامل تھے جو شاعری میں نعرہ بازی کے مخالف تھے جن میں فیض کا نام بھی شامل ہے۔ ان دونوں شعراء کے یہاں فکر کا عنصر نمایاں ہے۔ فیض کی طرح سردار جعفری کے یہاں بھی ولولہ انگیزی نہیں بلکہ ان کے یہاں فکر کی شدت زیادہ ہے۔ زاہدہ زیدی لکھتی ہیں:

جہاں فیض کے یہاں فکری عناصر فکر محسوس میں ڈھل کر ان کی شاعری کی زیریں تہوں میں موجزن ہیں وہاں سردار جعفری کی فکر کا زیادہ براہ راست اظہار تو ان کی تنقیدی اور دانش وارانہ تحریروں میں ہوا اور شاعری میں ان کی فکر شدت احساس سے توانائی حاصل کرتی ہے۔ اور روشن شعری پیکروں میں ڈھل کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ بلکہ کبھی کبھی تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ تصویروں ہی کی زبان میں سوچ رہے ہیں۔ سردار جعفری کی پیکر تراشی میں زمین سے لے کر

آسمان تک سبھی مظاہر یعنی نظام فلکی، چاند، سورج، ستارے، بادل، ہوا، سمندر، آبشار، دریا، شفق اور انسانی زندگی کے سبھی پہلو یعنی کھیت، کھلیان، کارخانے، مسجد، مندر، گردوارے، کسان، مزدور، مرد، عورتیں، بچے، چرند، پرند، چکی، چولہے، یہاں تک کہ سانپ بچھو اور کیڑے مکوڑے، تتلیاں سبھی اپنا جلوہ دکھاتے ہیں۔42ؕ

سردار جعفری کے یہاں سماجی زندگی کا گہرا تجربہ اور زندگی کے گوناگوں پہلوؤں کا اظہار ہے۔ان کے فکری نظام میں انسان کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے ان کی توجہ کا مرکز انسان ہی ہے۔اور انسانی زندگی کے مختلف گوشوں کو وا کرتے ہیں۔اس کے علاوہ ان کی شاعری کی اہم انفرادی خصوصیت شعری اسلوب ہے۔انہوں نے اس شعری اسلوب کے اظہار میں انوکھے اور نئے راستے تلاش کئے ہیں۔سردار جعفری کی شاعری کے شعری پیکر کے اظہار میں زاہدہ زیدی نے سب سے پہلے نظم ''فریب'' پیش کی ہے۔جس میں سردار جعفری کی شاعری کی کئی اہم فنی خصوصیت سامنے آئی ہیں اس میں پیکر تراشی سمعی و بصری امیجری کو ڈرامائی انداز سے بیان کیا ہے۔یہاں کچھ اشعار پیش کئے جاتے ہیں:

ناگہاں شور ہوا
لو شب تار غلامی کی سحر آ پہنچی
انگلیاں جاگ اٹھیں
بربط و طاؤس نے انگڑائی لی
اور مطرب کی ہتھیلی سے شعاعیں پھوٹیں
کھل سٹھے ساز میں نغموں کے مہکتے ہوئے پھول 43ؕ

اس نظم کی سحر کاری کے بارے میں زاہدہ زیدی نے ایک طویل تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

اس بند میں سردار جعفری کی پیکر تراشی اور دوسرے فنی وسیلوں کے کئی پہلو سامنے آتے ہیں۔شور ایک سمعی امیج ہے اور ناگہاں سے حیرت اور استعجاب کی کیفیت کا اظہار ہوتا ہے اور لو کا لفظ ایک ڈرامائی تاثر پیدا کرتا ہے۔اور ''شب تار غلامی'' کی ترکیب میں تینوں لفظ میں سردار جعفری کی شاعری میں تقریباً ہم معنی اور متبادل الفاظ ہیں اور ان تینوں کا یکجا ہونا اس منفی کیفیت کی شدت کو شدید تر کرتا ہے۔اور اس کے بعد سحر کا پیکر یکا یک حیرت اور انبساط کی کیفیت سے دوچار کرتا ہے۔اور ''آ پہنچی'' اس کیفیت کو ڈرامائی رنگ میں پیش کرتا ہے اور اس کے بعد انگلیاں بربط، طاؤس

اور مطرب کبھی ڈرامائی کرداروں کی طرح سامنے آتے ہیں۔ انگلیاں جاگ اٹھنا، بربط وطاؤس کا نگڑائی لینا اور مطرب کی ہتھیلی سے شعاعیں پھٹنا سبھی نادر اور متحرک بصری پیکر ہیں۔ اور اس کے بعد ''کھل اٹھے ساز میں نغموں کے مہکتے ہوئے پھول'' میں بصری، سمعی، شامی اور حرکی عناصر یکجا ہو گئے ہیں اور ہمارے سبھی حواس کو بیک وقت متاثر کرتے ہیں۔ اس طرح یہ ابتدائی بند synesthetic امیجری کی ایک تابناک مثال ہے جس میں ڈرامائی تخیل بھی بڑی لطافت سے کارفرما ہے۔ 44

دوسری کچھ نظموں میں ''اودھ کی خاک حسین'' اور ''ممبئ'' میں گاؤں دیہات اور شہر کی زندگی کا مظہر ہے۔ ان نظموں میں بھی زاہدہ زیدی نے بصری، حرکی اور سمعی پیکر کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جس میں شاعر کہتا ہے کہ:

لہار کے گھن کے نیچے لوہے شکل تبدیل ہو رہی ہے
کمہار کا چاک چل رہا ہے
صراحیاں رقص کر رہی ہیں
سفید آٹا سیاہ چکی سے راگ بن کر نکل رہا ہے
سنہرے چولہوں میں آگ کے پھول کھل رہے ہیں
دھویں سے کالے توے بھی چنگاریوں کے ہونٹوں سے ہنس رہے ہیں''

اور

راتیں آنکھوں میں جادو کا کاجل لگائے ہوئے
شامیں نیلی ہوا کی نمی میں نہائی ہوئی
صبحیں شبنم کے باریک ملبوس پہنے ہوئے
پتھروں کی چٹانیں
اپنی باہوں میں بحر عرب کو سمیٹے ہوئے (ممبئ) 45

ان میں زندگی کی مختلف کیفیات کو شعری پیکر کی مدد سے دلکش اور جاذب انداز سے بیان کیا ہے۔ پیکر تراشی اور ڈرامائی اسلوب کی کچھ اور نظموں میں زاہدہ زیدی نے ''پتھر کی دیوار، نئی دنیا کو سلام، ہاتھوں کا ترانہ، شام غم، دو چراغ، سرطور، میرا سفر، حسین تر وغیرہ جو سردار جعفری کے شعری مجموعے ''ایک خواب اور'' میں

شامل ہیں۔ یہ شعری مجموعہ ان کے فکری عناصر اور شعری اسلوب میں ڈوبا ہوا ہے۔ ڈرامائی طرز اظہار اور پیکر تراشی کی نظم ''نئی دنیا کو سلام'' اس مجموعے کی اہم نظم ہے۔ اس کو زاہدہ زیدی نے اپنے طالب علمی کے زمانے میں علی گڑھ کالج میں اسٹیج بھی کیا تھا۔ یہ نظم غلام ہندوستان کی صورت حال کی غماز ہے۔ اس نظم کے بارے میں وہ لکھتی ہیں:

> نئی دنیا کو سلام، جس میں سردار جعفری نے صرف ''سیاہی'' کے امیج کی تکرار سے غلام ہندوستان میں عمومی صورت حال کی ایک المناک پریشان کن اور معنی آفریں تصویر کھینچ دی ہے۔ جو سراسر غیر فطری اور انسانیت سوز ہے اور یہاں پروٹیسٹ کا جذبہ ان منفرد اور تخیل آفریں شعری پیکروں میں ڈھل گیا ہے۔ جو ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ اس نظم کو ایک طویل استعارے کی مدد سے بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ 46

اس مجموعے کی کچھ اور نظمیں ایک پھول، شعلہ لبی، چاند کو رخصت کر دو، آرزو کے صنم خانے، بہت قریب ہو تم، پیاس کی آگ، شعلۂ حسن اور نسیم رتی قبا پر، وغیرہ شامل ہیں۔ جن میں تخیل کی بیباکی، شعری اظہار کی لطافت و ندرت مل جاتی ہے۔

سردار جعفری کے مجموعے ''پیرہن شرر'' میں وطنی نظمیں زیادہ ہیں۔ یہ نظمیں ہندو پاک کی جنگ کے دوران لکھی گئی تھیں۔ جن میں غم و غصہ زیادہ ہے لیکن اس میں شدت جذبات اور غم و غصے میں بھی پیکر تراشی نمایاں ہے۔ جن میں ''دشمن کون ہے'' اور ''صبح فردا'' کو بہت مقبولیت حاصل ہے۔ دوسری کئی نظموں کا ذکر بھی زاہدہ زیدی نے کیا ہے۔ جیسے ہمارے نام، پیرہن شرر، دعا، امانت غم اور موسموں کا گیت ہیں۔ ان نظموں میں پیرہن شرر کو زاہدہ زیدی نے ڈرامائی انداز کی مختصر نظم کہا ہے۔ جس کا مرکزی شعری پیکر پیرہن شرر ہی ہے۔ جب کہ ''ہمارے نام'' ایک عشقیہ نظم ہے۔ جس میں عشق کے تجربے کو آفاقی وژن میں پیش کیا ہے۔ ان دونوں کے علاوہ ''موسموں کا گیت'' ہے جس پر کالی داس کا اثر ہے۔ یہاں بھی عشق کو تصویروں کی مدد سے پیش کیا گیا ہے۔

اس مختصر جائزے سے ہم سردار جعفری کی کچھ شعری خصوصیات کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ البتہ پیکر تراشی میں زاہدہ زیدی نے زیادہ زور دیا ہے جو اس مضمون کا عنوان بھی ہے۔ یہ پیکر تراشی زاہدہ زیدی نے سردار جعفری کے چار شعری مجموعوں ''نئی دنیا کو سلام، ایک خواب اور، پتھر کی دیوار اور پیرہن شرر'' کی بنیاد پر نمایاں کی

ہیں۔ جب کہ یہاں ان کی غزلوں کا کوئی ذکر نہیں بلکہ خاص توجہ نظموں پر رہی۔ اگر چہ سردار جعفری تقی پسند تحریک کے نمائندہ رکن تھے لیکن ان کی شاعری میں نعرہ بازی نہیں اور نہ شعریت کی کمی ہے۔ بلکہ ان کے یہاں شعری اسلوب، وژن کی وسعت اور فکر کی گہرائی کو خاص طور سے اہمیت دی گئی ہے۔ انہیں خصوصیات کی بنیاد پر زاہدہ زیدی نے انہیں بیسویں صدی کے ماڈرن اور اہم شعراء کی صف اول میں جگہ دی ہے۔

اگلا مضمون ''سردار جعفری کی شاعری کی فکری اور فنی جہات'' (منتخب نظموں کے حوالے سے) ہے اس مضمون میں زاہدہ زیدی نے سردار جعفری کی کچھ نظموں کے حوالے سے ان کی شاعری کی فکری وفنی خصوصیات کی وضاحت کی ہے۔ جوان کی شاعری کی مختلف خصوصیات کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ سب سے پہلے زاہدہ زیدی نے سردار جعفری کی ابتدائی شاعری کی طرف توجہ مبذول کی ہے۔ اس دور کی شاعری میں پتھر کی دیوار، اودھ کی خاک حسیں، ایشاء جاگ اٹھا، فریب، نینداور نئی دنیا کو سلام جو ایک منظوم ڈرامہ ہے، شامل ہیں۔ ان میں پتھر کی دیوار ایک انقلابی نظم ہے۔ جس میں پروٹسٹ کا جذبہ کارفرما ہے۔ جہاں شاعر پتھر کی امیج سے تکرار پیدا کی ہے۔ وہ اس نظم کے کچھ اشعار پیش کرتی ہیں:

پتھر کی دیواریں
باکوں کی تعمیریں
اژدہوں کے پیکر ہیں
جو نئے اسیروں کو
رات دن نگلتے ہیں
پتھروں کی دیواریں
بھوک کا بھیانک روپ
پتھروں کی دیواریں
جو کبھی نہیں روتیں
جو کبھی نہیں ہنستیں
جوان کے سخت چہرے پر

رنگ ہے نہ غازہ ہے 47؎

اس میں سردار جعفری نے غلام ہندوستان کی المنا کی اور صورت حال کو پیش کیا۔اگلی نظم ''اودھ کی خاک حسیں''میں شاعر نے اودھ کی زمین سے اپنی محبت اور تعلقات کو نمایاں کیا ہے۔اس نظم میں نوسٹلجیا کی کیفیت کا اظہار ہے۔

میں رات کے وقت اپنے خوابوں میں چونک پڑتا ہوں جیسے مجھ کو
اودھ کی مٹی بلا رہی ہے
حسین جھیلیں کنول کے پھولوں کی چادروں سے ڈھکی ہوئی ہیں
فضاؤں میں میگھ دوت پرواز کر رہے ہیں
نہ جانے کتنی محبتوں کے پیام لے کر
گھٹاؤں کی اپسرائیں۔اپنی
گھنیری زلفوں آخری بار مسکرا کر
خلیج بنگال اور بحرعرب کے موتی پرو رہی ہیں
ہرے پروں اور نیلے پھولوں کے مور خوش ہو کے ناچتے ہیں
قدیم گنگا پاک پانی زمیں کے دامن کو دھو رہا ہے
وہ کھیتیاں دھان سے بھری ہیں
جہاں ہوائیں ازل سے دن سے ستار اپنا بجا رہی ہیں 48؎

اس میں زندگی کے مختلف مناظر اس نظم میں پیش کئے گئے ہیں۔اور ساتھ ہی فطرت کے حسن کی بہترین عکاسی بھی کی گئی ہے۔

نظم ''ایشاء جاگ اٹھا''میں تاریخی ،تہذیبی ،سیاسی اور تمدنی تصورات کو پیش کیا گیا ہے۔اس نظم کا کینوس زیادہ وسیع اور متنوع ہے۔سردار جعفری نے اس نظم میں فطرت کے حسن کے ساتھ کسان مزدور، ملاح ،ننھے بچے وغیرہ کا بھی ذکر کیا ہے۔

یہ ایشاء کی زمیں،تمدن کی کوکھ،تہذیب کا وطن ہے
یہیں پہ سورج نے آنکھ کھولی ہے

یہیں پہ انسانیت کی پہلی سحر نے رخ سے نقاب الٹی
اسی بلندی سے دید نے زمزمے سنائے
یہیں سے گوتم نے آدمی کی سمانتا کا سبق پڑھایا 49

اس نظم میں شاعری کے بہت سے موضوعات کو ایک ساتھ سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ جو ایشیاء سے شاعر کی والہانہ محبت اور ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کی بھی غماز ہے۔ اس کے بعد زاہدہ زیدی نے سردار جعفری ایک اہم منظوم نظم ''نئی دنیا کو سلام'' پر گفتگو کی ہے۔ اس نظم کا تجزیہ زاہدہ زیدی نے اپنے ایک مضمون ''نئی دنیا کو سلام، کا ڈرامائی اسٹرکچر میں تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ اس لیے اس نظم پر تفصیلی گفتگو اگلے مضمون میں کی جائے گی۔

اس کے بعد سردار جعفری کی دوسرے دور کی شاعری کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ جس میں نظم ایک خواب اور، ہاتھوں کا ترانہ، قتل آفتاب، پیرہن شرر، سرطور، میرا سفر، حسین تر، ہمارے نام اور دو چراغ شامل ہیں۔ سب سے پہلے نظم سرطور پر گفتگو ہے۔ اسے سردار جعفری نے آسمان پرداز وں کے نام سے منسوب کیا ہے۔ اور خلائی سفر کو انسان کے عزم، حوصلے استقلال اور بلند حوصلوں کو شعری پیکر میں ڈھالا ہے۔ چند اشعار زاہدہ زیدی پیش کرتی ہیں:

ہاتھ کاٹے گئے جرأت شوق پر
خوں چکاں ہو کے وہ گلفشا ہو گئے
حیرتوں نے لگائی جو مہر سکوت
لب خموشی میں جادو بیاں ہو گئے
راستے میں جو کہسار آئے تو ہم
ایسے تڑپے کہ سیل رواں ہو گئے
ہیں ازل سے زمیں کے کرے پر اسیر
ہو کے محدود ہم بیکراں ہو گئے
شوق کی حد مگر چاند تک تو نہیں
ہے ابھی رفعت آسماں اور بھی
ہے ثریا کے پیچھے ثریا رواں

کہکشاں پرے کہکشاں اور بھی ہیں 50ؔ

نظم میرا سفر میں سردار جعفری نے بہت سے اہم تصورات جیسے موت، زندگی، تخلیقی توانائی اور وقت کے تصور کو شعری پیکر میں پیش کیا ہے۔ان نظموں کے علاوہ سردار جعفری نے انڈو پاک کی امن سلامتی اور دوستی پر بھی بہت سی نظمیں لکھیں ہیں۔ان نظموں میں دشمن کون ہے، صبح فردا اور گفتگو شامل ہیں۔ یہاں زاہدہ زیدی نے ''گفتگو'' کو اس سلسلے کی اہم نظم قرار دیا ہے۔

اس کے بعد زاہدہ زیدی نے سردار جعفری کی آخری دور کی شاعری کا ذکر کیا ہے۔جن میں نومبر میرا گہوارہ، آبلہ پا اور برہنہ فقیر زیادہ اہم ہیں۔نومبر میرا گہوارہ ایک خودنوشت نظم ہے۔لیکن یہ نظم نامکمل ہے۔انہوں نے اس نظم میں اپنے ذاتی تجربات کو آفاقی تناظر میں ڈھال دیا ہے۔

وہ چہرہ کیا تھا
سورج تھا، خدا تھا پیمبر تھا
وہ چہرہ جس سے بڑھ کر خوبصورت
کوئی چہرہ نہیں ہوسکتا
وہ پاکیزہ مقدس سینۂ زریں
وہ اس میں دودھ کی نہریں
وہ موج کوثر و تسنیم تھیں یا شہد و شبنم تھیں 51ؔ

شاعر نے ایک نوزائدہ بچے کی عالم فطرت سے ہم آہنگی، اس کے آس پاس کے فطری مناظر کی گردش اور ماں کی والہانہ محبت اور اس کا پاک شفاف چہرہ اس نظم کا اہم پہلو ہے۔نظم برہنہ اور فقیر کو زاہدہ زیدی نے وجود عدم کے تصور کو علامتی انداز میں دیکھا ہے۔ایک فقیر جو کہ برہنہ ہے اس کا لباس عارضی لباس اس کا وجود تھا۔اس کے بعد نظم آبلہ پا ہے۔جس میں زندگی کے سفر کو صحراء کے مثل قرار دیا۔اس سفر میں انسان کو طرح طرح کی مصیبتیں اور صعوبتیں بھی پیش آتی ہیں اور انسان کو وقت کا مہمان بھی بتایا گیا ہے۔

ان منتخب نظموں کے حوالے سے زاہدہ زیدی نے سردار جعفری کی شاعری کی فکری وفنی جہات کا مختصر جائزہ لیا اور ان کی شاعری کے وژن، فلسفیانہ تفکر، والہانہ جذبوں، اسلوب کی آہنگی، داخلی تفکر و تحیر اور انقلابی و

اشتراکی خصوصیات کی وضاحت کی ہے۔ وہ ان خصوصیات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ وہ ایک خلاق، مفکر اور اور جتل شاعر تھے۔ اور ان کی شاعری کا کینوس اور فکر کا دائرہ کافی وسیع تھا اور ان کی فکری جہات متنوع اور ارتقاء پذیر ہیں۔ پروٹسٹ کے جذبے اور انقلابی نظریے کے اظہار سے لے کر وسیع آفاقی وژن اور فلسفیانہ تفکر اور ماورائی احساس تک اس نے کئی مراحل طے کئے اور ہر منزل پر ان کی فکر والہانہ جذبوں سے سرشار رہی۔ شدت فکر واحساس وژن کی گہرائی اور اسلوب کی بلند آہنگی سردار جعفری کی شاعری کی کچھ نمایاں خصوصیات ہیں۔

مضمون ''نئی دنیا کو سلام کا ڈرامائی اسٹرکچر'' میں زاہدہ زیدی نے سردار جعفری کی منظوم نظم ''نئی دنیا کو سلام'' کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ اس سے پہلے دو مضمون بھی سردار جعفری کی شاعری کی خصوصیات اور ان کی شاعرانہ فکر کے متعلق تھے۔ جس میں کچھ منتخب نظموں کے ذریعہ ان کی شاعری کی فکری جہات اور فنی خصوصیات پر زاہدہ زیدی نے روشنی ڈالی تھی۔ اس مضمون میں انہوں نے ''نئی دنیا کو سلام'' پر مکمل ڈرامائی اسٹرکچر پیش کیا ہے۔ نئی دنیا کو سلام میں سردار جعفری نے جاوید اور مریم کی کہانی پیش کی ہے۔ جہاں جاوید اور مریم کا عشق اور رامانس ان کی شادی پر ختم ہوتا ہے۔ جاوید مریم کے علاوہ اس منظوم ڈرامے میں ایک فرنگی کا کردار بھی ہے۔ اور ایک نامہ برکا۔ اس نظم میں سردار جعفری نے علامتی طور پر زندگی، موت، وقت اور تاریخ کو بھی پیش کیا ہے۔ جو اس ڈرامے کے نیم ڈرامائی کردار کہے جا سکتے ہیں۔ نظم کے پہلے سین میں جاوید اور مریم کی شادی ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس سین میں سردار جعفری نے ان دونوں کے عشق کی داستان کو پیش کیا ہے یہاں زاہدہ زیدی نے ان اشعار کو قلم بند کیا ہے:

نہاں ابر میں چاند کب تک رہے گا — بھلا عشق سے حسن کب تک چھپے گا
یہ شاداب نکھیں یہ آنکھوں کے ڈورے — جھلک جائیں جیسے گلابی کٹورے
جو ہاتھوں کو رنگ حنا مل گیا ہے — ہتھیلی پہ گویا کمل کھل گیا ہے
تری مسکراہٹ میں کیا دلکشی ہے — یہ پھولوں پہ سوئی ہوئی چاندنی ہے
مگر روح کی پیاس کیونکر بجھے گی — سمندر سے کیا صرد شبنم ملے گی 52

اس بعد زاہدہ زیدی نے اس ڈرامے کی ایک اہم خصوصیت کے بارے میں لکھا ہے جو عورت کی

اہمیت کے متعلق ہے۔انہوں نے اس ڈرامے میں عورت کو خاص اہمیت دی ہے۔اس کے جذبات کو گہری معنویت کے ساتھ بیان کیا ہے۔جو ترقی پسندوں کا خاصہ تھا۔ان سے پہلے اختر شیرانی اور مجاز نے بھی عورت کو صرف جنسی روپ سے ہی نہیں بلکہ ایک طاقتور عورت کے روپ میں پیش کیا تھا۔یہاں بھی سردار جعفری نے مریم کو ایک محبوبی کے طور پر ہی نہیں اس کے انقلابی جذبوں اور اس کی بے بہا قربانی کی بھی عکاسی کی ہے۔پہلے منظر میں تو سردار جعفری نے ان دونوں کے عشق اور رومانس کے قصے کو پیش کیا ہے۔جس میں جاوید مریم کے حسن و جوانی کے نغمے گاتا ہوا نظر آتا ہے۔لیکن ان دونوں کو اپنی ذمہ داری کا بھی احساس ہے۔اب مریم حاملہ ہے۔اور اپنے تاثرات کا اظہار کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔یہ نظم کا دوسرا سین بھی ہے۔اس سین کے کچھ منتخب اشعار کا حوالہ زاہدہ زیدی نے پیش کیا ہے:

رگ و پے میں کوئی سمایا ہوا ہے
مری روح پر رنگ چھایا ہوا ہے
نگاہوں میں نشہ چھانے لگا ہے
ہر اک چیز پر پیار آنے لگا ہے
اک ارمان آغوش میں پل رہا ہے
لہو ناچتا ہے،رگیں ٹوٹی ہیں
مرے جسم میں کوئی کونپلیں پھوٹی ہیں 53

اب اشعار میں عورت کے ماں بننے کے احساس کو پیکر تراشی میں ڈھالا گیا ہے۔اور ماں کی محبت کو آفاقی تصورات کے ساتھ پیش کیا ہے۔

تیسرے منظر کا جائزہ لیتے ہوئے زاہدہ زیدی نے اس میں مریم کے اداس چہرے پر نظر ڈالی ہے۔جو اب حاملہ بھی ہے۔اور غم زدہ اور مغموم بھی نظر آتی ہے۔اور اپنے ہونے والے بچے کے لئے ایک ایسا لباس تیار کرتی ہے جس میں کئی ٹکڑوں کے رنگ ہیں۔جس سے زاہدہ زیدی نے اس کی مفلسی کی طرف اشارہ کیا ہے۔اسی درمیان جاوید مریم کے پاس آتا ہے دونوں عصری صورت حال کے متعلق گفتگو کرتے ہیں اور اس وقت کی پوری سیاسی صورت حال اور عوام کا استحصال اس منظر نامے سے ہمارے سامنے ابھر کر آجاتا ہے۔اس

منظر کے مرکزی موضوع کے متعلق زاہدہ زیدی نے تجزیہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

اس میں شک نہیں کہ ڈرامے کا یہ تیسرا منظر جو اس کے مرکزی موضوع پر مرکوز ہے۔اپنی بیبا کی، حقیقت نگاری، منفرد پیر تراشی اور شدت فکر و احساس کے باوصف لاجواب ہے۔اور اس کی اہمیت اس میں بھی ہے کہ ہم یہاں جاوید مریم کو صرف ان کے باہمی تعلق کی وجہ سے نہیں پہچانتے بلکہ انہیں ایک وسیع تر سیاسی، سماجی، معاشی تناظر اور تاریخی پس منظر میں دیکھتے ہیں۔اور وہ دونوں صرف اس منظرنامے کے خاموش تماشائی نہیں بلکہ خود بھی اسی کا حصہ ہیں۔54

چوتھے منظر کی شروعات تاریخ اور وقت سے ہوتی ہے۔جس میں سردار جعفری کے تاریخ کے ایک ہمہ گیر تصور کو زاہدہ زیدی نے بیان کیا ہے۔جہاں سردار جعفری نے وقت کے ترانے میں انقلابی صورت حال کو پیش کیا ہے۔اس سین میں جاوید اور مریم کو انقلابی سرگرمیوں میں حصہ لینے کی پاداش میں عدالت میں پیش کیا گیا ہے۔جہاں انگریزی حکومت کے جبر و استقلال اور عوامی استحصال کو بھی دکھایا گیا ہے۔فرنگی جج جاوید پر انقلابی سرگرمیوں کا الزام لگا کر اس کو موت کی سزا سناتا ہے۔اور جاوید اور مریم دونوں اس جرم کو بڑے فخریہ انداز میں قبول کر لیتے ہیں۔اور پھر مریم کی کیفیت کا اظہار کیا گیا ہے:

ہم کو اپنی غلامی گوارا نہیں ہے
ایک بھی ذرہ اس ملک میں اب تمہارا نہیں ہے
آج پیڑوں کے پیروں میں جنبش ہے، کہسار چلنے لگے ہیں
ریگزاروں کے سوکھے ہوئے زرد سینے سے سیلاب ابلنے لگے ہیں
دیکھو کتنی ہی فوجیں افق سے
آندھیوں کی طرح آ رہی ہیں
بجلیاں ظلم کے سر پہ منڈلا رہی ہیں
اپنا جسم، اپنی جاں، اپنا امن، اپنا اخلاق و قانون وتہذیب سب لے کر بھاگو
زندگی تم سے تنگ آ چکی ہے
ساری دنیا اب اکتا چکی ہے 55

اس کے بعد پانچویں منظر پر روشنی ڈالی گئی ہے۔جس میں مریم جیل میں جاوید سے ملاقات کرنے

آتی ہے۔اوراب عاشق ومعشوق کی جدائی کا وقت آپہنچا ہے۔جاویدمریم کوکسی طرح تسلی دیتا ہے۔اوراپنے آنے والے بچے کونئی دنیا کی علامت اورشاندارمستقبل کی بشارت ب کہتا ہے۔اورساتھ ہی آنے والے بچے کو نئے ہندوستان کی بھی علامت بتاتا ہے۔جوآزادہندوستان میں پیداہوگا۔

چھٹامنظرمریم کےنوحہ سےشروع ہوتا ہے۔جس میں وہ جاوید کی یادکودردناک طریقے سے سناتی ہے۔اوراپنی محبت کے دنوں کومختلف طریقے سے یادکرتی ہے۔اب وہ بیوہ ہونے والی ہے۔اوراس رنج والم کےساتھ وہ اپنے ماں بننے کےاحساس کوعیاں کرتی ہے۔جس کوزاہدہ زیدی نےتسلسل حیات کااستعارہ بھی کہا ہے۔اوروہ ان اشعارکاحوالہ پیش کرتی ہیں؛

گزری راتوں کے طوفان دل میں چھپائے
لمحے اڑتے ہیں ہاتھوں میں شمعیں جلائے
دن بنے ہفتے، ہفتے بنے ہیں مہینے
وقت کے چلتے رہتے ہیں یوں ہی سفینے
ایک نیا روپ بھر لیتی ہے زندگانی
بن کے ماں مسکراتی ہے الھڑ جوانی
خواب میں مجھ کو آواز دیتا ہے کوئی
کروٹیں میرے پہلو میں لیتا ہے کوئی 56

اس منظرمیں ایک نامبربھی ہے۔جومریم کے پاس جاویدکاپیغام لےکرآتا ہے۔جوجاویدنےاپنے ہونے والے بچے کے نام لکھے ہیں۔جس میں جاویداپنے بچے یعنی نئی نسل کو ہمت، جرأت، آرزومندی اور ذوق عمل کی ہدایت کرتا ہے۔وہ کہتا ہے؛

نہ کرنا کبھی چشم حیرت کو بند
نہ ٹوٹے کبھی جستجو کی کمند
بنانا چٹانوں کے سینے پہ راہ
مگر اپنے ماضی پہ رکھنا نگاہ

کبھی جذبۂ شوق گھٹنے نہ پائے
نظر آسمانوں سے ہٹنے نہ پائے
حیات کہن کا یہ دستور ہے
سیاہی کی آغوش میں نور ہے
نہ ہو زندگی سے کبھی دل فگار
عمل سے بنا لے اسے سازگار 57

ان اشعار میں جاوید اپنے بچے کو نئی دنیا، نئے ہندوستان کی علامت کہتا ہے اور اسے مستقبل کی بشارت بھی دیتا ہے۔اس طرح یہ ڈراما عشق ورومانس سے شروع ہوکر انقلابی سرگرمیوں، انگریزوں کی سفاکی تسلسل حیات اور نئی دنیا کی بشارت پر ختم ہوجاتا ہے۔شاعر نے اس ڈرامے کو اپنے وسیع وژن کی تجسیم کے انداز میں پیش کیا ہے۔جس میں جاوید اور مریم کا بچہ روشن مستقبل اور آزادی کے وسیع تر امکانات کا استعارہ ہے۔اس منظوم ڈرامے پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے زاہدہ زیدی اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہتی ہیں:

> میرے خیال کے مطابق اس ڈرامے کا ہمہ گیر وژن اور طرز اظہار علامتی ہونے کے ساتھ ساتھ وضاحتی بھی ہے۔اور اس میں معنویت کی کئی سطحیں ہیں جو اس کی ساخت میں پیوست ہیں اور شعری اسلوب میں منکشف ہیں۔اس ڈرامے کے سبھی کردار جاوید، مریم، فرنگی، نامبر اور موت، زندگی، وقت اور تاریخ علامتی کردار ہیں۔اور جاوید اور مریم کا بچہ زندگی کی تڑپ، ذوق نمو، تخلیقی توانائی، تسلسل حیات اور ارتقاء کے تصورات کا استعارہ ہے۔اور خود سردار جعفری کے الفاظ میں اس کی معصوم روح پوری نظم (ڈرامے) پر حاوی ہے۔اور معنویت کی ان تینوں سطحوں کی روشنی میں جو ایک دوسرے میں تحلیل ہوگئی ہیں۔ہم کہہ سکتے ہیں کہ سردار جعفری ڈرامے کے سبھی تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے اپنے ہمہ گیر وژن کو فن کے قالب میں ڈھالنے میں کامیاب رہے ہیں۔58

زاہدہ زیدی نے اس پورے ڈرامے پر مکمل تجزیہ پیش کرکے اس کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالی ہے۔زاہدہ زیدی نے خود بھی اس ڈرامے کو علی گڑھ میں اپنے زمانۂ طالب علمی میں اسٹیج کیا تھا۔جس میں انہوں نے خود مریم کا کردار بھی ادا کیا تھا۔اس ڈرامے پر تنقیدی روشنی ڈالنے اور اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے بعد آخر میں زاہدہ زیدی نے اس ڈرامے کو اردو میں جدید منظوم ڈرامے کا پیش رو بھی کہا ہے۔

اس کے بعد زاہدہ زیدی نے ''وحید اختر کے مراثی میں عصری اور آفاقی بصیرتوں کی بازیافت'' کے نام سے شامل کیا ہے۔ جس میں زاہدہ زیدی نے وحید اختر کی مرثیہ نگاری میں عصری تناظر کی حیثیت سے روشنی ڈالی ہے۔ واقعہ کربلا کو اگر چہ مختلف شاعروں نے بیان کیا ہے۔ جس کا نقطۂ عروج اردو شاعری میں انیس و دبیر کی شاعری کو کہا جاتا ہے۔ اور دونوں مرثیہ نگاروں نے اس صنف میں اپنے اپنے ہنر کر جوہر دکھائے۔ اس کے بعد اس صنف میں کسی طرح کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی ہے۔ خاص کر میر انیس کی مرثیہ نگاری کے حوالے سے یہ بات کہی جاتی ہے۔ اور زاہدہ زیدی نے بھی اپنی کتاب ''رموز فکر وفن'' میں ایک مضمون ''میر انیس کی شاعری میں ڈرامائی عناصر'' میں ان کی مرثیہ نگاری پر روشنی ڈالی ہے۔ اور مرثیہ نگاری کے میدان میں ان کے بے بہا اضافے کا ذکر کیا ہے۔

لیکن میر انیس کے بعد بھی بہت سے شاعروں نے اس عظیم واقعہ کربلا کو بیان کیا ہے۔ اور اگر چہ انہوں نے وہ شہرت اور مقبولیت حاصل نہیں کی جو میر انیس کے حصے میں آئی۔ اور وہ میر انیس کے بعد اس صنف کو بہت ترقی نہ دے سکے لیکن اس کے باوجود ان شاعروں کے مرثیے قابل توجہ ہیں۔ جن میں جوش اور وحید اختر کا نام بھی سر فہرست ہے۔

اس مضمون میں زاہدہ زیدی نے وحید اختر کی مرثیہ نگاری کی فکری وفنی جہات پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کی عصری معنویت کی بھی وضاحت کی ہے۔ زاہدہ زیدی نے اس میں ان کے پانچ مراثی کے حوالے سے ان کی شاعری کی خصوصیات کا جائزہ لیا ہے۔ جو وحید اختر کی تصنیف ''کربلا تا کربلا'' میں شامل ہیں۔ ان کی اس کتاب میں کل آٹھ مراثی ہیں۔ جن میں چادرِ تطہیر، قلعہ کشا، شہید عطش، علمبردار امن، سالار قافلۂ شوق، تیغ زبان زینب، شہادت نطق، کربلاے کربلا شامل ہیں۔

اس کتاب کا پہلا مرثیہ جس پر زاہدہ زیدی نے اظہار خیال کیا ہے وہ ''چادرِ تطہیر'' ہے۔ اس مرثیہ میں وحید اختر نے حضرت فاطمہ زہرہ کی چادر تطہیر کے حوالے سے ان کے اوصاف اور اخلاق حسنہ کا ذکر کیا ہے۔ جن کا کردار مثالی تھا۔ حضرت فاطمہ زہرہ کی ذات صفات میں مختلف اوصاف موجود تھے۔ وہ ایک مثالی بیٹی، بیوی اور ماں تھیں۔ اور انہوں نے اپنے کردار کی خوبیوں سے اپنی اولاد کو بھی مالا مال کیا اور ان کی پرورش میں اعلیٰ

ترین اقدار کو فروغ دیا اور ان سب کو جفا کشی کا سبق سکھایا۔ان کی چادر تطہیر کے متعلق شاعر نے جو اشعار قلم بند کئے ہیں ان میں سے کچھ زاہدہ زیدی نے پیش کئے ہیں:

نہ ہو تو اس ردا کو کہیں ہفت آسماں — پھیلے تو اس کے سائے میں سمٹیں زماں مکاں
سر ہو فاطمہ کے تو ہے عرش آستاں — گرد اس کی ہیں ثوابت و سیارو کہکشاں
دھو کر نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں
بوندوں سے اس کو کوثر و زمزم سبو کریں 59

حضرت فاطمہ کی چادر تطہیر کو شاعر نے علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔جو سارے عالم کے لیے ماورائی محبت ہے۔اسی نے خاندان رسول کی پاک دامن بیویوں کو نقاب دیا اور اسی نے روز عاشور ننگی پڑی لاشوں کو اپنے دامن میں سمیٹا۔اس چادر تطہیر کے علاوہ حضرت فاطمہ زہرہ کی چکی کا ذکر بھی شاعر نے اس مرثیہ میں کیا ہے۔اس کے علاوہ ان کی آخری وصیت کا بھی بیان کیا گیا ہے۔

اگلا مرثیہ جس پر زاہدہ زیدی نے روشنی ڈالی ہے حضرت علی کی شان میں لکھا گیا ہے۔جس کا عنوان ہے'' قلعہ کشا''۔اس مرثیہ میں حضرت علی کی اعلیٰ صفات کا بیان کیا گیا ہے۔جو تاریخی اعتبار سے بھی اہم ہیں اور آفاقی بھی ہیں۔زاہدہ زیدی نے اس مرثیہ کی وضاحت میں وحید اختر کے الفاظ نقل کئے ہیں؛

> قلعہ استعارہ ہے ظلم،طاقت، ہوس زر،اقتدار شاہی اور سرمایہ داری کا۔اور اس کے ساتھ ساتھ قلعہ نشین ہونے والوں کے اس خوف و ہراس کا بھی جو انہیں انقلاب آفریں قوتوں کے سامنے محسوس ہوتا ہے۔قلعہ ہر دور میں استحصال کی نمائندگی کرتا ہے اور قلعہ شکن انسانی انقلابی قوت کا جو انسانی تہذیب کے ارتقاء کے ہر دور میں رکاوٹ پر غالب آتی اور تہذیب وتمدن اخلاقی اقدار اور علم و ادب کی رہنمائی کرتی رہی ہے۔60

زاہدہ زیدی نے وحید اختر کے اس مرثیہ میں حضرت علی کی ذات میں شجاعت، بہادری،سخاوت،علم، تفکر اور بلند حوصلے کے ساتھ ان کی شہادت کو بھی بیان کیا ہے۔اس سلسلے میں وہ شاعر کے کچھ اشعار پیش کئے کرتی ہیں۔

بت شکن ،قلعہ کشا،نفس خود آگاہی علی — منتہائے شرفِ خاک،فلک جاہ علی

صاحب سلطنت فقر،شہنشاہ علی عین حق،مرضیٰ معبود،یداللہ علی
اس کی ذات سے کونین کو کیا کیا نہ ملا صبح پیانِ ازل کو دل دیوانہ ملا
عرش والوں کو کرامات کا فسانہ ملا خاک کے ذروں کو اعزاز امیرا نہ ملا
ذوالفقار احدی کو اسااللہ ملا دہر کو عقدہ کشا حق کو یداللہ ملا 61

اس طرح اس مرثیہ میں بھی پہلے مرثیے کی طرح جس میں حضرت زہرہ کی عظمت، اخلاق اور کردار پر روشنی ڈالی گئی تھی یہاں بھی حضرت علی صفات اعلیہ کو بیان کیا گیا ہے۔یعنی ان دونوں مرثیوں میں ہی ان بزرگوں کی مثالی زندگی عکس ہمیں دیکھنے کوملتا ہے۔

تیسرا مرثیہ جسے زاہدہ زیدی نے شامل کیا ہے وہ ''سالارقافلۂ شوق'' کے عنوان سے ہے۔جس کو وحید نے ''سفر'' کی معنویت کے طور پر بھی لیا ہے۔جس میں زاہدہ زیدی نے عصری اورابدی معنویت کو بھی گرفت میں لیا۔اگرکسی شخص کے اندر جرأت، ہمت اور جذبہ عشق ہےتو وہ اپنی دوریٔ منزل سے نہیں ڈرتا بلکہ اپنے عزم وحوصلے اوراستقلال کے ساتھ اپنا سفر جاری رکھتا ہے۔اوراپنی منزل مقصود کوپہنچ جاتا ہے۔جس طرح حضرت حسین اپنے جذبہ عشق سے سرشار سفرکربلا کی طرف گامزن تھے۔

گردوں ہے شربار،زمیں آگ کا دریا
پھیلا ہوا ہے دور،قریں آگ کا دریا

یہ قافلۂ جستجوئے اہل نظر ہے جو روز ازل سے یونہی سرگرم سفر ہے
چہرے پہ اٹی گردسر رہگزر ہے آنکھوں میں چمکتی ہوئی امید نظر ہے
صحرا ہو کہ دریا ہو کہ طوفان جفا ہو رک سکتا نہیں پائے طلب لاکھ بلا 62

اس میں حضرت حسین خدا کے عشق سے سرشار اپنی منزل مقصود کی طرف چلے جارہے ہیں۔اور خدا کی راہ میں خودکوشہید کردیتے ہیں۔اورحق وباطل کی اس جنگ میں حق کی فتح ہوتی ہے۔اس کو ہر دور میں آفاقی معنویت کے ساتھ پیش کیا جاسکتا ہے۔کیوں کہ حق وباطل کی یہ جنگ ہردور میں جاری وساری ہے۔اس مرثیہ کی آفاقی معنویت کے علاوہ اس میں زاہدہ زیدی نے وحیداختر کی دل کش منظرنگاری کا بھی ذکرکیا ہے۔جیسے عاشورکی رات کے منظر کے کچھ اشعارانہوں نے پیش کئے ہیں:

ان تاروں کے جھرمٹ میں ہے مہتاب امامت ہے چہرے کے انوار میں اشعاع محبت
لب تشنہ کی باتوں میں ہے دریائے سخاوت الفاظ ہیں الہام زباں روح صداقت
فرماتے ہیں اصحاب سے رخصت کی یہ شب ہے
جو چاہے چلا جائے اجازت کی یہ شب ہے 63

اگلا مرثیہ ''تیغ زباں'' ہے۔جس میں وحید اختر نے یہ بیان کیا ہے کہ حضرت امام حسین کی شہادت کے بعد سید سجاد اور حضرت زینب بنت علی نے ان کے کام کو کس طرح اپنی حوصلہ مندی سے آگے بڑھایا۔زاہدہ زیدی لکھتی ہیں:

اس مرثیے میں وحید اختر نے بہت سے تاریخی اور روایتی المناک واقعات کا احاطہ کیا ہے۔لیکن ہم اپنی توجہ اس کے مرکزی خیال پر مرکوز کریں گے۔جس کا لب لباب یہ ہے کہ کس طرح سید سجاد اور جناب زینب نے امام حسین کی شہادت کے بعد ان کے اخلاقی اور روحانی مشن کو زندہ رکھا اور کس طرح کوفے ،شام اور دربار میں اپنی حق گوئی ،جرأت اظہار اور معجزہ بیانی سے ان اقدار اعلی کی پاسبانی کی جن کی خاطر امام مظلوم نے جام شہادت نوش کیا تھا۔64

اس میں واقعہ کربلا کی ابدی اور آفاقی معنویت کو وحید اختر نے بیان کیا ہے اور جاہ پرستی ،اقتدار پرستی، ذہنی غلامی اور خوشامد کے دور میں اس مرثیے کی اہمیت دوچند ہو جاتی ہے۔اس کے علاوہ اس میں حضرت زینب کے عزم و حوصلے ،جرات مندی اور حق کی حمایت میں ان کی لاجواب تقریر کو بھی بیان کیا ہے۔اس میں سید سجاد کا رول بھی اہم ہے۔جنھوں نے قید و بند کی صعوبتیں بھی اپنے عزم و حوصلے اور صبر و اعجاز کے ساتھ برداشت کیں۔اور دونوں بزرگان ہستی نے اعلیٰ اقدار اور روحانی اخلاق کی پاسداری کرتے ہوئے ہمیشہ حق کا اعلان کیا۔

پانچواں مرثیہ زاہدہ زیدی نے ''کربلا اے کربلا'' کو شامل کیا ہے۔اس میں وحید اختر کے اس مرثیے میں کربلا کے اس عظیم واقعہ کی ابدی اور آفاقی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کربلا کے واقعہ کو عصری تناظر میں پیش کیا ہے۔اس واقعہ کے ذریعہ حضرت امام حسین کی اس عظیم قربانی کو بھی پیش کیا ہے۔جو انھوں نے کربلا کے میدان میں بخوشی دی۔ان اشعار سے ہمیں ان کی اس عظیم قربانی کا بھی اندازہ ہوتا ہے:

کربلا ہے قوت دور زماں روح حیات زیست کا عرفان ہے اور معرفت گاہ ممات

کربلا عقدہ کشائے عقدۂ دشوار ذات   کربلا کا ایک نقطہ صد ہزاراں کائنات

کربلا ہے امتحاں گاہ ضمیر آدمی

ہے سفر میں ارتقاء کے دست گیر آدمی [65]

اس مرثیے کی عصری معنویت اس لحاظ سے بھی ہے کہ آج بھی ہر طرف جھوٹ، خوشامد، ریا کاری، نمائش، خود پسندی اور ظلم وستم کے دور میں ہر طرف کربلا جیسا منظر ہے۔ کیوں کہ حق باطل کی یہ جنگ آج بھی جاری ہے۔ اس روشنی میں واقعہ کربلا کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ اور ہم ان مرثیوں کے ذریعہ سے وحید اختر کے مرثیوں میں واقعہ کربلا کی ابدی اور آفاقی معنویت کے ساتھ خاندان رسول کے بزرگوں کے اعلیٰ صفات، روحانی اقدار، ان کے صبر واستقلال اور عزم وحوصلہ کو دیکھ سکتے ہیں۔ زاہدہ زیدی نے تنقیدی بصیرت نگاری سے مطالعہ کرتے ہوئے وحید اختر کی مرثیہ نگاری کے فکر وفن، بصیرت کی گہرائی اور ان کے مرثیوں میں عصری معنویت پر اظہار خیال کرتے ہوئے ان کی شاعری کو آنے والی نسل کے لیے بھی مشعل راہ بتایا ہے۔

اس کے بعد اگلا مضمون ’’آزاد نظم تفاعل اور امکانات‘‘ کے نام سے۔ اس مضمون میں زاہدہ نے آزاد نظم کی ابتداء کے ساتھ اس کی اہمیت وافادیت اور مقبولیت پر روشنی ڈالی ہے۔ پہلے تو انہوں نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اگر چہ اردو شاعری میں غزل کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اسے اردو شاعری کی آبرو کہا جاتا ہے۔ اور غالب کی غزل کو اس کا نقطۂ عروج کہا جاتا ہے۔ لیکن غالب کے بعد بھی زاہدہ نے ایسے شعراء کا ذکر کیا ہے جنہوں نے غزل کو وسعت دی۔ اقبال کی غزل کو غالب کی غزل کی توسیع کہی جاسکتی ہے۔ لیکن غزل کے ساتھ نظم نے بھی اسی طرح ترقی کی۔ زاہدہ کے مطابق اگر غالب کی غزل، غزل کا نقطۂ عروج ہے تو اقبال کی نظم خاص کر ان کی پابند نظم کو اقبال نے جس کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے اس کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔ اقبال کی پابند نظموں میں زاہدہ زیدی نے ذوق وشوق، مسجد قرطبہ، ساقی نامہ، خضر راہ، والدہ مرحومہ کی یاد میں اور فلسفہ غم کا ذکر کیا ہے۔

اقبال کے بعد زاہدہ زیدی نے پابند نظم کہنے والے شعراء کی فہرست میں جوش، فراق، مجاز، سردار جعفری، فیض، اختر الایمان، وامق جونپوری، شہاب جعفری، شفیق فاطمہ شعریٰ، وحید اختر خلیل الرحمٰن اعظمی اور

منیب الرحمٰن کوشامل کیا ہے۔ان سب نے اقبال کے بعد پابند نظم میں اچھے نمونے پیش کیے ہیں۔

زاہدہ زیدی نے آزاد نظم کو بیسویں صدی کی نمائندہ اور معتبر شعری اظہار کا وسیلہ بتایا ہے۔ان کے خیال میں نظم کی دوسری فورم دوہے، ہائیکو اور کہہ مکرنیاں وغیرہ شعری اظہار کے لیے کسی طرح مناسب نہیں۔ رہی نثری نظم تو اگرچہ اس میں اچھے شاعر پیدا ہوئے لیکن وہ اردو شاعری میں اپنی جگہ نہیں بنا سکتی۔لہذا ان کے خیال میں آزاد نظم ہی شعری اظہار کے لیے سب سے بہتر فورم ہے۔

آزاد نظم کی ابتداء بیسویں صدی میں ہی ہو چکی تھی۔اس کے نمائندہ شعراء میں ن۔م۔راشد ،میراجی، مجید امجد، یوسف ظفر، قیوم نظر اور ضیا جالندھری کا نام اہم ہے۔ان کے علاوہ فیض احمد فیض، اختر الایمان اور منیب الرحمٰن نے بھی اس میں خامہ فرسائی کی۔ان شعراء میں ن۔م راشد کو آزاد نظم کے زمرے میں سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔جس میں ان کی نظم ''لاانسان'' آزاد نظم کی بہترین مثال ہے۔زاہدہ زیدی ن۔م راشد کی آزاد نظم پر قدرت کے متعلق لکھتی ہیں:

> لاانسان کی بہترین نظمیں ان کی غیر معمولی تخلیقی صلاحیتوں اور فنی ریاضت کا ثمر ہیں۔انہوں نے آزاد نظم کو جو وزن اور وقار بخشا اور اس میں جس طرح وسیع ،اہم اور معنی خیز تجربات اور موضوعات کا احاطہ کیا میرے خیال میں اس سے آگے ابھی تک کوئی نہیں جا سکا ہے۔راشد کی آزاد نظم میں دروں بینی اور جہاں بینی کی دھوپ چھاؤں اور تہ در تہ معنویت نہ صرف ان کی تخلیقی صلاحیتوں پر دال ہے۔بلکہ وہ اس فورم کی ثروت اور وسیع امکانات کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے۔66

ن۔م راشد کے بعد آزاد نظم کی فہرست میں میراجی کا نام قابل توجہ ہے۔جنہوں نے آزاد نظم کی فورم اور تکنیک میں اپنے داخلی، ذاتی اور حسن عشق کی مختلف کیفیات کا اظہار کیا ہے۔ان شعراء کے علاوہ زاہدہ زیدی نے آزاد نظم کو برتنے والے شعراء میں سردار جعفری کا نام بھی شامل کیا ہے۔انہوں نے بھی آزاد نظم کے فورم میں سماجی مسائل اور انقلابی فکر کا اظہار کیا ہے۔اور اپنی داخلی کیفیات کو بھی پیش کیا۔ان کی آزاد نظموں میں فریب، اودھ کی خاک حسیں، ایشیا جاگ اٹھا اور نئی دنیا کو سلام کے نام لیے جا سکتے ہیں۔جن میں آزاد نظم کا فنی ربط وضبط نمایاں ہے۔

ترقی پسند شاعروں میں سردار جعفری کے علاوہ آزاد نظم میں طبع آزمائی کرنے والوں میں مخدوم محی الدین کا نام بھی شامل ہے۔ جب کہ کیفی اعظمی اس میں زیادہ کامیاب نہ ہوسکے۔ زاہدہ زیدی نے فیض کے یہاں بھی آزاد نظم کے کچھ نمونوں کی نشاندہی کی ہے۔ ان کی آزاد نظموں میں دست تہ سنگ، رنگ ہے دل کا مرے، تم میرے پاس رہو، منظر، سوچنے دو اور ہارٹ اٹیک آزاد نظم کے فورم میں ہیں۔

جہاں تک اختر الایمان کی نظموں کی بات ہے تو انہوں نے اگرچہ پابند اور معراء نظم کی طرف خاص توجہ دی لیکن انہوں نے بھی نظمیں آزاد نظم کے فورم میں کہی ہیں۔ ان آزاد نظموں میں ان کی آپاہج گاڑی کا آدمی، حماد بادگر، بزدل، راہ فرار، باز آمد، مونتاژ اور کالے اور سفید پرندوں والا پرندہ شامل ہیں۔

ان شعراء کے علاوہ زاہدہ زیدی نے منیب الرحمٰن کی بھی کچھ آزاد نظموں کا ذکر کیا ہے۔ جن میں آندھی، سمندر، یہ وسعت بے کنار صحراء، شاعر، روحیں اور بہار وغیرہ شامل ہیں۔ آزاد نظم کو فروغ دینے والے دوسرے دور کے شعراء میں زاہدہ زیدی نے قاضی سلیم، مخمور سعیدی، کمار پاشی، شہریار، عمیق حنفی، خلیل الرحمان اعظمی، ساجدہ زیدی، بلراج کومل، شمس الرحمٰن فاروقی، ندا فاضلی، زبیر رضوی، شہاب جعفری، وارث کرمانی، وحید اختر، مظہر امام، بشر نواز، باقر مہدی، سلیمان اریب، شفیق فاطمی شعریٰ، رفعت سروش اور خود زاہدہ زیدی کے نام شامل کئے ہیں۔ اور مختصراً ان شعراء کی شاعری پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ اور پھر انہوں نے خود اپنی شاعری پر بھی اظہار خیال کیا ہے وہ لکھتی ہیں۔:

> بیسویں صدی کے نصف آخر کے تقریباً سبھی اہم اور معروف شعراء نے آزاد نظم کو بطور خاص اپنایا۔ اور اس کے مختلف امکانات کو بروئے کار لانے کی کوشش کی اور اس بات پر مزید روشنی ڈالنے کے لیے میں اپنی شاعری کا تذکرہ بھی ضروری سمجھتی ہوں کیوں کہ میرا تعلق بھی کم و بیش اسی جنریشن سے ہے۔ اور شاید اختر الایمان کے بعد میں نے ہی سب سے زیادہ آزاد نظم کے وسیع اور متنوع امکانات کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔67

انہوں نے اپنی آزاد نظموں کے زمرے میں اپنی ابتدائی نظمیں بادل، ساحل اور تجربہ کو بتایا ہے۔ اور پھر اس کے بعد ان کے شعری مجموعے ''زہر حیات'' کی کئی آزاد نظموں کا بھی ذکر کیا ہے۔ جن میں تنہائی، خزاں، موت، دیوان خاص، فاصلے اور زہر حیات وغیرہ شامل ہیں۔ ان نظموں میں انہوں نے ڈرامائی

عناصر، سماجی صورت حال، علامتی منظر اور امیجری کی مدد سے بہت سے موضوعات کو سمیٹنے کی کشش کی ہے۔ ان کے علاوہ سنگ جاں اور سمندر کا اتم بلاوا بھی اہم نظمیں ہیں۔

جب کہ شعری مجموعہ ''شعلہ جاں'' میں تلاش، وہ اک نحیف سی صدا اور شعلۂ جاں آزاد نظم کے فورم میں ہیں۔ جنہیں نیم ڈرامائی نظمیں بھی کہا جا سکتا ہے۔ ڈرامائی عناصر اور رزاد نظم کے فورم میں ان کی نظم بند کمرہ اور لاشوں کا سوداگر، ادھورا نگر، زلزلہ، اتم سنسکار اور زہر کی لہر خاص طور سے اہم ہیں۔ وہ اپنی نظموں کے حوالے سے لکھتی ہیں:

> آخر میں یہ کہنا چاہوں گی کہ داخلی تجربات اور بصیرتوں کے ساتھ ساتھ خارجی ماحول اور مسائل بھی مجھے گہرے طور پر متاثر کرتے ہیں۔ اور ان کے اظہار کے لیے بھی میں نے آزاد نظم کو ایک نہایت موثر پیرایۂ اظہار پایا ہے۔ اور میری متعدد نظمیں جن میں خارجی ماحول اور اہم ترین عصری مسائل کا عکس ہے۔ بھی آزاد نظم ہی کے طور پر وجود میں آئیں۔ اور ان میں زہر کی لہر، کبلا، فردوس گمشدہ، آگ، سیاہ سوراخ، محشر اور کئی دوسری نظمیں شامل ہیں۔ 68

اس مضمون کے آخر میں زاہدہ زیدی نے نئے شاعروں میں عتیق اللہ، صادق، عبدالاحد ساز، شاہد کلیم، صبا اکرام۔ شاہد احمد شعیب، رفیعہ شبنم عابدی، نور جہاں ثروت، شہناز نبی، جاوید اختر، صلاح الدین پرویز، ظہیر غازی پوری، اسعد بدایونی اور پیغام آفاقی کے نام شامل کیے ہیں۔ جو آزاد نظم کی طرف توجہ مبذول کر رہے ہیں۔

''عصری غزل کا منظر نامہ (حالیہ تخلیقات کی روشنی میں)'' اس مضمون میں زاہدہ زیدی نے موجودہ غزل پر روشنی ڈالی ہے۔ اور موجودہ غزل کی حالت، مقبولیت اور معنویت کا جائزہ لیا ہے۔ جس کے ذریعہ انہوں نے حالیہ دور میں غزل میں ہونے والی تبدیلیوں پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ اور ان کی خصوصیات کی نشاندہی بھی کی ہے۔ جو موجودہ دور کی غزل میں پائی جاتی ہیں۔ کیوں کہ موجودہ غزل میں نہ صرف غزل کے موضوعات میں تنوع ہوا ہے بلکہ اس میں کچھ فنی خصوصیات، نئی علامتیں، نئے استعارے اور شعری پیکروں کا استعمال بھی ہو رہا ہے۔

سب سے پہلے تو زاہدہ زیدی نے اس بات کی طرف توجہ مبذول کی ہے کہ غزل میں داخلی جذبات اور کیفیات کے برعکس خارجی حالات اور زندگی میں ہونے والی مختلف سائنسی و ٹکنالوجی کے ذریعہ ہونے والی

تبدیلیوں کا ذکر ہے۔جس کا اظہار شعراء نے شعری پیکروں کے ذریعہ کیا ہے۔ساتھ ہی اب ترقی پسند اور جدیدیت دونوں کا اثر کم ہوگیا ہے۔نہ ہی اب ترقی پسند کی طرح پروٹسٹ ہے اور نہ جدیدیت کا گنجلک اور الجھا ہوا انداز بیان۔وہ اس بات کے لیے لکھتی ہیں:

> حالیہ غزل نے خود کو جدیدیت اور ترقی پسندی دونوں ہی کے اثرات سے کم وبیش آزاد کر لیا ہے۔اور وہ کلاسکی غزل کے سخت گیر مطالبات اور فارسی لفظیات کی بالا دستی سے بھی خود کو آزاد کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خلاق ذہن رکھنے والا شاعر اپنی بات کو کچھ اپنے انداز سے کہنے کا خواہش مند ہے۔اور اس خواہش کا اظہار ان اشعار میں بڑے مناسب اور والہانہ انداز سے ہوا ہے۔69

یعنی موجودہ غزل نے پرانی ڈگر پر چلنا بند کر دیا ہے اور اپنی راہ خود نکالی ہے۔لیکن حالیہ غزل موجودہ صورت حال پر بھی کڑی تنقید کرتی ہے۔اور اس میں ظلم، ریا کاری، خوشامد، سائنسی اور مصنوعی اقدار کے خلاف رجحان بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔

جہاں تک غزل کی لفظیات اور زبان کا تعلق ہے۔تو اس سلسلے میں زاہدہ زیدی کا کہنا ہے کہ موجودہ دور میں کچھ شعراء ایسے بھی ہیں۔جو غزل میں عام لفظیات اور گاؤں قصبات کی زبان کا استعمال کر رہے ہیں۔مگر اس کو کسی قدر فروغ نہیں۔البتہ اس دور کی غزل میں نئی علامتوں اور شعری پیکروں کا استعمال کافی ہے۔اور کچھ الفاظ کو بھی خاص معنی میں استعمال کیا جا رہا ہے۔جیسے آئینہ، خواب اور شکست خواب، شہر، جنگل صحراء، سمندر خزاں، دریا اور زمین وغیرہ۔

لیکن آج کے دور میں فرقہ وارانہ فساد کا سلسلہ جاری وساری ہے۔جس کی وجہ سے آج کی غزل کا یہ تکراری موضوع ہو چکا ہے۔جس پر بیشتر شعراء نے اظہار خیال کیا ہے اور اکثر غزلوں میں فسادات، جنگ اور دہشت گردی کے واقعات کا ذکر ہے۔جس سے آج ساری دنیا کے انسان خائف نظر آتے ہیں۔جس کو معاصر شعراء نے علامتی انداز سے اپنی غزلوں میں پیش کیا ہے۔زاہدہ زیدی نے اس سلسلہ میں چند اشعار پیش کئے ہیں:

ساری بستی ہماری جلادی گئی 　　　 بے گناہی کی کیسی سزا دی
(راشد صدیقی)

مرا مکان گھرا تھا لپکتے شعلوں میں 　　　 پگھلتی آگ کے نیچے لہو کا دریا تھا
(سیف سہسرامی)

جس طرف دیکھو کوئی بستی جلی ہے　　　دیش میں اب کے ہوا کیسی چلی ہے

(گرجاویاس)

ملبہ ،ملبہ کندہ ہے　　　چیخوں کی کہرام کی بات

(ظہیرغازی پوری)70

اس طرح کے اور بہت سے دردناک حالیہ غزل میں مل جاتے ہیں۔ جو موجودہ صورت حال سے پیدا ہونے والے خوف ودہشت اور بے یقینی پر مبنی ہیں۔اس خوف ودہشت،عام انسانوں کی بےبسی اور بےنوائی کو شعراء نے شدت احساس کے ساتھ پورے ماحول کی تصویر کشی کی ہے۔عصری غزل کے اس طرح کے اور کچھ اشعار کا حوالہ زاہدہ زیدی نے پیش کیا ہے۔جس سے موجودہ صورت حال ہماری آنکھوں کے سامنے نظر آتی ہے:

سرد لبوں پر چیخیں نیلی نیلی ہوکر بیٹھ گئی ہیں

برفیلی نظروں سے مجھے گھورے ہی جاتا ہے سنّاٹا

اپنی اپنی لاش اٹھائے لوگ گھروں کو لوٹ گئے سب

خون میں ڈوبی کچلی سڑکیں چاٹے ہی جاتا ہے سنّاٹا 71

زاہدہ زیدی نے ان اشعار کے حوالے سے موجودہ دور میں ہونے والے ظلم وستم،سفاکی،بے رحمی ،انسانیت کے قتل اور انسانی رشتوں اور اقدار کے زوال کی طرف اشارہ کیا ہے۔ان اشعار میں انسانیت کو دم توڑتے ہوئے،ذہنی الجھنوں،نفسیاتی پیچیدگیوں اور عام انسان کی بےبسی کو دکھایا ہے۔اور انسان کا یہ درد وغم ،رنج ومصیبت،ظلم اور قتل وغارت گری آفاقی صورت میں پیوست ہوجاتا ہے۔جہاں پوری دنیا کے انسان ایک ہی حالت میں نظر آتے ہیں۔ان موضوعات کی روشنی میں شعراء نے آج کی صورت حال کو کربلا کے میدان سے ملا دیا ہے۔اور بہت سے شعراء نے آج کے ظلم وستم اور حق وباطل کی جنگ کو واقعہ کربلا کے مشابہ قرار دیتے ہوئے ان دونوں کو علامتی انداز میں پیش کر کے واقعہ کربلا کی عصری معنویت بھی پیش کی ہے۔اس سلسلے میں زاہدہ زیدی نے کئی شعراء کے اشعار کا حوالہ پیش کیا ہے:

آ گیا جب بھی کبھی دریا کو پیاسوں کا خیال　　　احتراماً رک گیا ہے کربلا کے سامنے

(رئیس انصاری)

فرات آ گئی چلّو میں ایک پیاسے کے　　　مگر یہ دیکھو لب خشک تر کیا کہ نہیں

ابھی اٹھے بھی نہ تھے ہاتھ بددعا کے لیے　　سر بریدہ سے آنے لگی صدا کہ نہیں

(ملکہ نسیم)

ہم دہشت کربلا میں سدا تشنہ لب رہے　　بہتا تھا گرچہ پاس ہی دریا فرات کا

(مخمور سعیدی)72

اس کے علاوہ زاہدہ زیدی نے موجودہ دور میں ہجرت کے واقعہ پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ یہ بھی آج کے شعراء کے یہاں ایک تکراری موضوع کی حیثیت سے سامنے آیا ہے۔ کیوں کہ ہجرت بھی آج کے انسان کا ایک مسئلہ ہے۔ جس سے موجودہ انسان الجھن میں ہے۔ کیوں کہ اسے ہر طرف جنگ کا ماحول نظر آتا ہے۔ وہ خود کو غیر محفوظ سمجھتا ہے۔ اور ہر جگہ اسے بے یقینی اور غیر محفوظیت نظر آتی ہے۔ جس کو شعراء نے استعاراتی طور پر پیش کیا ہے:

اپنا ہی فیصلہ تھا کہ گھر چھوڑ کر چلے　　مڑ مڑ کے پھر کیوں یہ درودیوار دیکھنا

(مظہر امام)

ہجرتوں کا لطف لیتا ہوں نگر رکھتے ہوئے　　بستیوں میں ٹھوکریں کھاتا ہوں گھر رہتے ہوئے

(خورشید افسر بسوانی)

ہم کھینچے لے جاتے ہیں سرابوں کے بھنور　　جانے کس وقت میں ہم لوگ چلے تھے گھر سے

(زاہدہ زیدی)

گرتے ہوئے پتوں کی صدائیں مرے دل سے　　کہتی ہیں کہ تو نے کبھی ہجرت نہیں دیکھی

(اسعد بدایونی)73

اس طرح ہم ان اشعار سے خوف و دہشت، ظلم و ستم، مایوسی اور بے یقینی کو دیکھ سکتے ہیں۔ اور اسی مایوسی، بے یقینی اور رنج و غم اور ذات کے کرب و ہجرت کے تجربات کو شعراء نے اپنی غزلوں میں ڈھال دیا ہے۔ اور شعراء کا یہ ذاتی غم مجموعی رنج والم کی صورت حال میں ڈھل گیا ہے۔

اس بحث کے بعد زاہدہ زیدی نے عصری غزل میں کچھ ایسے موضوعات کی بھی نشاندہی کی ہے جو زمانہ قدیم سے ہی غزل کا محبوب ترین موضوع رہا ہے۔ اور وہ حسن و عشق کا بیان جو ہماری غزل کا شروع سے ہی

ایک خاص میدان رہا ہے۔لہذا موجودہ دور میں بھی حسن وعشق کی واردات اوراس کے تجربات کا بیان بھی ملتا ہے۔کیوں کہ یہ ایک آفاقی اور عالمگیر تجربہ بھی ہے۔لیکن عشق کے اس تجربہ کوعصری غزل میں مختلف انداز سے پیش کیا گیا ہے۔کبھی اس میں تشنگی اور نارسائی کا احساس ہے۔تو کبھی اس میں شاعر کواک خلانظر آتا ہے۔اور کبھی یہ عشق صرف ایک دھندلی سی یاد بن کر رہ گیا ہے:

مدتوں تک رہا ہے وہ مجھ میں　　　اب تو ایک خلا ہے مجھ میں

(اشعرعلیگ)

اک پر اسرا خموشی سی ہے ہر جا مجھ میں　　　میں خلا ہوں تو صدا بن کے بکھر جا مجھ میں

(عنوان چشتی)

مزا ملا مجھے اپنے ہی خوں میں تر ہوکر　　　ترے وجود کی رم جھم میں روح تشنہ تھی

(مظہرامام)

تپتے صحراء میں یہ خوشبو کہاں سے آئی　　　ذکر زمانے کا تھا تیری بات کہاں سے آئی

(مغنی تبسم)74

یہاں زاہدہ زیدی کی یہ بات قابل ذکر ہے کہ ان کے خیال میں مرد حضرات کے مقابلے میں خواتین شعراء نے عشق ومحبت کی کیفیات کوزیادہ گہرائی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ان شاعرات میں انہوں نے داراب بانو وفا،مسعودہ حیات،ممتازمرزا،اداجعفری اورساجدہ زیدی وغیرہ کا نام لیا ہےاوران کے کچھ اشعار بھی پیش کئے ہیں:

نہ تم ملے،نہ خود سے سامنا ہوا　　　سنا یہ تھا دل آئینہ صفات ہے

(اداجعفری)

خوشبو کو مری روح ترستی رہی مگر　　　دل مانتا نہیں کہ وہ کاغذ کا پھول ہے

(پنہاں)

لے گئیں لوٹ کر سازوسامان دل　　　ایک لمحے کی جاں سوز برنائیاں

وہ تیرے دیدہ و لب کی کیفیتیں　　　رنگ اور نور کا جیسے چشمہ رواں

(ساجدہ زیدی)75

موجودہ دور کے دواوراہم موضوعات موت اورتخلیق شعر کی طرف بھی زاہدہ زیدی نے اشارہ کیا

ہے۔موت کے موضوع میں چندنئی علامتوں کوبھی نئی غزل میں دخل رہاہے۔جس میں خواب اورشکست خواب اورآئینے کوشعری پیکر میں ڈھالا گیا ہے۔ساتھ ہی جنگل،صحراء،درخت،شہر،سمندر،دریا اور زمین وغیرہ کونئی علامتوں میں پیش کیاہے۔جوشاعر کی داخلی اورخارجی فکرکوبھی پش کرتی ہیں۔

اس کےعلاوہ نئی غزل میں شہرکوبھی کافی اہمیت حاصل ہے۔شہرآج کی زندگی کا استعارہ ہے۔شہرکو بھی شعراء نے دونظریوں سے پیش کیا ہے کسی کے یہاں شہرکی زندگی میں اجنبیت،تصادم،بے چہرگی،مشینی انداز میں کام کرنے اورسوچناوغیرہ۔انہیں شہر کے مقابلی میں گاؤں کی زندگی زیادہ پرکشش اورمہذب وشائستہ نظرآتی ہے۔جیسے:

کار، تانگے، تشنا، چہروں کی بھیڑ   شہر کے بازار میں خوف تصادم جابجا

(قاضی رضا)

موج در موج وہی ریگ رواں ہے اب بھی   شہر چہروں کے سمندر کا دھواں ہے اب بھی

(لطف الرحمان)

اژدہا شہر کا مجھ کو بھی نگل ہی لے گا   زندہ ریتوں کے سمندر میں کہاں جاؤں گا

(سید شکیل دسنوی)76

لیکن کچھ ایسے بھی شعراء ہیں جنہوں نے شہرکی اس زندگی کا استقبال بھی کیاہےاوراس کی بدلتی زندگی کوقبول کیاہے:

جنگل کی فضائیں بھی دل آویز ہیں لیکن   جنگل کے لیے شہرکو چھوڑا نہیں جاتا ہے

یہ کیسا شخص ہے جو جنگل کی بات کرتا ہے   کہ اس سے شہر کی شائستگی دیکھی نہیں جاتی

(عنوان چشتی)77

ان موضوعات کا ذکر نے کے بعدزاہدہ زیدی نے موجودہ غزل کے کچھ مخصوص شعری پیکروں کا بھی جائزہ لیا۔جن میں فطرت کے مظاہر کی عکاسی اہم ہے۔جنگل،دریا،پہاڑ،درخت اورسمندر وغیرہ۔جن میں جنگل کواکثرشعراءنے علامتی انداز سے بیان کیاہے کیوں کہ آج کے سائنسی ماحول میں جنگلات کوسب سے زیادہ خطرہ ہے۔جہاں سائنس کی نئی نئی ایجادات کے لیے جنگلوں کوکاٹا جارہاہے۔دوسراجنگل کوتہذیبی اقدار کے زوال

اور بے حسی کے مظہر کے طور پر بھی بیان کیا ہے۔جنگل کے علاوہ آج کی غزل کی ایک علامت خزاں کا ذکر بھی زاہدہ زیدی نے کیا ہے۔خزاں کے ساتھ سمندر، دریا اور پہاڑ بھی آج کے اشعار میں وسیع تر معنی میں نظر آتے ہیں:

شجر دل کا ہوا پتوں سے خالی　　خزاں کی رت کے سارے سلسلے ہیں
(رند ساغر گڑھی)

موسموں کے ہاتھ میں پتہ کوئی ہرا نہیں　　ہیں برہنہ پیڑ سارے اور قبا کوئی نہیں
(انیس انصاری)

خزاں کی شاخ بریدہ کو ہاتھ میں لے کر　　گلوں کی شعلہ بکف رہگزر کو یاد کریں
(زاہدہ زیدی)78

اور آخر میں زاہدہ زیدی نے عصری غزل کے دو اور اہم موضوع موت اور تخلیق شعر کی وضاحت کی ہے۔موت کو زمانہ قدیم سے ہی غزل میں اہمیت رہی ہے۔اور شعراء نے اس موضوع کو مختلف انداز سے بیان کیا ہے۔اسی طرح آج کے شعراء کے یہاں بھی یہ موضوع کثرت سے مل جاتا ہے۔جب کہ تخلیق شعر یعنی اپنی تخلیقات کے متعلق بھی بہت سے شعراء نے اظہار خیال کیا ہے۔اور اس کے لیے سیل، چشمہ آبشار اور دھارے وغیرہ الفاظ استعمال کئے ہیں۔اور شعراء نے اپنی تخلیق کو خون جگر کہا ہے۔جہاں ان کی تخلیقات خون جگر میں ڈوب کر الفاظ کی شکل میں نکلتی ہیں۔اس کے متعلق زاہدہ زیدی نے مختلف شعراء کے اشعار بھی پیش کئے ہیں:

ڈبو خون میں لفظوں کو انگارے بناتا ہوں　　پھر انگاروں کو پگھلا کر غزل پارے بناتا ہوں
(مظفر حنفی)

پانو لفظوں کی زمیں پر نہیں ٹکنے پاتے　　تندئی سیل معانی میں بہا جاتا ہوں
(مخمور سعیدی)

شعور فکر سے آگے ہے چشمہ تخلیق　　ہٹے گا سنگ تو بہنے لگے گا پانی بھی
(زاہدہ زیدی)

فکر سخن گم ہیں پہاڑوں کے سلسلے　　یہ آبشار ان سے اترتا ہوا کلام
(اسعد بدایونی)79

اس کسی قدر طویل گفتگو سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ زاہدہ زیدی نے عصری غزل کی ہر اس

خصوصیت کی نشاندہی کی ہے جو آج کی غزل میں رواں ہے۔اس سے ہم زاہدہ زیدی کی شعری صلاحیتوں کا بھی اندازہ لگا سکتے ہیں۔انہوں نے فرداً فرداً نئی غزل کے موضوعات اور شعری اسلوب کی طرف خصوصی توجہ دی ہے۔اور معاصر شعراء کے کلام کے حوالے سے ان خصوصیات کو نمایاں کیا جس سے عصری غزل کی تقریباً سبھی فکری وفنی خصوصیات اور شعری اسلوب کا ندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

مضمون ''انور عظیم، یادیں اور تاثرات'' کے نام سے زاہدہ زیدی نے انور عظیم کی کچھ یادوں کا ذکر کیا ہے۔انور عظیم رشتہ میں زاہدہ زیدی کے بہنوئی تھے۔ان کی وفات کے بعد زاہدہ زیدی نے اس مضمون کو قلم بند کیا۔جس میں انور عظیم کی شخصیت اور ان کے ادبی وتخلیقی کارناموں کا بھی ذکر کیا ہے۔وہ کمیونسٹ پارٹی کے ایک سرگرم اور فعال رکن تھے۔ان کی شادی زاہدہ زیدی کی چھوٹی بہن خدیجہ سے ہوئی تھی۔جنہیں انہوں نے پنجاب کے کسی شہر میں امن کانفرنس میں شرکت کے وقت دیکھا تھا۔انور عظیم ایک افسانہ نگار، کالم نگار اور ترجمہ نگار تھے۔انہیں آرٹ میوزک اور تھیٹر میں خاصی دلچسپی تھی۔وہ روسی سویت نیوز ایجنسی ''تاس'' سے وابستہ تھے۔اور بحیثیت مترجم انہوں نے کئی سال ماسکو میں بھی گزارے۔وہ روسی رائٹر کی حیثیت سے کافی مقبول تھے۔انہوں نے بہت سی روسی کتابوں کا بھی اردو میں ترجمہ کیا تھا۔انہوں نے روسی سماجی، معاشی اور تہذیبی زندگی کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔اور اسے اپنی کتاب deep are the routs میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔

اس کے علاوہ انگلش اور اردو کے بہت سے اخباروں میں کالم نگار بھی تھے۔اخبار ''قومی آواز'' (ایڈیٹر حیات اللہ انصاری) میں ان کا کالم ''باتیں'' کافی مشہور ہوا تھا۔اردو میں ان کے افسانوی مجموعے ''قصہ ایک رات کا، دھان کاٹنے کے بعد، مردہ گھڑے کی آنکھیں اور لا بوہیم'' ناول ''جھلستے جنگل'' اور ڈرامہ ''رات کے راہی'' اور ''گول کمرہ'' ہیں۔زاہدہ زیدی کے خیال میں ان کی اس بیش بہا خدمت اور پوری تندہی وصبر واستقلال کے ساتھ تخلیقی کاموں میں مصروف رہنے کے بعد بھی اردو کی کئی اکادمیاں انہیں نظر انداز کرتی رہیں۔آخر میں اردو اکادمی نے انہیں 1999 میں نثر کے لیے انعام سے نوازا۔اس کے علاوہ 2000 میں انہیں غالب انسٹیٹیوٹ نے ان کے اردو ڈراموں کے لیے اوارڈ دیا۔لیکن وہ ان انعام کو حاصل کرنے سے پہلے ہی اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔لوہ ہمیشہ خاموشی سے اپنے کاموں میں مصروف

رہے۔انہوں نے اپنی مالی پریشانیوں اور مشکلات کو خاموشی سے برداشت کیا۔اور اپنے کاموں کو بڑی خوبی سے انجام دیتے رہے۔ان کا نقطۂ نظر کافی واضح اور سیکولر تھا۔انہوں نے فرقاوارانہ فساداور تنگ نظر پالیسیوں کے خلاف بھی قلم اٹھایا۔ان کی خدمت کے متعلق زاہدہ زیدی لکھتی ہیں:

> انور عظیم کے تخلیقی کاموں کا یہ بہت ہی سرسری خاکہ ہے۔لیکن ان کے چند بکھرے ہوئے تاثرات کی روشنی میں بھی اس بات کا ندازہ لگانا مشکل نہیں کہ وہ ایک پر خلوص اور اچھے فنکار تھے۔اور ان کی ادبی اور تخلیقی تحریریں ایک مدت تک تنقیدی بے توجہی کا شکار رہیں۔امید ہے فکشن سے تعلق رکھنے والے نئے فنکار اور فکشن کے نقاد اب ان کے کام پر زیادہ توجہ دیں گے۔اور نئے فنکار اس سے خاطر خواہ استفادہ بھی کریں گے۔آخر میں بس یہ کہنا چاہوں گی کی انور عظیم کی اچانک موت سے فکشن اورڈرامے کی دنیا میں کافی عرصے تک ایک خلا کا احساس ہوتا رہے گا۔80ؔ

غرض کہ اس مختصر مضمون میں زاہدہ زیدی نے انور عظیم کی کچھ یادوں پر روشنی ڈالنے کے علاوہ ان کی شخصیت اور ان کے تخلیقی کاموں کا مختصراً جائزہ لیا ہے۔جس کے ذریعہ ہم انور عظیم سے متعارف ہونے کے علاوہ ان کی ادبی و تخلیقی خدمات سے بھی واقف ہوجاتے ہیں۔لیکن انور عظیم کی فکر کو سمجھنے کے لیے ہمیں ان کی تخلیقات کا ضرور مطالعہ کرنا ہوگا۔کیوں اس مضمون سے ہم ان کی شخصیت اور ان کی خدمات سے متعارف تو ضرور ہوتے ہیں۔لیکن کلی طور پر واقف نہیں ہوتے۔اس لیے ان کی تخلیقات کا مطالعہ ان کی ادبی فکر وبصیرت میں معاون ہوگا۔

اگلا مضمون بھی انور عظیم سے متعلق ہے۔جو ''جھلستے جنگل۔۔ایک مطالعہ'' کے نام سے ہے۔یہ انور عظیم کا مشہور ناول ہے۔زاہدہ زیدی نے اس مضمون میں اس ناول کا تجزیہ کرنے کے ساتھ ناول کے فن و اسلوب پر بھی گفتگو کی ہے۔موضوعات کے اعتبار سے تو یہ ناول گاؤں کی زندگی خاص طور سے جاگیردارانہ نظام کے کرپشن ،بدعنوانیوں اوران کی فرسودہ رسم و رواج کی کہانی ہے۔یہ ناول عبد الستار کی حویلی پر مشتمل ہے۔جہاں اس کے دو بیٹے رہتے ہیں۔عبدالستار اپنے بیٹے عبدالجبار کو اپنا وارث بناتا ہے۔جو شہر پڑھائی کرنے لے لیے گیا ہوا تھا۔لیکن لاکھ کوششوں کے بعد بھی انٹر پاس نہیں کرپاتا۔آخر کار گھر آ کر اپنے بیمار باپ کی خدمت میں لگ جاتا ہے۔لیکن بڑے مالک بننے کی حوث نے اسے اپنے باپ کا قتل کرنے پر آمادہ کر

دیا۔عبدالستار کی وفات کے بعد ان کی اہلیہ حج زیارت جا کر وہیں دم توڑ دیتی ہیں۔ جب کہ بہن سکینہ دو بھایوں کے ہوتے ہوئے بھی تنہائی، گھٹن اور کسمپرسی کا شکار ہو جاتی ہے۔ باپ کے قتل کے بعد عبدالجبار اس گناہ سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے کبھی مسجد کی تعمیر کرواتا ہے۔کبھی اسکول اور اسپتال بنواتا ہے۔لیکن اس کا یہ چہرہ دوگلا تھا۔ وہ نہ صرف غریبوں پر ظلم کرتا ہے بلکہ خود عیش وعشرت میں ڈوبا رہتا ہے۔اور انگریزوں کی خوشامد میں ہمہ وقت مصروف رہتا ہے۔

عبدالجبار کی دو بیٹیاں تھیں۔لیکن دونوں کے یہاں اولاد نہیں تھی۔ایک بیوی تو ماں بننے کے لیے اپنے خانسامہ کا سہارا لیتی ہے۔کہ کسی طرح ماں بن جائے۔جب کہ دوسری بیوی جادوٹونے کا سہارا لیتی ہے۔اسی درمیان عبدالجبار اپنے حویلی کے ایک نوکر کی بیٹی گلبیا کو اپنی حوس کا نشانہ بناتا ہے۔گلبیا حاملہ ہو جاتی ہے تو عبدالجبار اس کو قبول نہیں کرتا تو گلبیا خود زہر کھا لیتی ہے۔جاوید جو اس ناول کا ہیرو اور ڈاکٹر ہے اس کو بچانے کی پوری کوشش کرتا ہے لیکن وہ نہیں بچ پاتی۔

جاوید ایک غریب گھر سے تعلق رکھتا ہے۔اس نے محنت ومشقت کر کے اپنی تعلیم حاصل کی تھی۔اور اب وہ ڈاکٹر بن چکا تھا ساتھ ہی وہ گاؤں کے حالات اور عبدالجبار کے ہر فعل سے بھی واقف تھا۔لیکن وہ ایک تماشائی تھا۔اور اس کو سدھارنے کے لیے وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔وہ کچھ حد تک جبار کی مخالفت تو کرتا ہے لیکن وہ جانتا تھا ہے یہ جاگیرداری اور سرمایہ داری کا جعل صرف اسی گاؤں تک نہیں بلکہ ہندوستان کے ہر گاؤں میں موجود ہے۔اس بات کی وضاحت اس وقت ہوتی ہے جب جبار کی بہن سکینہ کو جاوید سے محبت ہو جاتی ہے تو وہ جاوید سے بھاگنے کے کہتی ہے کیوں کہ جبار کہیں اور اس کی شادی طے کر دیتا ہے۔لیکن جاوید انکار کر دیتا ہے۔ اسے پتہ تھا کہ وہ اس نظام کی کاری سے بھاگ نہیں سکتے۔ ہر طرف اس نظام کا سکہ بیٹھا ہوا ہے۔آخر کار سکینہ کی شادی ہو جاتی ہے۔اور اس کا عیاش شوہر اس کو اس وقت طلاق دے دیتا ہے جب وہ ماں بننے والی ہوتی ہے۔اور سکینہ دوبارہ اس حویلی میں جا کر رہنے لگتی ہے۔لیکن اب وہ ہسٹریا کا شکار ہو جاتی ہے۔اور ایک آسیب کی طرح اس حویلی میں بھٹکتی رہتی ہے۔

جاوید اگر چہ ایک انقلابی نوجوان ہے۔لیکن جذباتی طور پر وہ خاصا کمزور ہے۔وہ جاگیردارانہ نظام

سے ٹکر تو لیتا ہے۔لیکن ساتھ ہی وہ اس جا گیر دارانہ نظام کی چکی میں بھی پستا نظر آ تا ہے۔اور مایوس بھی رہتا ہے۔آخر عمر میں وہ تپ دق کے مرض میں بھی مبتلا ہو جا تا ہے۔وہ اس دنیا کو سنوارنے عزم تو رکھتا ہے لیکن اب وہ کافی مایوس بھی ہو چکا ہے۔اور اسی چکی میں پس کر ختم ہو جا تا ہے۔

جبار بھی اب اپنے مخالفوں اوران کی سازشوں کے جعل میں پھسنے لگا تھا۔لہذا اب وہ مذہبی دنیا میں پناہ لینے کی تلاش کرتا ہے۔ہر طرف اس پر طرح طرح کے الزام لگنے لگتے ہیں۔ان سازشوں سے تنگ آ کر وہ پیری فقیری کا سہارا لیتا ہے۔ساتھ ہی وہ ہمہ وقت ذہنی اور نفسیاتی الجھنوں میں بھی مبتلا رہنے لگتا ہے۔

اسلوب کے اعتبار سے یہ ناول جا گیردارانہ نظام،ان کی ظلم وزیادتی کو نہ صرف بیان کرتا ہے۔بلکہ ان کے کرداروں کی ذہنی ونفسیاتی پیچیدگیوں کو بھی بڑے فنکارانہ انداز میں ظاہر کرتا ہے۔ساتھ ہی ان کی زبان،گفتگو،چہرے کے تاثر اوران کے لباس وغیرہ کو بھی نمایاں کرتا ہے۔اس کے علاوہ گاؤں اور حویلی کا منظر بھی اہم ہے۔مثلاً جنگل،درخت،ندی،شام کا منظر،چاند کا ٹوٹ کر ندی میں گرنا،چاند کا چٹانوں پر پھیلنا وغیرہ الفاظ سے گاؤں کی تصویر کشی نظر آتی ہے۔اور حویلی کی وانچی اونچی دیواروں،حویلی ماماؤں،خانساماؤں اور نوکروں کی ریل پیل سے پوری حویلی کا منظر سامنے آ جا تا ہے۔

''لذت آشنائی'' کا آخری مضمون ''مرنے والوں کی جبیں روشن ہے اس ظلمات میں'' کے نام سے جگن ناتھ کے چار مرثیوں پر زاہدہ زیدی نے روشنی ڈالی ہے۔جس میں ''شکنتلا،ایک آرزو،ابوالکلام آزاد اور محسن کی راکھ(یا ماتم نہر)'' کو شامل کیا گیا ہے۔جن میں جگن ناتھ آزاد نے مرنے والوں کی شخصیت کے پہلوؤں کو روشن کیا ہے۔انہوں نے شکنتلا اپنی بیوی کی وفات پر لکھا تھا جس میں انہوں نے اپنے ذاتی غم،رنج و محبت اور خلوص وسوز وگداز کو بیان کیا ہے۔اس سلسلے میں زاہدہ نے کچھ اشعار پیش کرتی ہیں:

میں تو سمجھا تھا کہ مجھ پر رحم فرماؤ گے تم
اک فقیر بے نوا کو فیض پہنچاؤ گے تم

کیا خبر تھی کامرانی آرزو سے دور ہر
اور میری خوش نصیبی تم کو نامنظور تھی

میرے آنسو پتھروں پر رائیگا گرتے رہے
بن کے پیہم داستاں درد داستاں گرتے رہے

چاند تارو یہ سماں کتنا الم آثار تھا
میری قسمت سورہی تھی اور میں بیدار تھا [81]

ان اشعار کے ذریعہ زاہدہ زیدی نے ان کے ذاتی غم والم کو نمایاں ہے۔ان کی بیوی کی بے وقت موت نے ان پر خاصا اثر کیا تھا۔اور جذبے کے خلوص کو بیان کیا ہے۔

دوسری نظم ''ایک آرزو'' ہے۔ یہ جگن ناتھ آزاد نے اپنی بیوی کی وفات پر لکھی تھی۔لیکن اس نظم میں جگن ناتھ آزاد کے ذاتی رنج وغم کو زاہدہ زیدی نے ایک آفاقی اور ہمہ گیر وسعت سے لبریز بتایا ہے۔وہ کہتی ہیں:

اقبال کی طرح آزاد نے بھی فطرت کو انسانی جذبات کی ترسیل اور کسی قدر آفاقی بصیرت تک پہنچنے کا وسیلہ بنانے کی کشش کی ہے۔اور کہیں کہیں اس نظم میں شعوری یا غیر شعوری طور پر مشہور انگلش رومانٹک شاعر شیلی (shelley) کی شاہکار نظم ''Adonais'' کا عکس بھی جھلک آیا ہے۔

کیا ضیا بن کر کسی گلشن میں آوارہ ہے تو
یا بسیرا کر لیا پھولوں کے دل میں مثل بو
یا فلک پر ہے کسی تارے کی تابانی میں گم
یا مرے افکار روشن کی درخشانی میں گم
ہوگئی تو آبشاروں کے ترنم میں مکیں
یا ٹھکانا کر لیا آوازِ بلبل میں کہیں 2 8؎

ان اشعار کی روشنی میں ہمیں جگن ناتھ آزاد کی گہری بصیرت داخلی کیفیات کو شاعرانہ انداز میں دیکھ سکتے ہیں۔اگر چہ یہ نظم اقبال کی نظم ''ایک آرزو'' یا ''والدہ مرحومہ کی یاد میں'' سے متاثر نظر آتی ہے۔لیکن زاہدہ زیدی کے خیال میں ان میں اقبال کی طرح وسعت ،تخیل اور ہمہ گیر بصیرت نظر نہیں آتی۔جب کہ اقبال کی والدہ مرحومہ کی یاد میں،کو زاہدہ زیدی نے ایک ہمہ گیر وسعت، گہرے وژن،وسیع تصور اور فلسفہ غم کی نئی جہتوں سے ممیّز بتایا ہے۔

اس میں تیسرا مرثیہ ابولا کلام کی شخصیت سے متعلق ہے۔جوان کی وفات سے متاثر ہو کر لکھا گیا تھا۔ اس نظم کے متعلق زاہدہ زیدی کا خیال ہے کہ اس میں ہمیں ذاتی غم ،رنج اور وہ شدت نظر نہیں آتی جو اس سے پہلے کی دو نظموں میں دیکھا جا سکتا ہے۔پھر یہ نظم جگن ناتھ آزاد کی ابوالکلام سے گہری وابستگی کو ظاہر کرتی

ہے۔اوراس نظم کے حوالے سے ابولاکلام آزاد کی باکمال شخصیت کے تحسین آمیز پہلوؤں کو ہمارے سامنے عیاں کیا ہے:

تیرے دم سے تھا سیاست کو بھی حاصل اک وقار		تیری سطوت ملک و دولت کے لیے سنگین حصار
عصر نو میں اے دریا فقرودیں کے تاجدار		تیغِ دل کا صدق تھا تیری نظر سے آشکار
جلوہ آرانور قرآنی ترے سینے میں تھا		جوہر خورشید تیرے دل کے آئینہ میں تھا
گرچہ اے ولی ترے دل میں دفینے ہیں بہت		ترے ہر گوشے میں خزینے ہیں بہت
تیری مٹی میں نہاں بے تاب سینے ہیں بہت		تو وہ دریا ہے کہ گم تجھ میں سفینے ہیں بہت
آج لیکن تجھ میں اک فخر زمن خوابیدہ ہے		پیکر صدق وصفا وعلم فن خوابیدہ ہے 3 8

اس نظم سے ابولکلام آزاد کی ہمہ گیر شخصیت اور ان کی شخصیت کی خوبیوں کا بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔جگن ناتھ آزاد نے انہیں چراغ علم وفن،وطن کا امیر کارواں،علم کا عرش عظیم،طور معنی کا کلیم،روشن مبصر،روشن ضمیراور جذبہ اخلاص کا امیر جیسے القاب سے نوازا ہے۔اس میں شاعر کا خلوص،محبت اور ابولکلام آزاد سے ان کی وابستگی کا بھی اظہار ہوا ہے۔

اگلی نظم ’’محسن کی راکھ‘‘ کے نام سے ہے۔جس میں زاہدہ زیدی نے جگن ناتھ آزاد کی اس نظم کا ذکر کیا ہے جو انہوں نے نہرو جی کی وفات سے متاثر ہو کر لکھی تھی۔اس نظم پر زاہدہ زیدی اظہار خیال کرتے ہوئے زاہدہ زیدی لکھتی ہیں:

عصر جدید کے اس سیکولر ہیرو(جواہر لال نہرو)کے سلسلے میں جو اپنے اہم اور قابل قدر کارناموں کو کم وبیش پایہ تکمیل تک پہنچا کر عالم پیری میں ایک فطری موت سے دوچار ہوا غیر ضروری اور نامناسب معلوم ہوتی ہے۔البتہ اس بات کی طرف بھی اشارہ کرنا ضروری ہے کہ یہ خصوصیات یعنی جذباتی آہنگ،رقت آمیزی،مودبانہ عقیدت مندی اور مبالغہ آمیز مدح سرائی اس مرثیے کے پہلے حصہ میں زیادہ نمایاں ہیں۔لیکن رفتہ رفتہ جگن ناتھ آزاد خود کو اس جذباتی رویئے سے آزاد کر کے اپنے شعری اسلوب کو زیادہ دلکش اور پر اعتماد بنانے میں کامیاب رہے ہیں۔اور درد وغم کو بصیرت میں ڈھالنے کی کاوش بھی زیادہ بارآور معلوم ہوتی ہے۔مثلاً

جو عظمت عمل ہو وہ مرتا نہیں کبھی		وہ محفل جہاں سے گزرتا نہیں کبھی

انسان وہ کہ موت سے ڈرتا نہیں کبھی
اے دل کہ فنا کے گھاٹ اترتا نہیں کبھی
ہر دور لالہ زارہ میں ہے لالہ کا ردہ
ناپائیدار ہے یہ جہاں پائیدار وہ
حق کی طرف سے جس کو ملا ہو دل بصیر
جس کی نگاہ نور عمل سے ہو مثیر
ہر ایک سانس جس کی ہو میزان دار وگیر
وہ شخص اک رشی ہے وہ انساں ہے اک فقیر
وہ ایک مشت خاک نہیں برق طور ہے
وہ آدمی اجل کی رسائی سے دور ہے 84

اس نظم میں نہرو جیسے ہیرو کی موت پر نہ صرف اظہار افسوس ہے بلکہ اس کی بے وقت موت سے ہندوستان کی سیاست میں ایک خلا بھی پیدسا ہو گیا ہے۔نہرو جی شخصیت اوران کے قابل قدر کارناموں کو یاد کرتے ہوئے شاعر نے انہیں خراج عقیدت پیش کی ہے۔

اس مضمون میں جگن ناتھ کے چار مراثی کے ذریعہ زاہدہ زیدی نے ان کی شعری فکراور اسلوب پر راشنی ڈال کران کی فنی خصوصیات کو بھی نمایاں کیا ہے۔زاہدہ زیدی نے یہاں ان کے بارے میں یہ بات بھی واضح کی ہے کہ جگن ناتھ آزاد نے اپنی اکثر نظموں میں اقبال کی پیروی کی ہے۔جس سے بارے میں کیا جاتا ہے کہ اس پیروی سے ان کا فن مجروح ہو جاتا ہے۔کیوں کی ان کے یہاں اقبال کی سی فکر، وسیع تصوراور فکر کی نئ جہتیں مفقود ہیں۔لیکن زاہدہ زیدی اس خیال سے متفق نظر نہیں آتیں بلکہ ان کا خیال جگن ناتھ کا اقبال کی پیروی سے متعلق خیال ہے:

> اقبال سے اس گہری وابستگی نے آزاد کی انفرادیت کو مجروح کیا ہے اوراس خیال سے مجھے بلکل اتفاق نہیں کیون کہ اقبال نے توان کو وہ سب کچھ دیا جوان کی شاعری کا سب سے قابل قدر سرمایہ ہے۔یعنی زبان و بیان پر بڑی حدتک دسترس، روانی، ترنم آفرینی، الفاظ کا شکوہ اور لہجے کی سنجیدگی اوران خصوصیات نے آزاد کی انفرادیت کو مجروح نہیں کیا ۔بلکہ ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو جلا دی ہے۔اس لیے میرے خیال میں یہ کہنا درست ہوگا کہ علامہ اقبال سے آزاد کی یہ طویل وابستگی خود آزاد کی انفرادیت اورفنی اعتماد کی کمی کا ثبوت ہے۔یعنی جگن ناتھ آزاد نے تجربے کی کڑی دھوپ میں تخلیق کی سنگ لاخ زمین پر پابرہنہ چل کر اپنا راستہ تلاش کرنے کے بجائے ایک تناور اور پرشکوہ درخت کی ''پناہ گاہ'' مین فکرسخن کرنے کو ترجیح دی۔85

3۔جدید مغربی ڈرامے کے اہم رجحانات

جدید مغربی ڈرامے کے اہم رجحانات‘‘ زاہدہ زیدی کے عابد حسین میموریل لکچر میں دیے گئے ان کے لکچر کا مجموعہ ہے۔جس میں پہلے انہوں نے ڈاکٹر عابد حسین کی شخصیت ،ان کی علمی ادبی، دانش وارانہ کارناموں اوران کے تصنیفات پر روشنی ڈالی ہے۔اوراس کے بعد عابد حسین کے ڈراموں اور کی ڈراما نگاری کی خصوصیات کا ان کے تین ڈراموں پردۂ غفلت، فاؤسٹ اورحساب اور رومان پر گفتگو کی ہے۔عابد حسین کا ڈراما ’پردہ غفلت‘ ‘اردوڈرامے کی تاریخ میں ایک اہم اضافہ ہے۔جو برلن میں 1922 میں شائع ہوا تھا۔اس میں عابد حسین نے جاگیردارانہ نظام کے انحطاط کے ساتھ ہندوستان کے دوسرے مسائل جس میں عورتوں کی تعلیم اوران کی آزادی اہم تھا،کوپیش کیا ہے۔اس کے علاوہ عابد حسین کی مغربی ادب سے واقفیت اور دلچسپی کا ذکر کیا گیا ہے اس میں ان کا اہم کارنامہ ’’فاؤسٹ‘‘ کا ترجمہ ہے۔جس کے حصہ اول کا ترجمہ کیا اور مقدمہ لکھا تھا۔ڈرامے اور ترجمے کے علاوہ عابد حسین کے ڈرامہ پر لکھے گئے دو مضامین ’’ڈرامہ کیا چیز ہے‘‘اور’’برنارڈ شا‘‘ کا بھی زاہدہ زیدی نے ذکر کیا ہے۔

عابد حسین کی علمی وادبی شخصیت پر روشنی ڈالنے کے بعد جدید مغربی ڈرامے پر لکھی گئی ان کی کتاب’’جدید مغربی ڈرامے کے اہم ا‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌جحانات‘‘میں انہوں نے قدیم مغربی ڈرامے سے لے کر جدید مغربی تک اہم ڈراما نگاروں کے علاوہ مغربی ڈرامامیں نے والی مختلف تحریکات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔جس سے ہمیں نہ صرف مغربی ڈراما کا خاکہ سمجھ میں آجاتا ہے بلکہ مغرب ڈرامہ میں وقتاً فوقتاًہونے والی سرگرمیوں،اہم تحریکات اور رجحانات کا بھی بخوبی علم ہوتا ہے۔زاہدہ زیدی نے یونانی اور مغربی ڈرامے کے قدیم دور کی اہمیت کے ساتھ جدید مغربی دورکو بھی اہم بتایا ہے۔جہاں جدید ڈراما نگاروں اور تھیٹر کے فنکاروں نے اس میں مزید وسعتیں پیدا کیں۔انسان اور کائنات کی بے پناہ وسعتوں،انسان کی ازلی اور ابدی تلاش اور جستجو،زندگی کے پیچیدہ ترین مسائل اورانسانی نفسیات کے مختلف گوشوں کواپنے فن کا موضوع بنایا۔ان ڈراما نگاروں میں زاہدہ زیدی نے ابسن،سٹرنگ برگ،برنارڈشو،لوئی جی پراندیلو،یوجین آنیسکو،لورکا،ٹی ۔ایس ایلیٹ ،میرہولڈ،بارتول بریخت اورٹینسی ویمز وغیرہ کو جدید مغربی تھیٹر کے فورم،اسلوب،تکنیک اور تھیٹر کے ترسیلی

امکانات کو وسیع اور کامیاب بنانے اور جدید ڈرامہ کو آگے بڑھانے میں اہم رول کے طور پر پیش کیا ہے۔

سب سے پہلے تو زاہدہ زیدی نے جدید مغربی ڈراما نگاروں میں ابسن کی ڈراما نگاری پر روشنی ڈالی ہے، جو انیسویں صدی کے اواخر میں مقبول ہوا۔ ابسن نے چونکہ جدید مغربی ڈرامے کے آغاز و ارتقاء میں اہم رول ادا کیا تھا اس لیے اس کی اہمیت مسلم ہے۔ علاوہ ازیں اس نے ڈرامے کے فن کو وسعت و گیرائی بھی عطا کرنے میں اہم رول ادا کیا تھا۔ اس نے ڈرامے میں نہ صرف داخلی کشمکش کو اجاگر کیا بلکہ خود احتسابی کی منزل سے آگے وجودی تجربے کو بھی ڈرامائی انداز میں پیش کیا تھا۔ اس کے اہم ڈراموں میں زاہدہ زیدی نے BRAND, PERGYNT, EMPEROR اور GAILEAN کے علاوہ آخری دور کے ڈرامے THE MASTER BUILDER, LITTLE EYOLF اور WHEN WE DEAD AWAKEN کا تجزیہ کیا ہے۔ ابسن کے بعد سٹرنڈبرگ کے تخلیقی کارناموں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے ابتدائی ڈراموں میں MASTEROLOF میں نیچرلزم کو اپنانے کی معنی خیز تکنیک کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اس کے دوسرے ڈراموں میں ,SEXWAR, THE CREDITORSE

A DREAM PLAY, GHOSTSONATA اور ROAD TOO DEMASCUS وغیرہ اہم ڈرامے ہیں۔ جن میں اس نے خواب کی کیفیات کو پیش کیا ہے۔ اس کے بعد زاہدہ زیدی نے برنارڈ شو کے سماجی اور فلسفیانہ نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے اس کے شاہکار ڈرامے ,MAN & SUPERMAN, CANDIDA اور ''اسلحہ اور جنگ'' پر گفتگو کی ہے۔

ان ڈراما نگاروں کے علاوہ زاہدہ زیدی نے انتون چیخوف کی شخصیت اور اس کی ڈراما نگاری پر قدر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے چیخوف کے معنی خیز اور شاعرانہ اسلوب کی نشان دہی کی ہے۔ جس نے انسانی ذہن کی پراسرار واردات، جذبات واحساسات کی فطری انداز میں تصویر کشی کی ہے۔ یہاں زاہدہ زیدی نے انتون چیخوف کے ڈرامے ''چیری کا باغ، تین بہنیں، آبی پرندہ اور حبیب ماموں'' کی فکری وفنی خصوصیات کا جائزہ لیا ہے۔ ان ڈراموں کو زاہدہ زیدی نے اردو میں بھی منتقل کر دیا ہے۔ جن کا اس مقالے میں تجزیہ کیا جا چکا ہے۔

جدید مغربی ڈرامے کے ان اولین ڈراما نگاروں کے ڈراموں کا جائزہ پیش کرنے بعد زاہدہ زیدی

نے جدید مغربی ڈرامے کو آگے بڑھانے والے ڈراما نگاروں میں لوئی جی پرانڈیلو، ژاں۔ پال۔ سارتر، یوجین آئنیسکو، انوی، ژاں ژراود، کوکتو اور ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی ڈراما نگاری کا ذکر کیا ہے۔ جنھوں نے اپنے جدلیاتی تصورات، وجودی فکرو فلسفے، نفسیاتی وروحانی کشمکش، ذاتی شناخت، فلسفۂ حیات اور نفسیاتی بصیرتوں کے ذکر سے جدید ڈرامے میں اہم اور قابل قدر اضافے کئے۔ زاہدہ زیدی نے ان ڈراما نگاروں کے ڈراموں کو اردو میں ''مسدود راہیں'' کے نام ترجمہ بھی کیا ہے۔ جس میں یوجین ایونیسکو کے ''کرسیاں'' اور ''بادشاہ سلامت خدا حافظ''، مینول دی پیدرول کے ''کمرہ''، ژاں۔ پال۔ سارتر کے ''بند کمرہ'' اور سیمول بیکٹ کے ''شہ مات'' کو شامل کیا گیا ہے۔

4۔ دردتہ جام

دردتہ جام بھی زاہدہ زیدی کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب میں کل تیرہ مضامین شامل ہیں۔ جن میں زادہدہ زیدی نے ناقدانہ نقطۂ سے ان کی وضاحت کی۔ ان مضامین کی فہرست درج ذیل ہے۔

مرزا غالب کی شعریات

اقبال کی شاعری میں فطرت اور فن کی کارکردگی

حالی کے سیاسی اور سماجی افکار

مسدس حالی اور شکوہ و جواب شکوہ

مخدوم محی الدین کی شاعری میں رومانی حسیت اور انقلابی آئیڈلزم

معین احسن جذبی کی نظم نگاری

سردار جعفری کی عشقیہ شاعری

منیب الرحمٰن کی شاعری کی اہم جہات

میدان عمل، میں فیصلے اور انتخاب کی اہمیت

انقلاب، سیاسی پس منظر میں ایک پرسنل ناول

چاندنی بیگم، ایک المیہ جہت ناول

قرۃ العین حیدر کے فکشن میں عورتوں کے کردار۔ دو مختصر ناول کے حوالے سے

پیغام آفاقی کے ناول ''مکان'' کا تانیثی کردار

مرزا غالب کی شعریات۔

اس مضمون میں زاہدہ زیدی نے غالب کے چند اشعار کے حوالے سے ان کی شعری خصوصیات کو واضح کیا ہے۔اور غالب کے اشعار کی کثیر الجہت معنویت کو بھی بیان کیا ہے۔اور کچھ ایسے اشعار پیش کیے ہیں۔جن سے ایک سے زیادہ معنی نکلتے ہیں۔جس سے غالب کی شعری صلاحیت، ان کے تخلیقی موقف اور فلسفہ شعر پر بھی روشنی پڑتی ہے۔اور یہی زاہدہ زیدی کا اس مضمون میں نقطہ نظر بھی رہا ہے کہ غالب کی شعریت کس طرح دوسرے شاعروں سے مختلف ہے۔کچھ اشعار کے ذریعہ زاہدہ زیدی اپنی بات کو ثابت کرتی ہیں۔جیسے غالب کا ایک شعر ؎

ہے رنگ لالہ و گل ونسریں جدا جدا　　　ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہئے

اس شعر میں زاہدہ زیدی کے مطابق غالب کے لیے یہ دنیا، اس کی دلکشی اور رنگینی صرف موضوع سخن ہی نہیں بلکہ وہ اس بہار کے موسم، اس کی دلکشی، رنگینی کو نہ صرف دل سے قبول کرتے ہیں بلکہ اس کو اپنی تخلقی فکر میں بطور استعارہ جذب کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔

اسی طرح کا ایک اور شعر ؎

بخشے ہے جلوہ گل ذوق تماشا غالب　　　چشم کو چاہئے ہر رنگ میں وا ہونا

اس شعر میں بھی غالب دنیا کی رنگینی اور دلکشی کو پیش کرتے ہیں۔لیکن زاہدہ زیدی کے خیال میں ذوق تماشا کی ترکیب اہم ہے اور چشم کا ''وا'' ہونا تخلیقی بصیرت کا استعارہ ہے۔اور غالب کی انفرادیت بھی یہی ہے۔کہ وہ معمولی شعر میں بھی گہری معنویت پیدا کرتے ہیں۔

ان اشعار کے علاوہ اور بھی کئی اشعار کے حوالے سے زاہدہ زیدی نے غالب کی شعری صلاحیت اور ان کی تخلیقی انفرادیت کو پیش کیا ہے۔ان میں جن اشعار کا حوالہ انہوں نے دیا ہے۔

قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل　　　کھیل لڑکوں کا ہوا دیدہ بینا ہونا

محروم نہیں ہے تو ہی نوائے راز کا یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا
ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی

ان اشعار میں غالب نے اپنے جن ذاتی تجربوں کو کائناتی اور آفاقی تجربے میں ڈھالا ہے۔ زاہدہ زیدی نے ان خیالات کو انگلش شاعر ورڈز ورتھ کے شاعرانہ تخلیق اور تخیل کے تصور سے قریب بتایا ہے۔ علاوہ ازیں غالب نے اور بھی موضوعات میں بھی اپنی انفرادیت پیدا کی ہے۔ مثلاً:

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا بلبل سن کر مرے نالے غزل خواں ہوگئیں
جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شام فراق میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہوگئیں
مدعا محوتماشائے شکست دل ہے آئینہ خانے میں لیے جاتا ہے کوئی

یہ اور کئی اس طرح کے اشعار غالب کی تخلیقی وشعری صلاحیت اور ان کے مضامین کی ندرت وجدت کو بیان کرتے ہیں۔ کیوں کہ غالب نے خود بھی اپنے ان نادر اور اچھوتے مضامین کے لیے کہا تھا:

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

دوسرا مضمون ''اقبال کی شاعری میں فطرت اور فن کار کی کارکردگی (دوشاہکار نظموں کے حوالے)'' ہے۔ اور یہ دو نظمیں ہیں ''ساقی نامہ'' اور ''مسجد قرطبہ'' جن کے ذریعہ زاہدہ زیدی نے اقبال کی طفرت سے وابستگی، ان کی فنکارانہ صلاحیت اور ان کے فن کی معنویت پر روشنی ڈالی ہے۔

اقبال کو فطرت سے بے پناہ لگاؤ تھا۔ ان کی ابتدائی نظمیں اکثر فطرت کی عکاسی کرتی ہیں۔ جن میں زاہدہ زیدی نے ہمالہ، ایک آرزو، ابر کوہسار، موج دریا، جگنو، آفتاب، چانداور بانگ درا کے علاوہ فلسفہ غم، والدہ مرحومہ کی یاد میں، ذوق وشوق، طلاع اسلام، ساقی نامہ، خضر راہ، مسجد قرطبہ اور لالہ صحرا تک ان کی بیشتر نظمیں فطرت کے حسن اور ان کی فطرت سے لگاؤ کی بہترین مثال ہیں۔ جن میں اقبال نے نہ صرف فطرت کے حسن کی بہترین عکاسی کی ہے۔ نادر استعارے اور پیکر تراشی کے ذریعہ ان نظموں کو تخلیق کیا ہے۔

جن میں ساقی نامہ کو ان کے فن کی معراج کہا جاتا ہے۔ ساقی نامہ میں ہمیں ہر جگہ فطرت کا حسن اور مناظر فطرت کی جلوہ کشائی نظر آتی ہے۔ لیکن اس نظم کا مرکزی خیال انسان کی خودی ہے۔ اور اس کا وسیع تصور زندگی کا ایک فکر انگیز، والہانہ اور رجائی تصور ہے۔ یہ پوری نظم شعری پیکر، ولولہ انگیز جوش اور لطیف معنویت سے

بھرپور ہے۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ انسان کی خودی ان کا تکراری موضوع ہے۔ لیکن اس نظم میں اقبال نے اس کو کسی قدر ولولہ انگیزی کے ساتھ پیش کیا۔ مختلف شعری پیکر اور استعاروں سے اس کی دلکشی کو دوبالا کر دیا ہے۔ جس میں سمندر، ندی، کہستان، دریا، پہاڑ، کاروان بہار، سفر مسافر اور یلغار طلسم منزل کے ذریعہ اس کے حسن میں اثر انگیزی کی کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔

وہ جوئے کہستاں اچکتی ہوئی
اٹکتی، لچکتی سرکتی ہوئی
اچھلتی پھسلتی سنبھلتی ہوئی
بڑے پیچ کھا کر نکلتی ہوئی
رکے جب تو سل چیر دیتی ہے یہ
پہاڑوں کے دل چیر دیتی ہے یہ
ذرا دیکھ اے ساقی لالہ فام
سناتی ہے یہ زندگی کا پیام 86

اگلی نظم ''مسجد قرطبہ'' ہے جس کی روشنی میں زاہدہ زیدی نے اقبال کی فطرت نگاری کی جلوہ نمائی کا انکشاف کیا ہے۔ مسجد قرطبہ جو اقبال کی ایک فکر انگیز نظم ہے۔ اس نظم میں اقبال کا ملت اسلامیہ اور اس کے جاں نشینوں کے لیے فکر کا جذبہ اور ہمدردی نمایاں ہے۔ اس نظم میں اقبال نے ابتداء میں فطرت کی جوعکاسی کی ہے۔ وہ اپنی پوری رعنائی کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ پہلے اقبال نے دور زماں کی تیز رفتاری کا ذکر کیا ہے۔ کہ یہ زماں ایک ایسی چیز ہے جو اپنے ساتھ ہر چیز کو بہا کر لے جاتا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ زندگی کی بے ثباتی کو بھی پیش کرتا ہے۔ کہ ہر چیز کو فنا ہے اگرچہ کچھ کے نشانات باقی رہ جاتے ہیں۔

اس پوری نظم میں اقبال نے فطرت حسن، زمان کی تیز رفتاری، مرد مومن کے جذبہ عشق، اس کے جلال و جمال کا ذکر کرتے ہوئے حالیہ دور میں عالم اسلام کی تاریخ پر روشنی ڈالی ہے۔ مسجد قرطبہ جس کی تخلیق میں مرد مومن کے عشق کو دخل ہے۔ جو زمانے کی رو میں بہ جانے کے بجائے آج بھی اسی طرح اپنے ستونوں پر باقی ہے۔ لیکن یہ صدیوں سے آذان کی فضا سے خالی ہے۔ اس میں ایک سناٹا چھایا ہوا ہے جو آج مسیحی دنیا کی

اتھل پتھل اور زیر و بم کو بھی دکھاتی ہے۔

اس کتاب کا اگلا مضمون ''حالی کے سیاسی اور سماجی افکار کے کچھ پہلو(ڈاکٹر معین احن جذبی کی تحقیق کی روشنی میں)'' ہے۔جو معین احسن جذبی کا پی۔ایچ۔ڈی کا تحقیق مقالہ ''حالی کا سیاسی شعور'' کی روشنی میں ہے۔معین احسن جذبی نے حالی کی فکر،ان کے سیاسی و مذہبی شعور،ان کی شخصیت، ذہانت اور تعلیمی افکار کے کچھ پہلوؤں کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے۔اس مضمون کی روشنی میں زاہدہ زیدی نے حالی کی سماجی بالغ نظری کا خلاصہ کیا ہے اور ساتھ ہی انہوں نے وحید قریشی کی مرتب کردہ ''مقدمہ شعروشاعری'' کے مقدمے میں وحید قریشی نے جو حالی کی ذہانت وفکر کے متعلق اظہار خیال کیا ہے اس پر بھی زاہدہ زیدی نے اعتراض کیا ہے۔وحید قریشی کے الفاظ پیش کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

حالی بچپن ہی سے کمزور تھے،دوسروں کی انگلیاں پکڑ کر چلنا سیکھا۔عمر بھر دوسروں کے سہارے چلنے کی عادت کچھ ایسی پڑی کہ زندگی کے ساتھ ہی گئی۔حالی مقلد تھے،دوسروں کی آنکھوں سے دیکھتے تھے۔انکھیں کبھی غالب کی،کبھی شیفتہ کی،کبھی ہالرائڈ کی اور کبھی سرسید کی،وہ سوچتے تھے تو ان کے دماغ سے اور دیکھتے تھے تو ان کی عینک سے۔87

وحید قریشی کے ان خیالات کو زاہدہ زیدی نے لغو اور گمراہ کن قرار دیا ہے۔اور مشورہ پیش کیا ہے کہ قریشی صاحب کو ایک بار معین احسن جذبی کے اس مقالے کا مطالعہ ضروری کرنا چاہئے ۔زاہدہ زیدی کا خیال ہے کہ حالی نہ تو سرسید کے بازگشت تھے اور نہ ہی ان کے ہم خیال بلکہ حالی کی فکر میں سرسید سے زیادہ گہرائی اور ہم گیر بصیرت موجود تھی وہ جذبی کی تصنیف کا جائزہ لیتے ہوئے کہتی ہیں کہ جذبی پہلے تو حالی کے زمانے کے سیاسی ،سماجی اور معاشرتی و معاشی حالت پر روشنی ڈالی ہے۔اس زمانے کی سرسید تحریک اور پھر شاہ ولی اللہ کی وہابی تحریک کا بھی ذکر کیا ہے۔اور یہاں جذبی نے سرسید تحریک کا تفصیل سے جائزہ پیش کیا ہے۔

اس کے بعد جذبی صاحب نے اس حصہ کا ذکر کیا ہے۔حالی کے سیاسی اور سماجی شعور ان کی بصیرت ،فکر اور ان کے نقطۂ نظر کا بیان ہے۔جہاں انہوں نے صاف طور سے کہا ہے کہ سرسید کا ہمنوا ہونے کے باوجود بھی حالی کا سیاسی و سماجی شعور سرسید سے زیادہ گہرا حقیقت پسندانہ اور ہمہ گیر بھی تھا۔بلکہ ان کے خود کے تجربات کی دین تھا۔جو کہ مقدمہ شعروشاعری کی تخلیق سے ظاہر ہوتا ہے۔اور پھر جب محمد حسین آزاد نے نیچرل شاعری کی داغ

بیل ڈالی تو حالی نے وہاں بھی چار نظمیں پڑھیں۔ جسے حالی کے ابتدائی سیاسی شعور کی جھلک کہا جاتا ہے۔

آگے وہ لکھتی ہیں کہ جس دور میں مسلمان کم وبیش مغربی علوم سے نا آشنا تھے۔اس وقت حالی کا نظریہ نہ صرف سائنٹفک تھا۔ بلکہ وہ اپنے زمانے کی حقیقت کا پتہ لگانے میں تاریخی، معاشی اور طبعی حالات سے مدد حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔اور حالی نے سیاسی حالات کے بطور مطالعہ کرنے کے لیے ایشائی طرز حکومت کا مطالعہ کیا۔حالی کے متعلق وہ جذبی کا قول نقل کرتی ہیں:

> حالی ایک باشعور فنکار اور مفکر ہیں، اور انہوں نے جس طرح انگریزی حکومت کے محاسن اور معائب پر روشنی ڈالی ہے۔وہ ان کی سیاسی بصیرت پر دال ہے۔سرسید کے ہاں ہمیں اس غیر ملکی سامراجی نظام کا صرف روشن پہلو نظر آتا ہے۔لیکن حالی پر اس کی اصل حقیقت منکشف ہے۔88

غرض کہ معین احسن جذبی کے اس مضمون میں زاہدہ زیدی نے حالی کے ان نظریات کی طرف خاص طور سے اشارہ کیا ہے جو سرسید سے مختلف تھے بلکہ ان میں سرسید سے زیادہ گہری بصیرت موجود تھی۔حالی کا سیاسی وسماجی شعور ترقی پسندی کے ساتھ بصیرت افروز بھی تھا وہ مفکر اور مصلح کے ساتھ ساتھ وسیع تر وژن بھی رکھتے تھے۔

اس کے بعد کا مضمون ''مسدس حالی اور شکوہ اور جواب شکوہ'' ہے۔جس میں زاہدہ زیدی نے اقبال اور حالی کی ان نظموں کا موازنہ کیا ہے۔اور ان نظموں کی یکسانیت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔اس کے علاوہ کچھ اختلافات بھی نمایاں کئے ہیں۔ پہلے تو زاہدہ زیدی نے ان نظموں کا الگ الگ تجزیہ کیا ہے۔پھر ان کی خصوصیات کو واضح کرنے کے بعد ان کی مشترک اور مختلف خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے۔

''مسدس حالی'' حالی کی ایک اصلاحی نظم ہے۔جو انہوں نے سرسید کے کہنے پر لکھی تھی انہوں نے یہ نظم اگرچہ معاشرہ کی اصلاح اور فلاح وبہبود کے لیے لکھی لیکن یہ نظم تاریخی، سماجی، عصری اور مذہبی حالات پر بھی روشنی ڈالتی ہے۔وہ کہتی ہیں نہ اس نظم میں کوئی مبالغہ ہے، نہ کوئی جھوٹ اور نہ رنگینی ہے۔ بلکہ حالی نے اس نظم میں مسلمانوں کی اصلاح کے لیے پہلے تاریخ اسلام کے کچھ واقعات پیش کئے ہیں۔قرآن شریف کی کچھ آیات اور کچھ احادیث کو بھی شامل کیا گیا ہے۔اور جیسا کہ زاہدہ زیدی نے لکھا ہے کہ حالی نے ایک مختصر تمہید کے بعد

اپنے اصل مقصد کو بیان کیا ہے۔اور پھر ایک مریض کی حالت بیان کی ہے۔وہ مریض مسلمان ہے۔جو اپنے مرض سے لا پرواہ تو ہے ہی۔ بلکہ حکیموں اور طبیبوں کی ہدایات پر بھی غور نہیں کرتا آخر کار دن بدن اس کا مرض بڑھتا جاتا ہے۔اور پھر زندگی سے اسے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔

آگے حالی کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ایک جاہل قوم اسلام اور اپنے نبی کے ذریعہ ہدایت، علم و روشنی اور ساری دنیا پر حکومت کرنے کی ہنر سکھایا اور جب تک مسلمان دین اسلام اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات پر رہے۔مسلمانوں کی ترقی اور عروج اس وقت تک رہا۔لیکن جب وہ دین اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے دور ہوتے گئے ان پر زوال آتا گیا۔

برے ان پہ وقت آکے پڑنے لگے اب　　　وہ دنیا میں بس کر اجڑنے لگے اب
نہ ثروت رہی ان کی قائم نہ عزت　　　گئے چھوڑ ساتھ ان کا اقبال و دولت
ہری کھیتیاں جل گئیں لہلہا کر　　　گھٹا کھل گئی سارے عالم پہ چھا کر 89

پھر اس کے بعد حالی ہندوستانی مسلمانوں نے بارے میں ذکر کیا ہے جنہوں نے اپنے بزرگوں کے راستے کو چھوڑ کر سفلہ پن اختیار کیا۔اور اپنے دین و دنیا کو برباد کرتے رہے۔انہیں نہ تو آج کی فکر رہی نہ کل کی ۔محنت و مشقت کو بالائے طاق رکھ کر آشائش میں پڑے رہے۔جب کہ ہندو قوم اسی ملک میں اپنی محنت کے ذریعہ ترقی کی راہ پر آگے بڑھتے رہے۔اسی طرح مسلمان بھی اگر اب بھی چاہیں تو عیش وعشرت کو چھوڑ کر محنت کا طریقہ اختیار کریں اور محنت وعلم وحکمت کے ذریعہ دوبارہ اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کریں تو انہیں بھی کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔اس طرح رجائی اشعار پر یہ نظم اختتام پذیر ہو جاتی ہے۔

نہ دشمن کا خطرہ، نہ رہزن کا ڈر ہے　　　نکل جاؤ رستہ ابھی بے خطر ہے 90

اس کے بعد زاہدہ زیدی نے اقبال کی ''شکوہ اور جواب شکوہ'' کا جائزہ لیا ہے۔اس نظم پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتی ہیں کہ اقبال نے کہا کہ انہیں تاب سخن کی جرات عطا کی گئی ہے۔تو وہ ایک پھول کی طرح خاموش نہیں رہ سکتے۔کیوں کہ انہیں ملت کی فکر ہے۔اس لیے وہ خدا سے اپنے درد کو سناتے ہیں کہ اے خدا ہم ہمیشہ تیری حمد کرتے ہیں۔لیکن آج تھوڑا سا گلہ شکوہ بھی سن لے۔پھر وہ خدا سے کہتے ہیں۔اگر چہ اے خدا تو ہمیشہ سے

موجود رہا ہے۔لیکن توحید کا پیغام تو مسلمان نے ہی کیا اور پھر اسلام کی نمو سے پہلے دنیا کی حالت کا بیان کرتے ہیں۔جب ہر طرف مورتی پوجا اور درختوں کی پوجا ہوتی تھی۔لیکن جب اسلام کی آمد ہوئی تو مسلمانوں نے ہی خدا کا نام دنیا میں پھیلایا اور اسی کے نام پر جنگیں کیں ہر جگہ خدا کا نام لیوا پیدا کیا باطل کو مسلمانوں نے مٹا دیا اور حق کا بول بالا کیا۔لیکن آج تیرے نام کو لینے والے ہی تیری نعمتوں سے محروم ہیں۔اور کافروں کو دنیا میں ہر طرح کا سکون اور آسائش میسر ہیں اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ دنیا سے تیرا نام مٹتا جا رہا ہے۔

لیکن آگے انسان کے اس شکوہ کا خدا کی طرف سے جواب بھی پیش کرتے ہیں اور مسلمانوں کے اس زوال کا سبب ان کے عیش وعشرت اور آپس میں اختلاف و جھگڑے کو قرار دیا ہے۔کہ تم بہادری،شجاعت وجرات،عدل اور حیا سب کچھ کھو چکے ہو اور تم بے حیائی، بے پرواہی اور بے حجابی کو تہذیب کی معراج سمجھنے لگے ہو۔آخر میں کہتے ہیں کہ اے مسلمانو تم عمل کرو کیوں کہ عمل اور تدبیر ہی تقدیر شرط یہ ہے کہ محمد ﷺ کے ساتھ وفا کریں،ان کے ہر حکم اور فرمان کو یاد رکھیں تو خدا تعالیٰ ان کے ساتھ ہر صورت میں اس کی مدد مسلمانوں کے ساتھ ہی ہے۔

نخل اسلام نمونہ ہے برومندی کا پھل ہے یہ سینکڑوں صدیوں کی چمن بندی کا91

نظموں کے اس تفصیلی جائزے کے بعد زاہدہ زیدی نے مسدس حالی اور شکوہ جواب شکوہ میں موضوعات کے مشترک ہونے کی نشاندہی کی ہے۔دونوں نظموں میں خاص طور سے تاریخ اسلام،عرب کے مسلمانوں کی حالت،مسلمانوں کے عروج وزوال کا نقشہ بڑی حد تک مشترک بتایا ہے۔اس کے علاوہ دونوں نظموں کا اختتام بھی رجائی ہے۔اگر چہ ان کی نوعیت میں کچھ تبدیلی ہے۔

لیکن دونوں نظموں کے فارم اور اسٹرکچر مختلف ہیں۔زاہدہ زیدی کہتی ہیں کہ ''مسدس حالی'' ایک بیانیہ اور حقیقت پسندانہ نظم ہے۔جب کہ شکوہ اور جواب شکوہ ایک تخیل آفریں اور خاص طور سے ڈرامائی انداز کی نظم ہے۔اب اگر یہاں زاہدہ زیدی کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو وہ شکوہ جواب شکوہ کے مقابلے میں مسدس حالی کو گہری فکر،وسیع مطالعہ اور اثر پذیر نظم بتاتی ہیں۔وہ لکھتی ہیں:

اس میں شک نہیں کہ مسدس حالی کے مقابلے میں شکوہ اور جواب شکوہ کا پیغام زیادہ ولولہ انگیز ہے اور اس میں اقبال کا

فلسفۂ خودی اور فلسفۂ عشق کے دھندلے نقوش بھی ملتے ہیں۔لیکن اس نظم کے باقی حصے سے کوئی تعلق ظاہر نہیں ہوتا اور یہ نظم کو ایک مسلسل تخلیقی کارنامہ بنانے کے بجائے اسے ٹکڑوں میں بانٹ دیتا ہے۔اس میں وہ تسلسل ہے نہ گہری فکر اور وسیع علم اور نہ وہ نامیاتی وحدت جو ''مسدس حالی'' کا طرہ امتیاز ہے۔92؎

پانچواں مضمون ''مخدوم محی الدین کی شاعری میں رومانوی حسیت اور انقلابی آئیڈلزم'' ہے۔اس مضمون میں زاہدہ زیدی نے مخدوم محی الدین کی شاعری کی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے ترقی پسند شاعروں میں انہیں نمایا مقام عطا کیا ہے۔اس تحریک کے دوسرے شعراء جیسے فیض احمد فیض،علی سردار جعفری، جذبی ،مجاز، مجروح سلطان پوری،ساحرلدھیانوی، وامق جونپوری اور کیفی اعظمی کا نام سرفہرست ہے۔ان شاعروں کے ساتھ مخدوم محی الدین نے بھی اپنی شاعری کی شروعات کی ۔یہ الگ بات ہے کہ انہیں بہت زیادہ شہرت اور مقبولیت نہ مل سکی۔اس کی ایک وجہ تو زاہدہ زیدی نے یہ بتائی ہے کہ ان کا شعری سرمایہ بہت محدود ہے۔ان کے پہلے شعری مجموعہ ''سرخ سویرا'' کی نظمیں بھی فنی وفکری لحاظ سے زیادہ اعلیٰ معیار کی بھی نہیں۔پھر زاہدہ زیدی نے کہا ہے کہ وہ اگر چہ ترقی پسند تحریک کے بہترین شاعر نہ سہی لیکن اس کے اہم شاعر ضرور ہیں۔ان کی اہمیت اس تحریک کے نمائندہ شاعروں میں ہے۔وہ ایک انقلابی شاعر تھے۔اورانھوں نے بیشتر نظمیں انقلابی موضوعات پر لکھیں۔اور وہ ترقی پسند تحریک کے ایک انقلابی شاعر کے ساتھ اہم لیڈر بھی تھے۔

دوسری چیز جس کی طرف زاہدہ زیدی نے اشارہ کیا ہے اور جو مخدوم کی شاعری کو منفرد مقام عطا کرتی ہے وہ ان کی انقلابی فطرت میں رومانیت کا کوٹ کوٹ کر بھرا ہونا ہے۔ان کی نظمیں جیسے طور، ساگر کے کنارے، تلنگن ، مسجد، لمحہ رخصت اور یاد وغیرہ رومانی قسم کی نظمیں ہیں۔زاہدہ زیدی نے مخدوم کے ایک مشہور مصرعے کا بھی ذکر کیا ہے جو آج بھی کافی مقبول ہے۔

خدا بھی مسکرا دیتا تھا جب ہم پیار کرتے تھے۔93؎

اس طرح زاہدہ زیدی نے ان کی کچھ منتخب نظموں جیسے چپ نہ رہو، ستالین، اندھیرا، قید، سناٹا، بلور، جان غزل، وادیٔ فردا، چارہ گر، جنگ آزادی، بنگال، حویلی اور چاند تاروں کا بن، وغیرہ نظموں کے حوالے سے

ان کی شاعری کی کچھ فنی وفکری خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے۔اوران کی شعری فکر کا بھی جائزہ لیا ہے۔اس کے علاوہ ترقی پسند شعراء کے حوالے سے بھی ان کی انقلابی فکر کو بیان کیا ہے۔

اگلا مضمون ''معین احسن جذبی کی نظم نگاری'' کے عنوان سے ہے۔جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ معین احسن جذبی کو اردو میں ایک غزل گو کی حیثیت سے جانا جاتا ہے اوران کی غزل کو اردو کی بہترین غزلوں میں شمار کیا جاتا ہے کیوں کہ ترقی پسند شاعروں میں فیض کے بعد جذبی ہی ایسے شاعر ہیں۔جنھوں نے غزل میں روایتی اور انقلابی نعرہ بازی کے برعکس غزل میں الفاظ اور استعاروں کو نئی معنویت دے کر اس کے کینوس کو وسیع کیا۔ان کی غزلیں ایک روایتی اور جدید کا سنگ میل ہیں۔

لیکن اس کے برعکس زاہدہ زیدی نے اس مضمون میں ان کی نظم نگاری پر روشنی ڈالی ہے۔کیوں کہ عام طور پر ان کی غزلوں کو کافی مقبولیت ملی اوران کو کافی سراہا بھی گیا ہے لیکن ان کی نظم نگاری پر کسی نے خاطر خواہ توجہ نہیں دی جب کہ انھوں نے بہت سی بہترین نظمیں بھی کہیں ہیں۔یہاں زاہدہ زیدی نے ان کی نظم نگاری کو مختلف ادوار میں تقسیم کر کے ان کا جائزہ لیا ہے۔پہلے دور کی نظموں میں گل،طربہ،ہلال عید،راز ونیاز،حسن برہم،ایک دوست سے اورائے دوست وغیرہ۔

جب کہ دوسرے دور کی نظموں میں فطرت ایک مفلس کی نظر میں،چشم غزال،آزار،موت،نیا سورج، میری شاعری اور نقاد اور خواب ہستی کو شامل کیا ہے۔ان نظموں میں جذبی نے اپنے گردوپیش کی دنیا کی تصویر کشی کی ہے۔اور ماحول کی سفاکی،مزدور کی زندگی اوراس کی محرومیوں کا بیان بھی ان کے یہاں ملتا ہے۔زاہدہ زیدی نے یہاں جتنی نظموں کا بھی بیان کیا ہے اس کے حوالے سے انھوں نے یہ بات کہنے کی کوشش کی ہے کہ جذبی ایک اچھے غزل گو ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے نظم نگار بھی تھے۔اوران کے یہاں اچھی نظموں کی کمی نہیں۔ان کی نظموں کے کچھ اشعار؛

یہ تیرا جسم نازک بوسیدہ پیرہن میں جیسے گل افسردہ اجڑے ہوئے

یہ جوانی ،یہ پریشانی،یہ پیہم اضطراب
بارہا الجھن میں دوڑا ہوں سوئے جام شراب
بارہا گھبرا کے چھیڑا ہے گناہوں کا رباب 94

ساتواں مضمون ''علی سردار جعفری کی عشقیہ شاعری'' ہے۔اس سے پہلے بھی زاہدہ زیدی نے سردار جعفری کی شاعری اوران کے ایک منظوم ڈرامے ''نئی دنیا کوسلام'' پراپنی کتاب لذت آشنائی میں تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔اب یہاں زاہدہ زیدی نے ان کی عشقیہ شاعری کے کچھ اہم پہلوؤں کو پیش کیا ہے۔جیسا کہ انہوں نے اس سے پہلے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا کہ لوگوں کا خیال ہے کہ سردار جعفری کی شاعری انقلابی زیادہ ہے۔لیکن زاہدہ زیدی کے خیال میں وہ ایک بلند بانگ یا نعرہ باز شاعر نہیں بلکہ ان کی نظر میں وسعت ،فکر میں گہرائی تھی۔ان کی شاعری میں بیش تر جگہ پیکر تراشی اورڈرامائی عنصر کی نشان دہی ملتی ہے۔

ان خصوصیات کے علاوہ سردار جعفری کی شاعری کی ایک اہم خصوصیت حسن وعشق اوررومانی انداز بھی ہے۔جس کی طرف زاہدہ زیدی نے اس مضمون میں توجہ دی ہے۔زاہدہ زیدی کا خیال ہے کہ اگرچہ سردار جعفری نے ابتداء میں کچھ انقلابی شاعری بھی کی ہے۔اوران کے شعری مجموعے ''پتھر کی دیوار'' میں بیش تر انقلابی شاعری ہے۔مشکل سے دو چار عشقیہ انداز کی نظمیں یا غزلیں نظر آئیں گی لیکن بقول زاہدہ زیدی ان کی انقلابی نظموں میں بھی عشقیہ انداز برپا نظر آتا ہے۔

مگران کے دوسرے شعری مجموعے ''پیرہن شرر'' اور''ایک خواب اور'' میں حسن وعشق کے جلوے زیادہ رنگین اور پرلطف نظر آئیں گے۔اس قسم کی نظموں میں ایک پھول،شعلہ لبی، چاند کورخصت کردو، آرزو کے صنم خانے،تو مجھے اتنے پیار سے مت دیکھ،شعلہ حسن، بہت قریب ہوتم،نسیم تیری قبا،تمہارے ہاتھ،تم نہیں آئے تھے،حسین تراورہمارے نام وغیرہ شامل ہیں۔کچھ اشعار نظم ''نسیم تیری قبا'' سے

نسیم تیری قبا ،بوئے گل ہے پیرہن | صبا کا رنگ ردائے بہار اڑھاتا ہے
ترے بدن کا چمن ایسے جگمگاتا ہے | کہ جیسے سیل سحر،جسے نور کا دامن

ستارے ڈوبتے ہیں چاند جھلملاتا ہے 95

زاہدہ زیدی نے اس مضمون میں مختلف نظموں کے حوالے زاہدہ زیدی نے بڑے مختصر انداز میں سردار جعفری کی شاعری کے عشقیہ پہلوؤں اورنظموں پر روشنی ڈال کران کی شاعری کے ایک اور گوشے کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے۔جواب تک سردار جعفری کو صرف ترقی پسند شاعر کے حوالے سے اوران کی شاعری کو نعرہ

بازی یا انقلابی شاعری کے پس منظر میں دیکھتے تھے۔اور زاہدہ زیدی کی اس کوشش کے بعد سردار جعفری کے حسن وعشق، جذبہ عشق اور رومانی جذبے کا پہلو ہمارے سامنے عیاں ہوجاتا ہے۔

اس کے بعد کا مضمون ''منیب الرحمٰن کی شاعری کے اہم جہات'' کے نام سے ہے۔منیب الرحمٰن موجودہ عہد کے ایک اہم شاعر ہیں۔اس مضمون کے حوالے سے زاہدہ زیدی نے ان کی شاعری اہم جہات اور مختلف خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے۔منیب الرحمٰن کے مجموعوں میں باز دید،شہر گمنام،نقطۂ موہوم اور ہجر فراق ہیں۔ ان کی شاعری عصری زندگی اور گردوپیش کی عکاسی کرتی ہے۔انہوں نے سیاسی ،سماجی اور داخلی و خارجی مسائل پر بہت کچھ لکھا ہے۔ان کی زندگی میں ہونے والی تلخیاں اور سفا کی ان کی شاعری میں نظر آتی ہیں۔ان کی شاعری کی فنی خصوصیات کے بارے میں زاہدہ زیدی رقم طراز ہیں:

ان کی شاعری میں جو فنی نظم وضبط لطافت،اشاریت اور تہ در تہ معنویت ہے۔وہ نہ صرف ہمارے جذبہ فکر کو مرتعش کرتی ہے۔ بلکہ وہ ہم سے پوری توجہ کی بھی طالب ہے۔ان کی شاعری معروضیت اور داخلیت، سادگی اور لطافت، بے ساختگی اور فنی دروبست،ارضیت اور ماورائیت،حقیقت نگاری اور علامتی طرز اظہار کا ایک پر کشش سنگم ہے۔96

اس کے بعد زاہدہ زیدی نے ان کی کچھ نظموں کا ذکر کیا ہے۔ستارہ،سمندر،یہ وسعت بیکراں،خواب صحرا اور اس دیار میں ،کے حوالے سے ان کی شاعری کی فنی وفکری خصوصیات کی طرف اشارہ کیا ہے۔منیب الرحمٰن کی شاعری میں مناظر فطرت کی عکاسی،گردوپیش کے ماحول کی زندگی کی سفا کی،فطرت سے ان کی محبت،شعری اسلوب،ان کی شاعری کی فنی نظم وضبط اور ڈرامائی وپیکر تراشی اور علامتی معنویت جیسے پہلوؤں کو زاہدہ زیدی نے اس مضمون میں واضح کیا ہے۔

درد تہ جام کا اگلا مضمون ''میدان عمل، میں فیصلے اور انتخاب کی اہمیت'' ہے۔جس میں زاہدہ زیدی نے منشی پریم چند کے مقبول ناول ''میدان عمل'' پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے۔اس میں زاہدہ زیدی نے الگ الگ کرداروں کے عمل،ان کی مختلف سرگرمیوں اور ان کے ذریعہ کئے گئے مختلف فیصلوں کا تجزیاتی مطالعہ کیا ہے۔ان کرداروں میں امرکانت،اس کا باپ لالہ سمرکانت،امرکانت کی بیوی سکھدا،امرکانت کی بہن نینا،سکھدا کی ماں کالے خاں،ڈاکٹر شانتی کمار،سلیم اور سکینہ کا کردار اہم ہیں۔

امر کانت سرکاری اسکول کا طالب علم ہے۔وہ انقلابی خیالات کا حامل ہے۔اور گاندھی جی تقومی آزادی کی تحریک سے متاثر ہے۔وہ اپنے باپ سمر کانت کے بالکل خلاف ہے۔اس کا باپ ساہوکار ہے اور چاہتا ہے کہ امر کانت بھی اس کا کام سنبھالے ۔اسی لیے امر کانت اور سمر کانت میں ہمیشہ لڑائی رہتی ہے۔امر کانت کی بیوی سکھدا بھی ایک امیر ماں کی بیٹی ہے وہ بھی اپنے سسر کی ہم خیال ہے۔جب کہ اس کی بہن نینا کچھ حد تک امر کانت کا ساتھ دیتی ہے۔امر کانت کا دوست سلیم اور ڈاکٹر شانتی کمار اس کے ساتھ قومی آزادی کی تحریک میں شامل ہیں۔یہ لوگ جگہ جگہ جلسے بھی منعقد کرتے ہیں۔اور بہت سی اصلاحی تحریکیں بھی قائم کرتے ہیں۔اس کے علاوہ دوسرے کرداروں کی بھی بہت سی خصوصیات کا زاہدہ زیدی نے ذکر کیا ہے۔جن میں سکینہ،سکینہ کی ماں پٹھانی، نینا، کالے خاں اور سلیم کا کردار متحرک ہے۔

اس مضمون میں زاہدہ زیدی نے اس چیز کی طرف خاص طور سے توجہ دی ہے اس میں جتنے بھی کردار ہیں۔ان میں کہانی کے شروعات میں ہمیں جو خصوصیات دیکھنے کو ملیں گی وہ ناول کے رفتہ رفتہ آگے بڑھنے کے ساتھ ان میں بھی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔اور ان کے فیصلے بدلتے رہتے ہیں۔امر کانت کا باپ اور بیوی جو کہ شروع میں امر کانت کی اصلاحی تحریکوں کے مخالف ہوتے ہیں بعد میں خود قومی تحریکوں میں حصہ لیتے ہیں۔اسی طرح کالے خاں کو اکردار ہے جو شروع میں ایک چور ہوتا ہے جو لالہ سمر کانت کی دکان پر چوری کا مال دیتا ہے لیکن وہی کالے خاں وہ سماجی تحریک میں شامل ہو جاتا ہے۔اسی طرح کے اور بھی کردار ہیں۔

اس طرح ہم اس ناول میں دیکھتے ہیں کہ بیش تر کردار اپنی حالت کے موافق فیصلے لیتے ہیں۔اور زندگی کو نئے رخ کی طرف موڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔زاہدہ زیدی نے نے اس پورے مضمون میں ان کرداروں کے بدلتے ہوئے طریق کار،ان کے فیصلوں اور ان کرداروں کے بدلتے ہوئے فیصلوں پر اس مضمون میں تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔

اگلا مضمون ''انقلاب،سیاسی منظر میں ایک ذاتی ناول'' ہے۔انقلاب جو خواجہ احمد عباس کا ایک مقبول ناول ہے۔اس ناول کو زاہدہ زیدی نے ایک پرسنل ناول کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔جس میں ہونے والے سیاسی تاریخی اور معاشرتی حالات کو زاہدہ زیدی نے خواجہ احمد عباس کی حقیقی زندگی میں رونما ہونے والے

واقعات کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔گویا انہوں نے اسے خواجہ احمد عباس کا ایک ناول بتایا ہے۔جس میں خواجہ احمد عباس نے ایک کردار انور کے ذریعہ خود اپنی زندگی کے حالات قلم بند کئے ہیں۔

زاہدہ زیدی نے انور کے ہندوستان میں چل رہی مختلف تحریکوں میں حصہ لینے اور گاندھی جی متاثر ہونے اور نہرو کو ہیرو ماننے کے واقعات، انور کی علی گڑھ کی تعلیمی، اس کی عشقیہ، اس کی صحافتی زندگی اور پھر مختلف تحریکوں میں حصہ لینے کو بھی تفصیل سے بیان کیا ہے۔

گویا کہ خواجہ احمد عباس نے اس میں ان تمام چیزوں کا ذکر کیا ہے۔جو ان کی زندگی میں پیش آئے تھے۔اور اس پورے ناول اور انور کے حوالے سے انہوں نے اس وقت کے ہندوستانی کی سیاسی، سماجی اور معاشرتی حالات کا نقشہ کھینچتے ہوئے اس میں انور کی سرگرمیوں اور اس کی شرکت کی تصویر کشی ہے۔خواجہ احمد عباس کی زندگی پر بھی اس ناول کے ذریعہ روشنی ڈالی جاسکتی ہے۔انور کے علاوہ بھی اس ناول کے دوسرے کرداروں کا بھی اہم رول ہے۔جس سے انور کی زندگی کے بہت سے واقعات جڑے ہیں۔زاہدہ زیدی لکھتی ہیں:

> اس ناول یعنی ''انقلاب'' کی ایک قابل قدر خصوصیت یہ ہے کہ اس میں عباس نے سیاسی اور اہم شخصیات اور کہانی کے کرداروں کو بڑی چابکدستی سے ایک دوسرے کے رابطے میں پیش کیا ہے۔کہانی کے کرداروں میں انور کے علاوہ اکبر علی رامیشور دیال، سلمٰی، پروفیسر سلیم، راز، عثمان، سبحان، آشا، رتن اور روبرٹ ملز کچھ قابل ذکر کردار ہیں۔جو نہ صرف ناول کے اسٹرکچر کی تکمیل میں معاون ہیں۔بلکہ ہمارے ذہن پر اپنا نقش بھی مرتب کرتے ہیں۔اور انور کے ذہنی ارتقاء میں معاون ثاوت ہوتے ہیں۔اور ان کے علاوہ امجد علی، نواب صاحب، پھوپی اماں، گلابو، انجم، آشا کی ماں چھمیا بائی، موہن، منظور عالم اور دوسرے کئی کردار بھی خاصی چابکدستی سے پیش کئے گئے ہیں۔اور ناول کی دلچسپی میں اضافہ کرتے ہیں۔97

کتاب کا اگلا مضمون ''چاندنی بیگم، ایک ہمہ جہت ناول'' کے نام سے ہے۔جس میں زاہدہ زیدی نے قرۃ العین حیدر کے اس ناول پر کسی قدر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور اس ناول کا تجزیہ پیش کر کے اس کی ہمہ جہت معنویت اور اس کی ادبی قدر و قیمت بھی متعین کی ہے۔

زاہدہ زیدی کے خیال میں قرۃ العین حیدر اردو کے کئی قابل قدر ناول اور افسانے لکھے۔لیکن جو

شہرت اور مقبولیت ان کے ناول ''آگ کا دریا'' کو ملی وہ کسی اور کے حصہ میں نہیں آئی۔اس کی وجہ بھی ''آگ کا دریا'' ہے۔کیوں کہ اردو کے ادبی حلقوں میں جس قدر گفتگو اس ناول پر ہوئی اس کے باعث ان کی دوسری تخلیقات کو زیادہ تنقیدی توجہ نہ ملی۔حالانکہ انہوں نے ''آخر شب کے ہم سفر، چاندنی بیگم، گردش رنگ چمن، اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجیو اور کار جہاں دراز ہے'' جیسے اردو کے شاہکار ناول تخلیق کئے لیکن ان کو اس قدر توجہ نہ مل سکی جس کے وہ حق دار تھے۔

اس مضمون میں زاہدہ زیدی نے ''چاندنی بیگم'' کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے۔یہ ناول 1990 میں شائع ہوا۔اس ناول میں تقسیم ہند سے پہلے کے واقعات ہیں جو تقریباً 40/45 سالوں پر محیط ہیں۔اس ناول کا موضوع بقول زاہدہ زیدی زندگی، زمانہ، زمین، وقت اور موت ہیں۔اگر دیکھا جائے تو قرۃ العین حیدر کے دوسرے ناولوں کا موضوع بھی وقت اور زمانہ ہے۔جس کی تابندہ مثال ''آگ کا دریا'' ہے۔اور جو چاندنی بیگم میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔اس ناول میں آگ کو بھی اہمیت حاصل ہے جو اس ناول کے کرداروں اور گھر میں رہنے والوں کو جلا کر راکھ کر دیتی راکھ کر دیتی ہے۔

ناول میں بیشمار کردار نظر آتے ہیں جیسے ریڈ روز ہاؤس، کے کرداروں میں میر شیر اظہر علی، ان کی بیوی بٹو بیگم، بیٹا عنبر علی اور اس گھر کے ملازم، بٹو بیگم کی سہیلی اور ان کی بیٹی چاندنی بیگم۔دوسرا خاندان تین کٹوری ہاؤس کے راجہ صاحب، ان کی بیگم، تین بیٹیاں زرینہ، پروین اور صفیہ۔ایک اور غریب خاندان کے کردار ماسٹر موگرے، ان کی بیوی چنبیلی بیگم، بٹی بیلا اور بیٹا شاعر گل عباس وغیرہ اس ناول کے اہم کردار ہیں۔

اس مضمون میں ناول کے ہر کردار کی زندگی کا خلاصہ کیا گیا ہے اور ان کی زندگی میں ہونے والے اتار چڑھاؤ کا بھی بیان ہے۔ پھر ان کرداروں کی زندگی پر تفصیلی روشنی ڈالنے کے بعد زاہدہ زیدی نے ایک اہم سوال کی طرف اشارہ کیا کہ اس ناول میں کرداروں کی بھرمار ہے۔اور ہر ایک اپنے رول کو بخوبی انجام دیتا بھی نظر آتا ہے۔تو پھر قرۃ العین حیدر نے اس ناول کا نام چاندنی بیگم ہی کیوں رکھا۔اس کی وجہ زاہدہ زیدی نے کچھ اس طرح بتائی ہے کہ اگرچہ ناول میں بہت سے اہم اور غیر اہم کردار ہیں۔لیکن انہیں وہ مرکزی حیثیت حاصل نہیں جو چاندنی بیگم کو ہے۔ان میں سے ہر کردار کا بیان کچھ اس طرح سے ہے کہ اس کے ذریعہ ہم چاندنی بیگم

تک پہونچتے ہیں۔ چاہے وہ ریڈ روز ہاؤس کے کردار ہوں یا تین کٹوری پاؤس کے کردار۔ لہذا اس ناول میں مرکزی حیثیت چاندنی بیگم کو ہی ہے۔ اور اسی لیے اس ناول کا نام بھی قرۃ العین حیدر نے چاندنی بیگم رکھا ہے۔ جو ایک سیدھی سادھی غریب خاندان کی ایک تعلیم یافتہ اور ظاہری چمک دمک سے دور ایک ذہین اور مہذب شخصیت کی مالک ہے۔

اس ناول میں قرۃ العین حیدر نے زندگی کے مختلف زیروبم کی وضاحت کی ہے۔ جس میں سرمایہ دار طبقہ خاص طور سے نظر آتا ہے۔ زاہدہ زیدی نے اس ناول کا نہ صرف تجزیہ کیا ہے بلکہ اس کی فکری وفنی خصوصیات ،اس کے واقعات، کردار، مناظر اور اس ناول کے ڈرامائی عناصر کی بھی نشاندہی کی ہے۔ جس کی وجہ سے ہم اس ناول کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ بھی کر سکتے ہیں۔

اس کے بعد کا مضمون بھی قرۃ العین حیدر کی تخلیقات سے متعلق ہے۔ جس کا عنوان ''قرۃ العین حیدر کے فکشن میں عورتوں کے کردار، دو مختصر ناولوں کے حوالے سے'' ہے۔ جس میں زاہدہ زیدی نے قرۃ العین حیدر کے دو مشہور ناول ''اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجیو'' اور ''سیتا ہرن'' کے حوالے سے ان کی تخلیقات میں عورتوں کے کردار پر روشنی ڈالی ہے۔ دونوں ان کے اہم ناول ہیں۔ لیکن دونوں ناولوں میں عورتوں کے کردار میں ہمیں تضاد نظر آئے گا۔ جس پر زاہدہ زیدی نے کسی قدر ناقدانہ نظر ڈال کر اس بات کی وضاحت بھی پیش کی ہے۔

پہلے انہوں نے اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجیو کی دو بہنوں قمرن اور جمیلن کے کردار پر روشنی ڈالی ہے جو والدین کے انتقال کے بعد اپنی خالی کے ساتھ رہتی ہیں۔ جن کے کوئی اولاد نہیں ہوتی۔ کسی طرح یہ لوگ قوالی گا کر اپنی گزر بسر کرتے نظر آتے ہیں۔ لیکن کچھ دن بعد قمرن کو اس کی مترنم آواز کی وجہ سے ریڈیو میں نوکری مل جاتی ہے۔ یہاں اس کی ملاقات ڈپٹی صاحب کے بیٹے سے ہوتی ہے جو قمرن جو ہنی مسٹرس بناتا ہے لیکن شادی کسی اور سے کر لیتا ہے۔ پھر کسی طرح اس کی ملاقات امریکی نوجوان سے ہوتی ہے جو قمرن سے شادی کر لیتا ہے۔ لیکن وہ بھی قمرن کو چھوڑ کر چلا جاتا۔ قمرن کو اس سے ایک بیٹی بھی ہوتی ہے۔ وہ اس کو ڈھونڈنے پاکستان تک جاتی ہے لیکن اس کو پتہ چلتا ہے کہ اس نے کسی اور سے شادی کر لی۔ آخر کار وہ گھر واپس آجاتی ہے۔ لیکن اس کی بیٹی پاکستان میں کسی ڈرگ کرنے والوں کے ساتھ پکڑ جاتی ہے اور قتل کر دی جاتی ہے۔ قمرن تھک ہار کر

دوبارہ خالہ کے ساتھ رہنے لگتی ہے۔لیکن اب اس کی عمر ڈھل چکی ہے۔

دوسرے ناول ''سیتا ہرن'' میں قمرن کے برعکس سیتا کا کردار ہے۔جس نے امریکہ تعلیم حاصل کی ہے۔یہیں اس کی ملاقات جمیل سے ہوتی ہے۔جس سے اس نے اب شادی کر لی ہوتی ہے اور ان کا ایک بیٹا بھی ہے۔ایک دن اس کی ملاقات قمرالاسلام سے ہوتی ہے۔جس سے سیتا کی نظریں چار ہوتی ہٰں ۔پھر کسی طرح یہ خبر جب جمیل کو ملتی ہے تو وہ سیتا کو گھر باہر کر دیتا ہے جب قمرالاسلام بھی اس کے بعد سیتا سے دوستی ختم کر دیتا ہے۔اور پھر وہ کسی طرح اپنے والدین کے پاس دہلی آتی ہے تو اس کی ملاقات یہاں آرٹسٹ برجیش کمار سے ہوتی ہے دونوں ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں۔اسی درمیان اس کا شوہر جمیل کسی اور سے شادی کر لیتا ہے۔اس کے اچانک اسے اپنی سہیلی بلقیس کے یہاں کراچی جانے کا موقعہ ملتا ہے۔کراچی میں اس کی ملاقات عرفان سے ہوتی ہے۔دونوں آپس میں دلچسپی لینے لگتے ہیں۔پھر سیتا اپنے بچے کو لینے جمیل کے پاس جاتی ہے۔یہاں پر وہ جرنلسٹ لیزی مارش سے جنسی تعلقات قائم کرتی ہے۔اس کی اس حرکت کا عرفان کو بھی علم ہو جاتا ہے۔لیکن وہ اس سے فرانس میں ساتھ رہنے کا وعدہ کرتی ہے۔لیکن جب سیتا فرانس جاتی ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ عرفان نے اس کی دوست بلقیس سے شادی کر لی ہے اور پھر یہیں ناول ختم ہو جاتا ہے۔

ان دونوں ناولوں کے کرداروں میں ہمیں تضاد صاف نظر آتا ہے جہاں غریب قمرن پہلے ڈپڑی صاحب کے بیٹے کی مسٹرس ہوتی ہے تب بھی صرف اسی کی وفادار ہوتی ہے اور جب ایک امریکی سے شادی کرتی ہے تب بھی زندگی بھر اسی کے انتظار میں گزار دیتی ہے۔اس کے برعکس سیتا ہے جو ایک موڈرن اور آزاد خیال ہے لیکن وہ بورڈم کا شکار ہے۔جس کو دور کرنے کے لیے وہ جنس کا سہارا لیتی ہے۔جب کہ اگلے جنم مو ہے بٹیا نہ کیجیو کی عورتیں سیدھی سادھی، بدنصیب اور باصلاحیت خواتین ہیں۔جب کہ سیتا مین کوئی ایسی بات نہیں۔اس مضمون کے ذریعہ زاہدہ زیدی نے قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں خواتین کے کرداروں کی نہ صرف وضاحت کی ہے۔بلکہ ان کے تضادات کو بھی دکھایا ہے۔اور ان کے ناولوں میں خواتین کے کرداروں کی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

کتاب کا آخری مضمون ''پیغام آفاقی کے ناول ''مکان'' کا تانیثی کردار'' ہے۔اس مضمون میں ناول کے

مرکزی کردار ''نیرا'' کی زندگی کے تجربات، مشاہدات اوراس کی شخصیت کے اہم پہلوؤں پر توجہ مرکوز کی گئی ہے۔

نیرا جو میڈیکل کی طالب علم ہے۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ دہلی میں رہتی ہے اور انہوں نے اپنے مکان کا ایک حصہ ایک شخص کمار کو کرائے پر دے رکھا ہے۔ جب اس کی تعلیم مکمل ہوتی ہے تو وہ کمار سے مکان خالی کروا کر وہاں ایک میڈیکل کھولنا چاہتی ہے۔لیکن کمار نے مکان کو ہتھیانے کا سارا انتظام کر رکھا ہے۔ اس تگ ودو میں نیرا کو بہت سی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اسے کوٹ کچہری کے چکر لگانے پڑتے ہیں۔لیکن وہ وہاں خود کو بے سہارا محسوس کرتی ہے اسے وہاں محسوس ہوتا ہے کہ ہر کوئی اس کی روح اور جسم کا سودا کرنا چاہتا ہے۔لیکن وہ کسی کے ہاتھوں کھلونا نہیں بنتی اور ہمت سے کام لیتی ہے۔ جس کے باعث اس میں خودداری، پختگی اور دنیا سے مقابلہ کرنے کا عزم پیدا ہوتا ہے۔ اس درمیان اس کو وسیع کائنات کا جو علم ہوتا ہے اس میں اس کے لیے مکان لی اہمیت بھی کم ہو جاتی ہے۔ آخر کار کمار اور اس کا دوست اشوک نیرا کی عزم ہمتی کے سامنے جھک جاتے ہیں۔

پیغام آفاقی نے اپنے اس ناول میں ایک لڑکی کی حوصلہ مندی اور جرات کو دکھایا ہے۔ اور اس کی ذہانت اور جدوجہد کی وضاحت بھی کی ہے۔ اور نیرا اپنی ذہانت اور مخفی قوتوں کی مدد سے ہی حقیقت کا ادراک کرتی ہے۔ اور حالات کا مضبوطی کے ساتھ نپٹنے کا حوصلہ بھی رکھتی ہے۔ پیغام آفاقی کے اس ناول میں زاہدہ زیدی نے بہت سی اہم خصوصیات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جیسے نیرا کی ہمت کا چیخوف کے افسانہ ''چیری کا باغ'' کی ہیروئن کے عزم سے مقابلہ کیا ہے تو کبھی کافکا کے ناول The Trial سے۔ اور کبھی اس میں ابسرڈ ڈرامے کی خصوصیات کی نشاندہی کی ہے تو کبھی نیرا کے وجادی خیال کو ژال۔ پال سارتر کے ڈرامے The Flies سے۔ غرض کے اس ناول میں بہت سی خصوصیات بیک وقت جمع ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ناول کو آگے بڑھانے کے لیے پیغام آفاقی کی خیال آرائی اور سہل نگاری کا بھی ذکر ہے۔ اور نیرا کی کسی قدر طویل خودکلامی کا ذکر۔ اس کے برعکس پیغام آفاقی کی فطرت نگاری کی بہترین مثالیں بھی نظر آتی ہیں جب نیرا اپنی ماں کے ساتھ شملہ جاتی ہے۔ جہاں پہاڑوں، سڑکوں، سمندر کی بل کھاتی موجیں، دھوپ چھاؤں اور خوبصورت چاندنی کا ذکر ہے۔ گویا یہ کہ پیغام آفاقی کا یہ ناول کئی اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے۔

زاہدہ زیدی کے ان تنقیدی مضامین سے ہمیں ان کی نہ صرف تنقیدی صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ بلکہ ایک نقاد کی حیثیت سے ان کی بھرپور اور قد آور شخصیت سامنے آتی ہے۔ان مضامین میں انہوں نے مختلف ادیبوں کے شعری مجموعے،ان کی شعری صلاحیت، افسانہ نگاری، ناول نگاری اور ان کی تخلیقی خوبیوں اور خامیوں پر بھی ناقدانہ نظر ڈالی ہے۔جس سے ان فنکاروں کی تخلیقی صلاحیت ہمارے سامنے آتی ہے اور اردو ادب میں ان کے صحیح مقام کی وضاحت بھی ہوتی ہے۔اور اسی کے ساتھ زاہدہ زیدی کے تنقیدی نقطۂ نظر کی وسعت بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔

حوالے:

1۔ نیا دور، لکھنؤ، قرۃ العین حیدر نمبر 11.12 جلد 63 فروری، مارچ 2009

2۔ زاہدہ زیدی؛ جدید مغربی ڈرامے کے اہم رجحانات، نئی دہلی: سجاد پبلیشنگ ہاؤس، 1998ء، ص،

3۔ رضا علی عابدی مغربی ڈرامہ اور جدید ادبی تحریکیں جامعہ پنجاب، لاہور 1987 ص، 122

4۔ مسدود راہیں، ص، 118

5۔ ایضاً، ص، 15

6۔ ایضاً، ص، 19

7۔ ایضاً، ص، 10

8۔ ایضاً، ص، 346-347

9۔ ایضاً، ص، 276

10۔ایضاً، ص، 176

11۔رضا علی عابدی مغربی ڈرامہ اور جدید ادبی تحریکیں جامعہ پنجاب، لاہور 1987، ص، 122

12۔ ایضاً، ص، 44-45

13۔ ایضاً، ص، 51

14۔ انصاف کا دائرہ، ص، 10

15۔ ایضاً، ص، 11-12

16۔ ایضاً،ص،12

17۔ ایضاً،ص،101

18۔ ایضاً،ص،37

19۔ زاہدہ زیدی؛انسان اپنی تلاش میں،نئی دہلی:ترقی اردو بیورو،1998ء،ص،19

20۔ ایضاً،ص،37

21۔ ایضاً،ص،11

تنقید:

1۔ زاہدہ زیدی؛رموزفکروفن،علی گڑھ:آبشار پبلی کیشنز،علی گڑھ،1993ء،ص،14

2۔ ایضاً،ص،15

3۔ ایضاً،ص،59

4۔ ایضاً،ص،60

5۔ ایضاً،ص،62

6۔ ایضاً،ص،63

7۔ ایضاً،ص،67

8۔ ایضاً،ص،84

9۔ ایضاً،ص،108

10۔ ایضاً،ص،139

11۔ ایضاً،ص،159

12۔ ایضاً،ص،163-164

13۔ ایضاً،ص،168

14۔ ایضاً،ص،175

15۔ ایضاً،ص،177

16۔ ایضاً،ص،183

17۔ ایضاً،ص،185

18۔ ایضاً،ص،199

19۔ ایضاً،ص،217

20۔ ایضاً،ص،225

21۔ ایضاً،ص،229

22۔ ایضاً،ص،230

23۔ ایضاً،ص،238

24۔ ایضاً،ص،266

25۔ ایضاً،ص،277

26۔ ایضاً،ص،280-281

27۔ زاہدہ زیدی؛لذتِ آشنائی،علی گڑھ،آبشار پبلیکیشنز،2003ء،ص،ص،08-09

28۔ ایضاً،ص،10

29۔ ایضاً،ص،11

30۔ ایضاً،ص،15

31۔ ایضاً،ص،15/16

32۔ ایضاً،ص،23

33۔ ایضاً،ص،23-24

34۔ ایضاً،ص،44

35۔ ایضاً،ص،51

36۔ ایضاً،ص،55

37۔ ایضاً،ص،57

38۔ ایضاً،ص،61

39۔ ایضاً،ص،65

40۔ ایضاً،ص،68

41۔ ایضاً،ص،70

42۔ ایضاً،ص،73
43۔ ایضاً،ص،75
44۔ ایضاً،ص،75
45۔ ایضاً،ص،79
46۔ ایضاً،ص،82
47۔ ایضاً،ص،96
48۔ ایضاً،ص،98
49۔ ایضاً،ص،100
50۔ ایضاً،ص،103
51۔ ایضاً،ص،106
52۔ ایضاً،ص،120-119
53۔ ایضاً،ص،123
54۔ ایضاً،ص،130
55۔ ایضاً،ص،134
56۔ ایضاً،ص،143-142
57۔ ایضاً،ص،145
58۔ ایضاً،ص،147-146
59۔ ایضاً،ص،155
60۔ ایضاً،ص،58
61۔ ایضاً،ص،159
62۔ ایضاً،ص،161
63۔ ایضاً،ص،163
64۔ ایضاً،ص،166
65۔ ایضاً،ص،169

66۔ ایضاً،ص،176

67۔ ایضاً،ص،186

68۔ ایضاً،ص،190

69۔ ایضاً،ص،195

70۔ ایضاً،ص،197

71۔ ایضاً،ص،199

72۔ ایضاً،ص،205

73۔ ایضاً،ص،207

74۔ ایضاً،ص،219

75۔ ایضاً،ص،220

76۔ایضاً،ص،227

77۔ ایضاً،ص،227

78۔ ایضاً،ص،230-231

79۔ ایضاً،ص،235-236

80۔ ایضاً،ص،248

81۔ ایضاً،ص،270

82۔ ایضاً،ص،272

83۔ ایضاً،ص،276

84۔ ایضاً،ص،278

85۔ ایضاً،ص،280

86۔ زاہدہ زیدی؛ دردِ تہِ جام،علی گڑھ،آبشار پبلی کیشنز،2010ء،ص،23

87۔ ایضاً،صفحہ،23-26

88۔ ایضاً،ص،111

89۔ ایضاً،ص،59

90۔ ایضاً،ص،67

91۔ ایضاً،ص،77

92۔ ایضاً،ص،81

93۔ ایضاً،ص،84

94۔ ایضاً،ص،98

95۔ ایضاً،ص،117

96۔ ایضاً،ص،126

97۔ ایضاً،ص،165

☆☆☆

باب پنجم

اردو ادب میں زاہدہ زیدی کا مقام و مرتبہ

اردو ادب میں زاہدہ زیدی کا شمار ان شخصیتوں میں ہوتا ہے۔جنھوں نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی اور جو ادب کے ہر گوشے میں کامیاب نظر آتی ہیں۔زاہدہ زیدی نے شاعری، ڈراما، ناول، تنقید اور ترجمہ کے میدان میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں لیکن ان کی بیشتر تخلیقات شاعری اور ڈرامے پر مشتمل ہیں۔زاہدہ زیدی نے ترقی پسند تحریک کے آخری دور میں تخلیقی سفر کا آغاز کیا۔تخلیقی سفر کے اس دور میں زاہدہ زیدی نے تاریخ کے کئی زیر و بم کا مشاہدہ کیا لیکن کبھی حالات کے مدو جزر سے متاثر نہیں ہوئیں۔جدیدیت، مابعد جدیدیت اور تانیثی تحریک بھی ان کو متاثر نہ کر سکی۔تانیثی تحریک کے فروغ میں بیشتر خواتین نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور تحریک سے متاثر ہو کر ادب کے کئی صفحات رنگ دیے گئے لیکن زاہدہ زیدی نے اس سے بھی خود کو الگ رکھا۔یہی وجہ ہے کہ ان کی تخلیقات میں کسی ایک پہلو کی تشہیر نظر نہیں آتی ہے۔زاہدہ زیدی کے بارے میں یہ کہا جائے کہ انہوں نے خود کو کسی نظریہ یا تحریک سے وابستہ نہیں کیا تو غلط نہ ہوگا۔کسی نظریہ یا تحریک کے زیر اثر ادب تخلیق کرنا زاہدہ زیدی نے کبھی پسند نہیں کیا۔انہوں نے خود اس بات پر زور دیا ہے کہ میری شاعری کو کسی نظریہ یا تحریک سے جوڑ کر نہ دیکھا جائے۔ادب ہوا میں تخلیق نہیں ہوتا ہے بلکہ اس کا تار و بود سماج کے مسائل میں پیوست ہوتا ہے ایسے میں کسی مصنف کی تصنیفات پر یہ کلیہ قائم کرنا کہ ان کے یہاں کسی طرح کے نظریات کا اثر نہیں ہے یہ خود کو گمراہ کرنے کے مترادف ہوگا۔زاہدہ زیدی کے یہاں جو موضوعات برتے گئے ہیں ان کی جڑیں سماجی مسائل سے مربوط ہیں اس لیے ان کے یہاں تحریکات کا تھوڑا اثر ہونا لازمی ہے۔ان کی تخلیقات کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ خود کو نظریات و تحریکات سے دامن بچانے کے باوجود ان کے یہاں ترقی

پسند تحریک، تانیثیت اور کچھ حد تک جدیدیت کے رجحانات ملتے ہیں:

اسلوب احمد انصاری ان کی ہمہ گیر شخصیت کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

زہدہ زیدی کی توانا اور پر کشش تخلیقی شخصیت کے ایک ساتھ کئی زاویے ہیں۔وہ انگریزی ادبیات کی پروفیسر رہی ہیں،شعر کہنے کے علاوہ انہوں نے اردو اور انگریزی میں تنقیدیں لکھی ہیں۔مختلف زبانوں سے ترجمے کیے ہیں،بہترین ڈرامے لکھے اور اسٹیج کیے ہیں۔ان کے اظہار کا ایک وسیلہ ناول کی صنف بھی رہی ہے۔سماجی،معاشرتی،فنی اورادبی مسئلوں پران کی دانش ورانہ فکر کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوا۔1؎

جدید اردو شاعری میں زاہدہ زیدی کا نام مستند اور معتبر ہے،انہوں نے حقیقت کو اپنے اندر جذب کر کے اس سے آنکھیں ملائیں اور زندگی کو اس کے تمام تر تضادات،ابہام،،رنج والم اور نا یافت کے المیے کے ساتھ انگیز کیا ہے۔ان کے شعری موضوعات میں فرقہ وارانہ فسادات سے لے کرسماجی انصافی،سماجی ظلم،بربریت،موجودہ عہد میں کربلا کی نشاندہی،ہجرت،ذاتی غم،کرب،تنہائی،مسرتو شادمانی،داستان حسن وعشق،موت اور تخلیق شعر جیسے موضوعات شامل ہیں،زاہدہ زیدی نے خود بھی مجموعہ''شعلۂ جاں'' کے مقدمے میں اپنے پسندیدہ موضوعات میں زندگی،موت،عشق،غم،فطرت،انسانی فطرت،سچائی،تنہائی،اقدار کی شکست وریخت،خارجی ماحول،انسانی زندگی اور اس کے مسائل،آزادی زاور وقت وغیرہ کو شامل کیا ہے۔

اپنی شاعری کی خصوصیات کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

میری شاعری میں جو فکر کا عنصر قابل لحاظ ہے،وہ میرے ہی گہرے اور پہلودار تجربات اور شدت احساس کا ثمر ہے۔لیکن میرے تجربات صرف ذاتی زندگی کے مسائل،انسانی رشتوں اور تعلقات،سوشل لائف اور سیر وسیاحت وغیرہ تک محدود نہیں بلکہ ان میں میری دانش وارانہ دلچسپیاں اور میرا گہرااور وسیع مطالعہ بھی شامل ہے۔میں عالمی ادب،شاعری،نفسیات،فلسفہ،تاریخ،تصوف اور مذاہب کا وسیع مطالعہ کیا ہے۔وجودیت اور مارکسزم سے گہرے طور پر متاثر رہی ہوں۔مجھے ڈرامے تھیٹر،مصوری،موسیقی اور دوسرے فنون لطیفہ سے گہری دلچسپی رہی ہے اوران سے میرا کچھ تخلیقی تعلق بھی رہا ہے۔یہ سب عناصر بھی میری تخلیقی فکر میں رچے بسے ہوئے ہیں اوران کا عکس میری شاعری میں ناگریز ہے۔2؎

زاہدہ زیدی نے ذاتی غم عالم کے ساتھ خارجی مسائل کی عکاسی کی ہے۔انہوں نے انسانیت کے غم اوراس کی اعلیٰ اقدار کی پامالی پرنوحہ بھی کیاہے۔اوراس کے غم کا شدت سے اظہار بھی کیااپنے داخلی تجربات کو زندگی کے خارجی مسائل میں ڈرالتے ہوئےنظم ’’داخلی منظر‘‘میں کہتی ہیں:

رفتہ رفتہ
رگ جاں میں جمتا ہوا
زخم خوردہ تصور کا رستا لہو
سوختہ فکر کی خاک اڑتی ہوئی
____چار سو____
ہر طرف____
سونی راہوں میں بکھری ہوئی
خشک و درماندہ احساس کی پتیاں
سرنگوں بستر خاک پر
گرمیٔ شوق کا طائرِ نیم جاں
دھند کی گہری چادر میں لپٹے ہوئے
سرمئی راستے
اوران پیچ در پیچ راہوں میں الجھی ہوئی
پاشکستہ، ہراساں، تھکی زندگی
دور حد نظر تک
خلا____در خلا____در خلا____
اور پھر____
آسمانوں کے ایوان بالا سے
زینہ بہ زینہ اترتا ہوا
موت کا کارواں

زاہدہ زیدی کی شاعری میں دوسری خواتین شاعرات کی طرح تانیثیت کی لہر نہیں، اور نہ ہی تانیثیت کا نقارہ بجانے والوں کی طرح گھن گرج، اگر ان کی معاصر شاعرات کی بات کی جائے تو بہت سی ایسی شاعرات ہیں جنہوں نے صرف تانیثیت کو پروان چڑھایا، کشور ناہید جنہوں نے اپنی زیادہ تر شاعری میں نسوانی جذبات اور ان کے مسائل کی طرف خاص توجہ دی، اور معاشرہ میں عورتوں کے ساتھ ہونے والے ظلم وستم اور ناانصافی کے خلاف آواز اٹھائی۔اسی طرح فہمیدہ ریاض کے بارے میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ انہوں نے عورت کیزندگی، اس کی گھٹن اور جنسی مسائل پر بے باکی سے لکھا۔ پروین شاکر نے بھی اپنی شاعری میں زیادہ تر نسوانی عکس کا اظہار کیا ہے۔ جب کہ ادا جعفری نے اپنے ماحول سے بغاوت، معاشرے اور سماج کے فرسودہ رسم ورواج کے خلاف احتجاج ملتا ہے۔اسی طرح ممتاز مرزا بھی اپنی شاعری میں حقوق نسواں کے لیے آواز بلند کرتی نظر آتی ہیں۔اور جدید معاشرے میں عورت کی پابندی کے خلاف حمایت کرتی ہیں۔

ان سب میں ہمیں شفیق فاطمہ شعریٰ کی شاعری کا الگ رنگ نظر آتا ہے ان کا مزاج کلاسکی روایت کا پاسدار تھا اور انہوں نے اپنی شاعری میں کلاسکی روایت کی پاسداری ساتھ فلسفہ اور تاریخ کو پیش کیا۔اگر ساجدہ زیدی کی بات کی جائے تو ان کی شاعری بھی جدید دور میں انفرادیت کی حامل ہے۔زاہدہ زیدی کی طرح ساجدہ زیدی ان کا مطالعہ بھی وسیع اور گہرا تھا۔ان کا خاص میدان سماج، سیاست اور عورت کے استحصال کے خلاف بغاوت ہے۔انہوں نے بھی اپنی شاعری میں عورت کی جو تصویر پیش کی ہے، اس میں عورت کی ہستی، اس کا وجود دکھ، درد اور آلام ومصائب کا مجسمہ نظر آتی ہے۔ان کے علاوہ مسعودہ حیات نے اپنی شاعری میں عورت کی شکل نمایاں کی ہے اس میں عورت کی نفسیات کی عمدہ عکاسی ملتی ہے جہاں عورت روایت کی پاسداری کرتے کرتے تھک چکی ہے۔اور اب وہ سماج میں تبدیلی کی خواہش مند ہے۔

غرض کہ کہہ سکتے ہیں خواتین شاعرات کے یہاں دوسرے موضوعات کے ساتھ اس موضوع کو خاص توجہ دی گئی ہے وہ خود ان کے، ان کی ذات اور ان کی ہم جنسوں کے دکھ درد، ان کی نفسیات اور ان کے مسائل کی عکاسی ہے، دوسری شاعرات کی طرح زاہدہ زیدی بھی اپنے عہد اور سماج سے متاثر تھی انہوں نے بھی عورتوں

کے مصائب وآلام اوران پر بے پابندیوں کو دیکھا تھا لہذا ان کی شاعری میں بھی اس موضوع کی تصویر نظر آنا فطری تھا انہوں نے خواتین کی زندگی اوران کے مسائل کی عکاسی نہیں کی یا انہیں عورتوں کی کے دکھ درد کا اندازہ نہیں تھا، زاہدہ زیدی کو اس بات کا بخوبی علم کا تھا مگر انہوں نے تانیثیت کے حامیوں میں اپنا نام لکھوانے کے بجائے اپنے مشاہدات اور تجربات کو کسی نقطۂ نظر سے جوڑے بغیر اپنی شاعری میں ان مسائل کا اظہار کیا ہے۔اور بڑی بے باکی کے ساتھ اس کا اظہار کیا ہے۔اسی طرح انہوں نے جنسی مسائل پر بھی اپنا قلم اٹھایا ہے۔مگران نظموں کے مطالعہ سے ایک طرح کی بے چینی اور خلش کا اندازہ ہوتا ہے۔

آسماں سے پرے

آسماں ــــــ آسماں

ایک آتش بکف

ایک شعلہ بجاں ــــــ آسماں

حد احساس تک

اک خلا بیکراں

اک فضا بے اماں

چاک کی طرح ہر دم رواں

ایک سنگ گراں

روز وشب کی جنوں خیر چکی میں پستا ہوا

ہر تراشیدہ احساس

ہر کاوش جسم وجاں 4

زاہدہ زیدی کی یہاں موضوعات کا تنوع نظر آتا ہے،اور یہ صرف ان کی شاعری میں ہی نہیں بلکہ انہوں نے جس صنف میں بھی قلم اٹھایا ہے اپنی قابلیت کے جوہر دکھائے ہیں۔جس کی بڑی وجہ تھی کہ انہوں نے اپنی شخصیت کو ذات کے کھول میں بند نہیں کیا۔بلکہ انہوں نے اپنے فکری سرچشمے کو تجربات ومشاہدات سے ہم آہنگ کر کے کامیاب شعری تجربات کیے اور ہر طرح کے ظلم وجبر کے خلاف اپنی آواز بلند کی۔انہوں نے فرسودہ

اقدار و روایات و تہذیب اور تقلیدی رو یے کے خلاف تنقید کی ہے۔

شاعری کی حوالے سے زاہدہ زیدی کی نظمیں زیادہ اہم ہیں، ان کی نظموں میں غزلوں سے زیادہ تنوع نظر آتا ہے، اور مخصوص شعری پیکروں، استعاروں اور علامتوں کے ذریعہ اپنے داخلی اور ذاتی تجربات کا اظہار انہوں نے اپنی نظموں میں ہی کیا ہے، فورم اور تکنیک کے اعتبار سے بھی ان کی نظمیں اہمیت کی حامل ہیں، زاہدہ زیدی نے چانکہ آزاد نظم کا فورم استعمال کیا تھا اور اسی فورم کو انہوں نے بخوبی اپنی نظمون میں برتا، امیجری اور شعری آہنگ کے ساتھ ان کی نظمیں وجود میں آئی ہیں۔ جن کی معنویت ان کے تراشیدہ پیکر اور ان کے رمز و آہنگ میں پوشیدہ ہے، اور آزاد نظم کو ایک ایسے فورم میں ڈھالنے کی کوشش کی گئی ہے جو ان کے گہرے جذبات اور فکری جائزے کو منعکس کر سکے۔

لیکن ایسا نہیں کی ان کی غزلیں مشاہدات اور تجربات کی عکاسی نہیں بلکہ ان کی غزلیں بھی موجودہ عہد کی بہترین غماز ہیں اور انہوں نے غزل میں بھی موجودہ عہد کے ساتھ اپنے زندگی کے ہر مسائل کو برتا ہے۔ زاہدہ زیدی کی غزلوں میں بھی داخلی کیفیات، شدید جذبات، عصری حالات اور ذاتی احساسات کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ اپنے عہد کی شکت و ریخت اور اپنی جڑوں سے کٹ جانے کے درد کو بیان کرتی ہیں:

جانے کس وقت میں ہم لوگ چلے تھے گھر سے سنگ جاں ہم کو کھینچے لے جاتے ہیں سرابوں کے بھنور

اور کبھی اپنے ذاتی غم کو بیان کرتی ہیں:

امیدو بیم کے صحرا میں یہ طویل سفر تپش یہ سوز و دروں کی یہ آبلہ پائی

عشق کا جذبہ جو ہر شاعر کا اپنا ذاتی ہوتا ہے زاہدہ زیدی نے بھی اس احساس کو گہرے جذبات اور تفکر میں پیش کیا ہے:

نواحِ جاں کے ادھورے سفر کو یاد کریں خیال و خواب کی اس رہ گذر کو یاد کریں
کسی بیاض تمنا کے کچھ ورق پلٹیں نگاہ لطف کو رمز نظر کو یاد کریں
مہکتی سرمئی شاموں کی نغمگی کو جگائیں سنہری کیف میں ڈوبی سحر کو یاد کریں
بدن کے لمس میں بجتی سی جلترنگ سنیں لہو کی بوند میں رقص شرر کو یاد کریں
یہ خشک سالی، یہ بنجر زمیں، یہ گرم ہوا لہو کی موجِ رواں، چشم تر کو یاد کریں

عشق ومحبت کے حسین جذبات کے ساتھ اپنے اندر کے اجاڑ اور خزاں کے منظر کو بھی بیان کیا ہے۔

خزاں کی شاخ بریدہ کو ہاتھ میں لے کر   گلوں کی شعلہ بکف رہگزر کو یاد کریں

زاہدہ زیدی کی شاعری کے مطالعہ سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری میں ہر موضوع پر قلم اٹھایا ہے، اور نہ صرف معاصر خواتین میں بلکہ موجودہ عہد میں جدید شاعری کی روایت میں ان کا نام انفرادیت کا حامل اور سرفہرست ہے۔

شاعری کے بعد انہوں نے ڈراما اور ناول کی طرف بھی اپنی توجہ مبذول کی، ناول کے میدان میں اگرچہ انہوں نے ایک ہی ناول لکھا لیکن اس میں اپنے خاص انداز اور مغنی طرز کو برقرار رکھا، لیکن ان کی دلچسپی کا اصل میدان ڈراما کی صنف ہے۔ جس سے ان کی طبیعت کو فطری مناسبت تھی۔ زاہدہ زیدی نے ڈرامے کی صنف میں بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ ان کی ڈراما نگاری کو ان کی شاعری کا ہم پلہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ زاہدہ زیدی کے ڈراموں کا پہلا مجموعہ ''دوسرا کمرہ'' 1990 میں منظر عام پر آیا۔ اس کے علاوہ ان کے ڈراموں کا مجموعہ ''صحرائے اعظم'' (1991)، ''بہت دور تک رات ہوگی'' (2006) اور ''کیوں کر اس بت سے رکھوں جان عزیز''۔

''چٹان'' ایک استعاراتی وعلامتی ڈراما ہے۔ اس ڈرامے میں بھی ایک ڈراما ہے، جو زندگی کا استعارہ بن کر سامنے آتا ہے۔ زندگی واقعہ در واقعہ کا مجموعہ ہوتی ہے اور واقعہ در واقعہ کی تکنیک پر زندگی کا سفر جاری رہتا ہے، زندگی کے اسی تہہ دار پہلو کو ڈرامے کی تکنیک بنایا ہے، جسے ہم ڈراما در ڈراما کہہ سکتے ہیں۔ سچ ہے کہ یہ دنیا ایک اسٹیج کی مانند ہے اور ہم اس کے جیتے جاگتے کردار ہیں۔ زاہدہ زیدی کا یہ ڈراما وجودی نظریہ کا حامل ہے جس میں انسان کے وجود کو مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ اس نظریہ کا مقصد آج کی بحرانی زندگی میں حقائق کو تلاش کرنا ہے۔ ساتھ ہی ڈراما در ڈراما کی تکنیک یعنی جہاں بغیر اسکرپٹ کے لمحہ بہ لمحہ ڈراما تخلیق کیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں اس میں لایعنی ڈرامے کے اجزاء کی بھی شمولیت دکھائی دیتی ہے۔ لایعنی ڈرامے کے اجزاء میں اظہاریت، سریلزم اور علامتی طرز اظہار شامل ہیں، جس میں ڈرامے کے منطقی اور میکانکی تصور سے انحراف کر کے کرداروں کو وسیع تر کائناتی تناظر میں پیش کیا جاتا ہے۔ یہ تمام عناصر ہمیں اس ڈرامے میں بھی دکھائی دیتے ہیں۔

''دل ناصبودارم'' ہے۔اس ڈرامے کے سرورق پر ہی لکھا ہے کہ یہ ایک سریلسٹ ڈرامہ ہے۔جس سے ہم نداز ہ لگا سکتے ہیں کہ زاہدہ زیدی کا یہ ڈراما بھی ابسرڈ ڈرامے کی تکنیک میں لکھا ہوا ایک علامتی ڈرامہ ہے۔اس کے ذریعے زاہدہ زیدی نے زندگی کے داخلی تجربات اور خارجی محرکات دونوں کی ایک ساتھ تصویر کشی کی ہے۔ڈراما ''دوسرا کمرہ'' ہے۔اس ڈرامے کی بنیاد کسی کہانی یا واقعہ پر نہیں بلکہ اس میں فکری اور حسیّاتی فضا کی تعمیر پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ڈراما کے ذریعے کرداروں کی داخلی کیفیت کو ابھارا گیا ہے۔اس ڈرامے میں حقیقت اور فینٹسیکی آمیزش ملتی ہے۔ڈرامے کو پڑھ کر ایک عجیب سا خوف طاری ہوتا ہے جو روز بروز بڑھتی ہوئی برہنہ لاشوں کی وجہ سے ہے۔یہ انسان کے تحت الشعور میں چھپے ہوئے ڈر، وسوسے اور خوف کی وجہ ہے۔یہ احساس جرم اور تہذیب واقدار کی شکست وریخت آج کے بحرانی دور میں ہر انسان کے اندر موجود ہے۔اس ڈرامے کے ذریعے انسان کے انھیں داخلی اندیشوں اور تشویش کو تجسیم دے کر ابھارا ہے۔اسی طرح سے ان کے دو اور ڈرامے ''وہ صبح کبھی تو آئے گی'' اور ''اور جنگل جلتا رہا'' بھی انفرادیت کے حامل ہیں۔جن میں ہندوستانی ماحول اور خاص کر متوسط ہندوستانی گھرانوں کی تصویر کشی ملتی ہے۔ان کے دوسرے ڈرامے ''صحرائے اعظم، کیوں کر اس بت سے رکھوں جان عزیز اور بہت دور تک رات ہوگی'' اردو ڈرامے کی صنف میں اپنی انفرادیت رکھتے ہیں۔جس میں زاہدہ زیدی کی ڈراما نگاری کی خصوصیات واضح طور سے نظر آتی ہیں۔ڈراما صحرائے اعظم اور بہت دور تک رات ہوگی، سے ان کے حساس ذہن ودل کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے معاشرہ میں ہونے والے ظلم وستم اور ناانصافی سے کس حد تک متاثر تھیں۔

زاہدہ زیدی کی معاصرین ڈراما نگاروں پر نظر ڈالی جائے تو ہمیں اس میدان میں بھی خواتین کی بے بہا خدمات کا اندازہ ہوجاتا ہے۔حجاب امتیاز علی، رشید جہاں، عصمت چغتائی، صالحہ عابد، حسین، بانو قدسیہ، قدسیہ زیدی، خدیجہ مستور وغیرہ نے ڈراما نگاری کی صنف میں قبل قدر اضافے کئے ،لیکن ان خواتین کے ڈرامے زیادہ تر ڈرامے ہندوستانی ماحول اور ہندوستانی تہذیب ومعاشرہ کی کی عکاسی کے ارد گرد نظر آتے ہیں۔ان خواتین میں عصمت چغتائی اور بانو قدسیہ کے کچھ ڈراموں میں ہمیں مغربی ڈراما نگاروں کی تقلید بھی ملتی ہیں لیکن دور حاضر کی ڈراما نگاروں میں ڈراما ساجدہ زیدی کا نام سرفہرست ہے انہوں نے بھی ڈراما نگاری

میں مغرب کی طرز کے بہترین ڈرامے لکھ کر اردو ڈراما نگاری کو نیا رنگ و آہنگ دیا، اگر زاہدہ زیدی کی بات کی جائے تو وہ جدید مغربی ڈرامے سے بے حد متاثر تھیں۔ انہوں نے یونانی ڈرامے کی ابتدا سے لے کر جدید مغربی ڈرامے تک اس قدر وسیع مطالعہ کیا تھا کہ ڈرامے کی صنف ان کے ذہن و دماغ کے نہاں خانوں میں سرایت کر گئی۔ قدیم ڈرامہ نگاروں میں انہوں نے شیکسپیئر کے ڈراموں کا گہرائی سے مطالعہ کیا جب کہ جدید مغربی ڈراما نگاروں میں سٹرنڈ برگ، ہزک ابسن، برناڈ شا، چیخوف، یوجین انیسکو، ژال پال سارتر، ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ، بارتول بریخت، سیمول بیکٹ اور پیدرولو وغیرہ کو نہ صرف پڑھا بلکہ ان کے ڈراموں کو اردو میں منتقل بھی کیا۔ یہ تراجم ''چیخوف کے شاہکار ڈرامے'' (1992)، ''مسدود راہیں'' (1998) اور ''انصاف کا دائرہ'' (2002) کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔

مغرب کے ان شاہکار ڈراموں کے مطالعے، ان کے ترجمے اور ان کے وسیع مشاہدے کا نتیجہ یہ ہوا کہ زاہدہ زیدی نے اردو میں روایتی ڈراموں کے برعکس مغربی ڈراموں اور خاص کر جدید مغربی ڈراموں کی طرز پر نہایت کامیاب ڈرامے تخلیق کیے۔ تکنیک کے نئے تجربے جیسے نیچرلزم، اظہاریت، علامت نگاری، ڈریم تکنیک، ابسرڈ اور ڈراما در ڈراما کی تکنیک جو جدید مغربی ڈرامے کی پہچان ہیں، سے اردو ڈرامے کے فن اور تکنیک میں وسعت پیدا کی۔ اس طرح زاہدہ زیدی کی کاوشوں سے اردو ڈرامے میں ایک نئی طرز تخلیق کا اضافہ ہوا۔ اردو ڈرامے اور ترجمہ نگاری کی صنف میں زاہدہ زیدی کا یہ ایک بیش بہا کارنامہ ہے جسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ خلیق انجم نے ان کے تراجم ''انتون چیخوف کے شاہکار ڈرامے'' کے تعارف میں زاہدہ زیدی کی اس بے بہا اور گراں قدر کوشش کو ان الفاظ میں سراہا ہے۔

> مغربی ادب میں زاہدہ زیدی کا مخصوص میدان ڈرامہ ہے، انہوں نے خاص طور سے جدید ڈرامے کا مطالعہ کیا ہے۔ اس موضوع پر متعدد کتابیں اور مضامین لکھ چکی ہیں۔ زاہدہ زیدی کا اسٹیج ڈرامے سے گہرا تعلق رہا ہے۔ انہوں نے ڈراموں کا اردو میں ترجمہ بھی کیا اور طبع زاد ڈرامے بھی لکھے۔ زاہدہ زیدی نے شگفتہ اور سلیس زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ کتاب کے شروع میں چیخوف کے فن کا انتہائی عالمانہ انداز میں ایسا تنقیدی تجزیہ پیش کیا ہے کہ اس عظیم فنکار کے فن کی تمام اہم خصوصیات کا بھرپور اندازہ ہو جاتا ہے۔ یہ ترجمے ڈرامائی ادب میں اہم اضافے کی حیثیت رکھتے

ہیں۔5

زاہدہ زیدی نے اپنے دوسرے تراجم کا مجموعہ ''مسدودراہیں'' میں بھی ڈراما اور ڈراما نگاروں کے متعلق جو باتیں پیش کی ہیں۔وہ ڈراما اور ڈرامہ نگار کی شخصیت اوراس کے فن کو سمجھنے میں بہت معاون ہیں۔ڈراما پڑھنے سے پہلے ہی ہم اپنے ذہن میں ڈرامے کی مخصوص خصوصیات اور ڈرما نگار کے فن سے واقف ہوجاتے ہیں جس سے ہمیں ڈرامے کے ترجمے کو سمجھنے میں بہت دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔اسی طرح زاہدہ زیدی نے اپنے بیش تر تراجم میں اس بات کا اہتمام کیا ہے۔اوراپنے عمیق مطالعہ کے ذریعہ اردو کے قارئین کو بھی مالامال کیا ہے۔

اردوتنقید کے میدان میں خواتین کی صلاحیتیں اس قدر وسیع نظر نہیں آتیں،اردو کی چند ہی خواتین ہیں جنہوں نے اس میدان کی طرف توجہ کی،بیش تر خواتین نے شاعری،فکشن،سوانح اور خاکہ نگاری کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا اوراس میں اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔لیکن اردوتنقید کی بات کی جائے تو یہاں ہمیں گنتی خواتین نظر آتی ہیں۔ان تنقید نگار خواتین کی تصانیف میں ''تنقیداورانداز نظر،فن کی جانچ (سیدہ جعفر)،

معیار تنقید،منٹو نوری نہ ناری،مغربی افسانے کا اثر اردوافسانے پر(ممتاز شیریں)،اردوناول کا سماجی وسیاسی مطالعہ،جدید خواتین افسانہ نگار،نظریہ اور تجزیہ،نظراورتوسیع (صالحہ زریں)،انتخاب مراثی،خواتین کربلا کلام انیس کے آئینہ میں،ادبی جھلکیاں،بات چیت،اورانیس سے تعارف (صالحہ عابد حسین)،تلاش بصیرت اورگزرگاہ خیال(ساجدہ زیدی)،اردو نثر کا آغاز و ارتقاء،اردو کی ترقی میں خواتین کا حصہ(ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ)،تانیثی تنقید(شہناز نبی)، بیسویں صدی میں کواتین کا اردو ادب(ترنم ریاض)،آزادی کے بعداردوشاعرات (نجمہ رحمانی)''وغیرہ شامل ہیں۔

زاہدہ زیدی کی تنقیدی تصانیف میں لذت آشنائی،درد تہ جام،رموزفکروفن اور جدید مغربی ڈرامے کے اہم رجحانات شامل ہیں۔ان تنقیدی تصانیف میں زاہدہ زیدی نے اردوادب کے کلاسکی شعراء سے لے کر جدید دور کے اہم شعراء،ڈراما نگار،ناول نگاراورافسانہ نگاروں کا بہت باریک بینی سے مطالعہ کرنے بعدان کے فن کی مختلف خصاصیات کواجاگر کیا ہے۔جدید مغربی ڈرامے پرلکھی گئی ان کی کتاب ''جدید مغربی ڈرامے کے

اہم ا جحانات‘‘ میں انہوں نے قدیم مغربی ڈرامے سے لے کر جدید مغربی تک اہم ڈراما نگاروں کے علاوہ مغربی ڈراما میں ہونے والی مختلف تحریکات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ جس سے ہمیں نہ صرف مغربی ڈراما کا خاکہ سمجھ میں آجاتا ہے بلکہ مغرب ڈرامہ میں وقتاً فوقتاً ہونے والی سرگرمیوں، اہم تحریکات اور رجحانات کا بھی بخوبی علم ہوتا ہے۔ زاہدہ زیدی نے یونانی اور مغربی ڈرامے کے قدیم دور کی اہمیت کے ساتھ جدید مغربی دور کو بھی اہم بتایا ہے۔ جہاں کہ جدید ڈراما نگاروں اور تھیٹر کے فنکاروں نے اس میں مزید وسعتیں پیدا کیں۔ اور انسان اور کائنات کی بے پناہ وسعتوں، انسان کی ازلی اور ابدی تلاش اور جستجو، زندگی کے پیچیدہ ترین مسائل اور انسانی نفسیات کے مختلف گوشوں کو اپنے فن کا موضوع بنایا۔ ان ڈراما نگاروں میں زاہدہ زیدی نے ابسن، سٹرنگ برگ، برنارڈ شو، لوئی جی پراندیلو، یوجین آنیسکو، لورکا، ٹی۔ ایس ایلیٹ، میر ہولڈ، بارتول بریخت اور ٹینیسی ویمز وغیرہ کو جدید مغربی تھیٹر کے فورم، اسلوب، تکنیک اور تھیٹر کے ترسیلی امکانات کو وسیع اور کامیاب بنانے اور جدید ڈرامہ کو آگے بڑھانے میں اہم رول کے طور پر پیش کیا ہے۔ ان ڈراما نگاروں کے علاوہ زاہدہ زیدی نے انتون چیخوف کے فن پر بھی قدر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

جب کہ ’’ لذت آشنائی، درد تہ جام اور رموز فکر وفن میں انہوں نے اردو ادب کے اہم شعراء غالب، میر انیس، حالی، اقبال، فیض احمد فیض، سردار جعفری، اختر الایمان ،مخدوم محی الدین، معین احسن جذبی، منیب الرحمان، وحید اختر، سلیمان اریب، جگن ناتھ آزاد اور مخمور سعیدی کی شعری خصوصیات بیان کی ہیں۔ اسی فکشن نگاروں میں پریم چند کے ’’میدان عمل‘‘، قرۃ العین حیدر کے ’’چاندنی بیگم‘‘ اور قرۃ العین حیدر کے نسوانی کردار، پیغام آفاقی کے ناول ’’مکان‘‘، انور سجاد کے ’’جھلستے جنگل‘‘، رفعت سروش کے منظوم ڈرامے اور خواجہ احمد عباس کے ناول ’’انقلاب‘‘ کے ذریعہ ان ادیبوں کے فن، ان کی فکر اور ادب میں ان کے اضافے کا تجزیہ بہت ہی معروضی انداز میں کیا ہے۔ جہاں زاہدہ زیدی نے ان حضرات کی خوبیوں کو سراہا ہے وہیں ان کے فن میں ہونے والی خامیوں کو بھی ابھارا ہے جس سے ان حضرات کی شخصیت کی صحیح اور مکمل تصویر سامنے نظر آتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کہیں کہیں زاہدہ زیدی نے اپنے پسندیدہ شعراء غالب، اقبال، حالی، اختر الایمان اور سردار جعفری وغیرہ سے جذباتی تعلقات کی بناء پر انہیں زیادہ اہمیت دی۔ ان یہ بات سردار جعفری کے لیے

خاص طور سے کہی جاتی سکتی ہے۔سردار جعفری کی شعری خصوصیات پر زاہدہ زیدی نے کئی مضامین لکھے ہیں۔جس میں انہوں نے سردار جعفری کے منظوم ڈراما ''نئی دنیا کو سلام'' کے شعری، فنی اور ڈرامائی عنصر کو خاص طور سے ابھارا ہے۔زاہدہ زیدی کی ان تنقیدی صلاحیتوں اوران کی کتاب ''رموز فکروفن'' کا تجزیہ کرتے ہوئے اسلوب احمد انصاری نے لکھا ہے:

مشہور شاعرہ، ڈراما نگار اور مترجم زاہدہ زیدی کے تنقیدی مضامین کا یہ مجموعہ ''رموز فکروفن'' ان کے وسعت مطالعہ اور ادبی مسائل پر غور و تامل کا نچوڑ پیش کرتا ہے۔اپنی تخلیقی سرگرمیوں کے پہلو بہ پہلو وہ ادبی شاہکاروں اور قدیم وجدید شعراء کا محاکمہ کرنے اور اس کی ابلاغ و تشہیر سے بھی غافل نہیں رہی ہیں۔انیس، اقبال اور اختر الایمان جیسے شعراء کے کلام پر اظہار خیال اس کا ایک بین ثبوت ہے۔وہ ادب کا ایک ستھرا ذوق (جو انہیں خاندانی ورثے میں ملا ہے۔) رکھتی ہیں۔اور مشرق ومغرب کے ادب سے ان کا لگاؤ نے اس پر صیقل کیا ہے۔انیس کی شاعری میں ڈرامائی عناصر کی کھوج ایک ایسا انوکھا زاویہ نظر ہے، جس پر اب تک توجہ نہیں کی گئی تھی۔انہوں نے اطلاعاتی تنقید کے طریقہ کار کو بڑی کامیابی کے ساتھ برتا ہے۔اس مجموعے سے زاہدہ زیدی کے ادبی سروکار کے تنوع کا پتا چلتا ہے، اور تنقیدی مباحث میں ان کی بصیرت کا بھی۔ان کے انداز بیان کی تازگی، شگفتگی اور حلاوت اس پر مستزاد ہیں۔6

ایک واقعہ کو پروفیسر غضنفر نے رسالہ آجکل کے اپنے مضمون ''زیدی بہنیں'' میں لکھا ہے:

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کسی ادبی پلیٹ فارم سے دو نوجوان ادیبوں کی کتابوں پر مختلف اوقات میں دو تہنیتی جلسے ہوئے۔ایک جلسے میں خود زاہدہ زیدی بھی موجود تھیں۔کچھ دیر تک تو وہ صاحب کتاب پر ہونے والی مدح سرائی کو خاموشی سے سنتی رہیں۔پھر ان سے رہا نہیں گیا۔حالت اضطراب میں اپنی جگہ سے اٹھیں اور بغیر بلائے مائک پر پہونچ گئیں۔اور نہایت تلخ اور طنزیہ انداز میں گویا ہوئیں۔۔۔مقررین کی گفتگو سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ جلسہ کسی موپاسا یا چیخوف پر منعقد کیا گیا ہو، یا ٹی۔ایس۔ایلیٹ نے کوئی نئی کتاب لکھ ڈالی ہو۔اور دوسرے نوجوان کے متعلق جب یہ سنا کہ اس کی کتاب پر بڑی دھوم دھام سے محفل اجراء سجائی گئی تو پیچ و تاب کھاتی ہوئی بولیں۔۔۔جمعہ جمعہ آٹھ دن کی پیدائش یعنی میرے سامنے کا پیدا، ہمارا تربیت کا پروردا، صرف ایک کتاب وہ بھی پہلی اور اس پر اتنے سارے ادیبوں کا جمگھٹا اور دھواں دھار تحسینی تقریریں! کیا یہ مضحکہ خیز نہیں لگتا؟ کیا یہ ان جینون ادیبوں کی رسوائی نہیں ہے کہ

جنہوں نے ادب کے میدان میں عمریں کھپا دیں، کتابوں کے ڈھیر لگا دیے مگر آج تک ان پر کسی کی نظر تک نہیں گئی۔کیا یہ ان کی حق تلفی اور ان کے ساتھ ناانصافی نہیں ہے؟اس کا یہ مطلب نہیں کہ انہیں ان نوجوان ادیبوں سے کسی قسم کا پرخاش تھا بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ ان نوجوانوں کو پسند کرتی تھیں اور ان کی تعریف بھی کر چکی تھیں۔دراصل ان کا یہ ردعمل ان نوجوان ادیبوں کے ساتھ نہیں تھا بلکہ ان نقادوں کے خلاف وہ غبار تھا جو ان کے جارحانہ رویوں کی پھونک سے ان کے دل و دماغ میں پھولتا چلا آ رہا تھا اور اس موقعہ پر اچانک پھٹ پڑا تھا۔7

زاہدہ زیدی پر مختلف ادیبوں کا تعارف،ان کی تنقید اور ان کی صلاحیتوں کی مقبولیت کی زاہدہ زیدی کی ہمہ گیر شخصیت کا پتا دیتی ہے۔اور خود زاہدہ زیدی کا اردو ادب کی بیشتر اصناف میں نمایاں تخلیقات بھی ان کی قابل قدر شخصیت کی نشان دہی کرتی ہیں۔انہوں نے شاعری سے لے کر ڈراما، ناول، ترجمہ اور تنقید ہر میدان میں بے بہا اضافہ کیا۔اپنے معاصرین میں بھی اپنے مطالعہ و مشاہدہ،غور و فکر اپنے تجربات کے باعث ہمیشہ منفرد اور قد آور نظر آئیں۔لیکن ان کے مزاج کی تیزی نے اور بیباک شخصیت نے انہیں ادبی حلقوں میں وہ مقام نہیں دیا جس کی وہ حق دار تھیں۔یہی وجہ ہے کہ ادب میں ہونے والی اس سیاسی چالبازی اور چاپلوسی پر انہوں نے اپنے غم و غصہ کا اظہار کرتے ہوئے ڈراما ’’کیوں کر اس بت رکھوں جان عزیز‘‘ تخلیق کیا۔اور ادب میں ہونے والی اس سیاست کو سب کے سامنے واضح کیا۔اس کے علاوہ انہوں نے اپنی زندگی میں بھی کئی جگہ ہونے والی بیجا چھوٹی تعریف کی کھل کر مخالفت بھی کی۔

لیکن ان کی بے بہا، گراں قدر اور اہم تخلیقات کا مطالعہ ادب کے طالب علم مختلف علمی گوشوں اور اس کی ادبی بصیرتوں میں اضافے کی ضامن ضرور ہو سکتی ہیں۔میں نے اپنے اس تحقیقی مقالے میں زاہدہ زیدی کی مختلف فکری و فنی کاوشوں کے اہم نکات پر روشنی ڈال کر ادب میں ان کی اہمیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔جس سے زاہدہ زیدی کی اس گراں قدر خدمات کو اردو ادب میں نہ صرف سراہا جائے بلکہ ان کا صحیح مرتبہ بھی متعین کیا جائے۔اور ان کی تخلیقات کو اردو ادب کا بیش قیمتی، تحقیقی اور مستند سرمایہ سمجھ کر اس سے استفادہ بھی حاصل کیا جائے۔

حوالے:

1۔ زاہدہ زیدی؛ شامِ تنہائی، نئی دہلی: انجمن ترقی اردو ہند، 2008ء، تعارف، اسلوب احمد انصاری۔

2۔ زاہدہ زیدی؛ شعلہ جاں، علی گڑھ: آبشار پبلی شرز، 2000ء، ص، 29

3۔ ایضاً، ص، 44

4۔ ایضاً، ص، 72

5۔ زاہدہ زیدی؛ انتون چیخوف کے شاہکار ڈرامے، نئی دہلی: انجمن ترقی اردو ہند، 1992ء، ص، 12

6۔ زاہدہ زیدی؛ رموز فکر و فن، علی گڑھ: آبشار پبلی کیشنز، علی گڑھ، 1993ء، تعارف، اسلوب احمد انصاری۔

7۔ آجکل، جون، 2011، جلد 69، شمارہ 11، ص، 06

☆☆☆

ماحصل

زاہدہ زیدی کا شمار اردو ادب کی ان شخصیات میں ہوتا ہے جنہوں نے کوچہ ادب میں اپنی زندگی کے شب و روز پوری جانفشانی کے ساتھ گزارے۔ان کی شخصیت ہمہ گیر تھی انہوں نے پہلے خود مختلف علوم وفنون میں مہارت حاصل کی پھر اپنی ان صلاحیتوں کے ذریعہ اردو ادب کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی اور نظم ونثر دونوں میں اپنی گراں قدر خدمات انجام دیں۔وہ اگرچہ انگریزی کی پروفیسر تھیں اور ان پر مغربی ادب کا رنگ گہرا تھا لیکن انہوں نے مغربی ادب کے ذریعہ اپنی مادری اور تہذیبی زبان اردو میں اپنی ناقابل فراموش تخلیقات کے گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔جس سے اردو ادب کی مختلف اصناف غزل،نظم،ناول،ڈرامہ،ترجمہ اور تنقید میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا ہے۔ان کی ادبی خدمات کی گراں قدر کوششوں کے بارے میں اسلوب احمد انصاری کا قول ہے:

> زاہدہ زیدی کی ادبی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے،شاعرہ،ڈرامہ نگار،اور مترجم کی حیثیت سے ان کی تخلیقات گراں قدر ہیں۔اور ان کی حیثیت مسلم ہے۔اب تک ان کے تین شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔اور چوتھا اشاعت کی منزل سے گزر رہا ہے۔ان کی شاعری میں عصری آگاہی کے ساتھ ساتھ ایک کائناتی وژن بھی جاری وساری ہے۔اور ان کی نظموں میں فورم کا بھی گہرا اور تراشیدہ احساس ملتا ہے۔زبان و بیان کے لطیف اور خوشگوار تجربے پیکر تراشی،علامتی اظہار اور ایک معنی آفریں استعاراتی نظم ان کی شاعری کی کچھ نمایاں خصوصیات ہیں،اور جدید شاعری کے منظر نامے میں ان کی انفرادیت سے انکار ممکن نہیں۔ساتھ ہی ڈرامہ کی حیثیت سے بھی ان کا قد اپنے ہم عصر سے بلند تر ہے۔ان کے منفرد اور پرکشش ڈرامے جو''دوسرا کمرہ''اور''صحرائے اعظم'' کی صورت مین منظر عام پر آچکے ہیں۔موضوعات کی اہمیت اور مرکزیت کے ساتھ ساتھ فنی خوبیوں سے بھی آراستہ ہیں۔ماحول اور زندگی سے گہری وابستگی اور مغرب کے شاہکار ڈراموں کے وسیع مطالعہ نے ان کے ڈراموں کو تہ داری اور معنی

آفرینی عطا کی ہے۔(زاہدہ زیدی ؛کیوں کر اس بت سے رکھوں جان عزیز،دہلی :ایجوکیشنل پبلی شنگ ہاؤس،1998ء،مصنفہ کا تعارف۔اسلوب احمد انصاری)

زاہدہ زیدی نے اپنی ادبی سفر کا میں اردو ادب کی بیشتر اصناف غزل،نظم،ناول،ڈرامہ،ترجمہ اور تنقید میں خامہ فرسائی کی ہے۔زاہدہ زیدی کی شعری تخلیقات کا جائزہ لیا جائے تو غزل اور نظم دونوں میں انہوں نے اپنی تخلیقات کو نیا موڑ دیا ہے انہوں نے ترقی پسند کے آخری دور میں اپنی شاعری کا آغاز کیا اور پھر جدیدیت ،مابعد جدیدیت اور تانیثیت کی تحریک کا دور بھی دیکھا۔لیکن انہوں نے کسی نظریہ یا تحریک سے خود کو وابستہ نہیں کیا۔ بلکہ انہوں نے خود اس بات پر زور دے کر کہا ہے کہ میری شاعری کو کسی نظریہ یا تحریک سے جوڑ کر نہ دیکھا جائے ۔ بلکہ تانیثیت جو کہ بیشتر خواتین کا حصہ رہی ہے ۔زاہدہ زیدی نے اس سے بھی خود کو الگ رکھا۔لیکن پھر بھی ان کے یہاں ترقی پسندی اور کچھ حد تک جدیدیت کے رجحانات بھی ملتے ہیں۔

ان کے یہاں داخلی تجربات اور بصیرتوں کے ساتھ ساتھ ہمیں خارجی ماحول اور مسائل بھی انہیں متاثر کرتے ہیں۔ان کے یہاں بھی گنجلک اور مہمل انداز بیان اور مخصوص شعری پیکر واستعارے نظر آتے ہیں۔اوران کی ذاتی کیفیات واحساسات اور شدید جذبات کے اظہار اور داخلی سوز وگداز کا نتیجہ ہے۔ان کی غزلوں کے موضوعات میں فرقہ وارانہ فسادات کے علاوہ سماجی ظلم وناانصافی ،کربلا،تنہائی،آزادی، داستان حسن وعشق کے ساتھ،وقت،موت،فطرت انسانی اور تخلیق شعر وغیرہ ان کے محبوب موضوعات ہیں۔ یہ کہا جا ئے تو بجا ہوگا کہ زاہدہ زیدی نے خارجی اور داخلی دونوں جذبات کی بھرپور عکاسی کی ہے۔زاہدہ زیدی نے فرقہ وارانہ فسادات اور دہشت گردی کے واقعات پر تو نہ صرف ڈرامے لکھے بلکہ نظم اور غزل میں بھی انہوں نے ان موضوعات پر قلم اٹھایا اور سانحہ گجرات وعراق پر نظم اور غزل دونوں لکھیں مجموعہ ’’شام تنہائی‘‘ میں شامل غزلیں اور نظمیں اس بات کا واضح ثبوت ہیں۔سانحہ گجرات (زلزلہ) سے متعلق غزل لکھتی ہیں؛

فنا ساماں یہ کیسا زلزلہ ہے قیامت ہے کہ یہ قہر خدا ہے
ہلاکت خیز ہے لرزش زمیں کی کہ ہر سو فتنۂ محشر بپا ہے
ہیں سڑکوں پر ہراساں غم کے مارے نہ سر پر چھت نہ بستر نے غذا ہے
وہ بچے دب گئے ملبے کے اندر کہ خود معصومیت جن پر فدا ہے

زمیں پر ہر طرف بکھریں ہیں لاشیں　　فضامیں نالۂ غم گونجتا ہے

عشق جوشاعری کا محبوب ترین موضوع ہے،شاعر کا اپنا ذاتی تجربہ بھی ہوتا ہے اور داخلی طور پر انسانی جذبات سے وابستہ بھی ہوتا ہے اس کو زاہدہ زیدی نے مختلف طریقے سے بیان کیا ہے۔مگر عشق کا یہ تصوران کے یہاں خوشی ونشاط،وصل اور محبوب کا دیدار پانے سے زیادہ یاد ماضی سے وابستہ ہے۔اوراب ان کے حصہ میں صرف انتظار،جدائی اور زمانے کی تبدیلی کے ساتھ محبت کے بدل جانے پر منحصر ہے۔وہ کہتی ہیں؛

کہیں ہیں رفاقت کی دلبری ہے　　کہیں محبت کی دل نوازی
کہیں ہیں نزدیکیاں فروزاں　　کہیں سمٹتے ہیں فاصلے سے

وہ وقف ِناز نہیں،میں بھی وفا شعار نہیں
ہمارا عہد محبت بھی استوار نہیں

متاع عشق ترا اعتبار کیوں کر ہو　　خزاں کی رت میں یقیں کیوں کر ہو

کبھی عشق ساز حیات تھا کبھی سوز دل نے جلا دیا
کبھی وصل میں بھی کسک رہی کبھی دردوغم نے مزہ دیا
وہ وصال یار کی برکتیں،یہ شب فراق کے حوصلے
مرا دل نشاط سے بھر دیا مجھے درد حد سے سوا دیا

وصال یار کی ساعت میں یہ ہوا معلوم　　کہ جسم و جاں کا یہ پیرہن بھی میلا تھا

زاہدہ زیدی نے اپنی شاعری میں عصری مسائل کی بڑی حقیقی تصویر کشی کی ہے،اور ذاتی زندگی کے سکھ دکھ کو آفاقی غم میں ڈھال دیا۔ان کی شاعری داخلی تجربے کی شدت،گہرائی،گہرے وجودی اور وجدانی تجربے کا ایک علامتی منظرنامہ ہے،جس میں ماضی،حال اور مستقبل ایک نقطے پر مرتکز نظر آتے ہیں۔

آسمانوں کی محراب پر
ایک تحریر ہے نام
زیرزمیں
گہرے غاروں میں پوشیدہ

اک سیل نادیدہ

اور اس جوئے نادیدہ

اور اس جوئے گم گشتہ کی کھوج

میرا مقدر

مرے فن کی جوئے مسلسل

مری ہستئ ناتمام

زاہدہ زیدی نے لندن سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی وہاں کی تہذیب وتمدن سے بھی شعوری طور پر متاثر بھی ہوئی تھیں۔انہیں وہاں کی تہذیب وثقافت کو نہ صرف سمجھنے کا موقعہ ملا تھا بلکہ وہ تعلیم کے علاوہ وہاں کی مختلف سرگرمیوں کا بھی حصہ رہیں۔ڈرامہ کی صنف سے انہیں خاص لگاؤ تھا لندن میں انہوں نے ڈرامے کی صنف کا بغور مطالعہ کیا اور اسٹیج ڈراموں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا نتیجتاً انہوں ہندوستان آکر بہت سے اسٹیج ڈرامے پیش کیئے،خود بھی ڈرامے تخلیق کیئے اور انگریزی ادب کے مشہور ڈرامہ نگاروں کے ڈرامے اردو میں منتقل بھی کیئے۔جن میں چیخوف،ابسن ،یوجین آنیسکو وغیرہ کے ڈرامے خاص طور سے اہم ہیں۔وہ اپنے بارے میں لکھتی ہیں:

ڈرامے سے اس گہری وابستگی کا لازمی نتیجہ تھا کہ انگلش لٹریچر کی طالب علم اور استاد کی حیثیت سے میں نے ڈرامے پر خاص توجہ دی اور یونانی ڈرامے سے لے کر جدید ڈرامے تک ہر دور کے ڈرامائی ادب کا بغور مطالعہ کیا۔اور شیکسپیئر کو تو شروع سے آخر تک کچھ اس قدر گہرائی اور ذوق وشوق سے پڑھا کہ ایک مدت تک یہ عظیم ڈرامہ نگار میرے دل ودماغ پر چھایا رہا یہاں تک کہ خواب میں بھی اکثر خود کو شیکسپیئر کے کسی کردار ہم کلام پاتی۔لیکن پیشہ وارانہ نقطہ نظر سے میں نے جدید ڈرامے کو خاص طور سے اپنایا اور اس میں برطانوی اور امریکی ڈراموں کے علاوہ یوروپین ڈرامے کو بھی شامل کیا۔اور میرے لیے بے حد وسیع ہمہ جہت زرخیز اور مالا مال علمی میدان ثابت ہوا۔جس میں نہ صرف ذہنی کشادگی اور علمی تحقیق کے بے پایاں امکان موجود تھے۔بلکہ خود میری افتادِ طبع اور تخلیقی تقاضوں سے بھی پوری طرح ہم آہنگ تھا۔(زاہدہ زیدی؛دوسرا کمرہ،علی گڑھ:آبشار پبلی کیشنز،1997ء،صفحہ 5-6)

زاہدہ زیدی کے ڈراموں کی کل تعداد 08 ہے۔ان کے طبع زاد ڈراموں کا پہلا مجموعہ ''دوسرا کمرہ (1990)ہے۔جس میں ''چٹان'' دل ناصبور ادرم'' دوسرا کمرہ''،اور وہ صبح کبھی تو آئے گی'' اور'' اور جنگل جلتا

رہا'' شامل ہیں۔اس کے علاوہ ''صحرائے اعظم (1991) '' ، بہت دور تک رات ہوگی (2006) اور'' کیوں کرس بت سے رکھوں جانِ عزیز (1998) '' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔انہوں نے اپنے ان ڈراموں میں اپنے ماحول اور زندگی کی سرگرمیوں کوایک حساس ذہن کے ساتھ بیان کیا ہے۔وہ اپنے معاشرہ میں ہونے والے سماجی وسیاسی ماحول سے بہت متاثر تھیں۔یہی سب ان کی تخلیقات کا بھی حصہ ہیں۔موضوعات کے علاوہ فن اور تکنیک پر بھی انہوں نے خاص توجہ دی ہے انگریزی ڈرامہ نگاروں کی طرح زاہدہ زیدی نے بھی وجودیت،سرریلزم،انسانی نفسیات کی کشمکش اور انسانی ذہن کی مختلف پیچیدگیوں کواپنے ڈراموں میں دکھانے کی کوشش کی ہے۔

ڈرامے اور شاعری کے علاوہ زاہدہ زیدی نے ناول،تراجم اور تنقید کے میدان میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ اردو میں انہوں نے صرف ایک ہی ناول لکھا جو''انقلاب کا ایک دن'' کے نام سے منظرِ عام پر آچکا ہے۔یہ ایک سیاسی اور انقلابی ناول ہے چونکہ ناول کی صنف میں بھی زاہدہ زیدی انگریزی ادب سے متاثر نظر آتی ہیں ان کا یہ ناول ورجینا وولف کے ناول ''مستقبل کے ناول'' سے ماخوذ ہے۔ڈرامائی انداز میں لکھا گیا یہ ناول چودہ پندرہ قسم کے مناظر پر مشتمل ہے اس ناول میں ڈرامائی انداز اور شعور کی رو کے علاوہ شاعرانہ عناصر سے بھی کام لیا گیا ہے۔فطرت کی عکاسی ہے۔فطرت کی عکاسی کے ساتھ کائنات کے داخلی اور خارجی مسائل کو کامیابی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے جس میں ماضی اور حال کے نقوش ابھرتے نظر آتے ہیں تو مستقبل کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔

اس ناول کے تعارف میں ناول کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے شہناز ہاشمی لکھتی ہیں:

> مجموعی طور پر''انقلاب کا ایک دن'' بے حد دلچسپ اور فکر انگیز ناول ہے۔جس میں ایک پورے دور کے نقوش ابھرتے ہیں۔سب سے زیادہ جاذب توجہ خود صادقہ کا کردار ہے۔صادقہ ان انگریزی ادب میں گہری دلچپسی رکھتی ہے۔ڈرامے اور شاعری سے انہیں خاص لگاؤ ہے۔وہ کمیونسٹ پارٹی کی ایک رکن بھی ہے۔اور اپنے چاروں طرف کے حالات اور واقعات کے بارے میں سنجیدگی اور گہرائی سے سوچتی ہے۔اگرچہ اس کی سوچ زمان ومکاں کی قید سے آزاد ہے۔لیکن اس کو زمانے کے سرد وگرم کی سوجھ بوجھ اور کشاکش جذبات کا احساس بھی ہے۔صادقہ کے تخیل کی

پرواز بے کنار ہے۔لیکن ساتھ ہی وہ حقیقت کی دنیا سے بھی آشنا ہے۔انسانی رشتوں کی نزاکتیں اور لطافتیں مصنفہ نے صادقہ کی زباں اور سرگرمیوں کے ذریعہ بڑی خوبی سے پیش کی ہیں۔استاد اور شاگرد کے رشتے،بزرگوں اور نوجوانوں کے رشتے،دوستوں اور طہم عصروں کے رشتے اور ساتھ انسان اور سماج کی وابستگی،انسانی خیالات پر مناظر فطرت کے اثرات،یہ سب چیزیں بہت ہی سیر حاصل طریقے سے اجاگر کی گئی ہیں۔(زاہدہ زیدی؛انقلاب کا ایک دن،نئی دہلی:ایجوکیشنل پبلی شنگ ہاؤس،1996ء،حرف آغاز،شہناز نبی،7-8)

زاہدہ زیدی کی تنقیدی تصانیف میں لذت آشنائی،درد تہ جام،رموز فکر وفن اور جدید مغربی ڈرامے کے اہم رجحانات شامل ہیں۔ان تنقیدی تصانیف میں زاہدہ زیدی نے اردو ادب کے کلاسکی شعراء سے لے کر جدید دور کے اہم شعراء،ڈراما نگار،ناول نگار اور افسانہ نگاروں کا بہت باریک بینی سے مطالعہ کرنے بعد ان کے فن کی مختلف خصاصیات کو اجاگر کیا ہے۔جدید مغربی ڈرامے پر لکھی گئی ان کی کتاب ''جدید مغربی ڈرامے کے اہم ارجحانات''میں انہوں نے قدیم مغربی ڈرامے سے لے کر جدید مغربی تک اہم ڈراما نگاروں کے علاوہ مغربی ڈراما میں ہونے والی مختلف تحریکات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔جس سے ہمیں نہ صرف مغربی ڈراما کا خاکہ سمجھ میں آجاتا ہے بلکہ مغرب ڈرامہ میں وقتاً فوقتاً ہونے والی سرگرمیوں،اہم تحریکات اور رجحانات کا بھی بخوبی علم ہوتا ہے۔

اردو ادب کی دوسری اصناف کی طرح زاہدہ زیدی نے تراجم کے میدان بھی نہ صرف طبع آزمائی کی ہے بلکہ اس میدان میں بھی انہوں نے اپنی دلچسپی کو نمایاں کرتے ہوئے انگریزی ادب کی کئی اہم کتابوں اور ڈراموں کو اردو میں منتقل کیا۔قدیم ڈرامہ نگاروں میں انہوں نے شیکسپیئر کے ڈراموں کا گہرائی سے مطالعہ کیا جب کہ جدید مغربی ڈراما نگاروں میں سٹرنڈ برگ،ہنرک ابسن،برناڈ شا،چیخوف،یوجین انیسکو،ژاں پال سارتر، ٹی۔ایس۔ایلیٹ،بارتول بریخت،سیمول بیکٹ اور پیدرولوو غیرہ کو نہ صرف پڑھا بلکہ ان کے ڈراموں کو اردو میں منتقل بھی کیا۔یہ تراجم ''چیخوف کے شاہکار ڈرامے''(1992)،''مسدود راہیں''(1998)اور''انصاف کا دائرہ''(2002)کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔

مغرب کے ان شاہکار ڈراموں کے مطالعے،ان کے ترجمے اور ان کے وسیع مشاہدے کا نتیجہ یہ ہوا کہ زاہدہ زیدی نے اردو میں روایتی ڈراموں کے برعکس مغربی ڈراموں اور خاص کر جدید مغربی ڈراموں کی

طرز پر نہایت کامیاب ڈرامے تخلیق کئے۔ تکنیک کے نئے تجربے طرز پر نہایت کامیاب ڈرامے تخلیق کئے۔ تکنیک کے نئے تجربے جیسے نیچرلزم، اظہاریت، علامت نگاری، ڈریم تکنیک، ابسرڈ اور ڈراما در ڈراما کی تکنیک جو جدید مغربی ڈرامے کی پہچان ہیں، سے اردو ڈرامے کے فن اور تکنیک میں وسعت پیدا کی۔ اس طرح زاہدہ زیدی کی کاوشوں سے اردو ڈرامے میں ایک نئی طرز تخلیق کا اضافہ ہوا۔ اردو ڈرامے اور ترجمہ نگاری کی صنف میں زاہدہ زیدی کا یہ ایک بیش بہا کارنامہ ہے جسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ خلیق انجم نے ان کے تراجم ''انتون چیخوف کے شاہکار ڈرامے'' کے تعارف میں زاہدہ زیدی کی اس بے بہا اور گراں قدر کوشش کو ان الفاظ میں سراہا ہے:

> مغربی ادب میں زاہدہ زیدی کا مخصوص میدان ڈرامہ ہے، انہوں نے خاص طور سے جدید ڈرامے کا مطالعہ کیا ہے۔ اس موضوع پر متعدد کتابیں اور مضامین لکھ چکی ہیں۔ زاہدہ زیدی کا اسٹیج ڈرامے سے گہرا تعلق رہا ہے۔ انہوں نے ڈراموں کا اردو میں ترجمہ بھی کیا اور طبع زاد ڈرامے بھی لکھے۔ زاہدہ زیدی نے شگفتہ اور سلیس زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ کتاب کے شروع میں چیخوف کے فن کا انتہائی عالمانہ انداز میں ایسا تنقیدی تجزیہ پیش کیا ہے کہ اس عظیم فنکار کے فن کی تمام اہم خصوصیات کا بھرپور اندازہ ہو جاتا ہے۔ یہ ترجمے ڈرامائی ادب میں اہم اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ (زاہدہ زیدی؛ انتون چیخوف کے شاہکار ڈرامے، نئی دہلی: انجمن ترقی اردو ہند، 1992ء، صفحہ 12)

زاہدہ زیدی کی ان تخلیقات کا جائزہ لینے کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان کی تخلیقات و تصانیف کا حلقہ کافی وسیع ہے۔ انہوں نے اردو ادب کی تقریباً تمام اصناف میں اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے جن سے اردو ادب میں کئی اہم اضافے ہوئے ہیں اور ادب کے شائقین کے لیے بھی قیمتی سرمایہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

کتابیات

بنیادی مآخذ

زاہدہ زیدی؛ انتون چیخوف کے شاہکار ڈرامے، نئی دہلی: انجمن ترقی اردو ہند، 1992ء

زاہدہ زیدی؛ انسان اپنی تلاش میں، نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، 1998ء

زاہدہ زیدی؛ انقلاب کا ایک دن، نئی دہلی: ایجوکیشنل پبلی شنگ ہاؤس، 1996ء

زاہدہ زیدی؛ بہت دور تک رات ہوگی، علی گڑھ: آبشار پبلشرز، 2006ء

زاہدہ زیدی؛ جدید مغربی ڈرامے کے اہم رجحانات، نئی دہلی: سجاد پبلشنگ ہاؤس، 1998ء

زاہدہ زیدی؛ دردِتہِ جام، علی گڑھ، آبشار پبلی کیشنز، 2010ء

زاہدہ زیدی؛ دوسرا کمرہ، علی گڑھ: آبشار پبلی کیشنز، 1997ء

زاہدہ زیدی؛ دھرتی کا لمس، علی گڑھ: لیتھو کلر پرنٹرس، 1975ء

زاہدہ زیدی؛ رموز فکر و فن، علی گڑھ: آبشار پبلی کیشنز، علی گڑھ، 1993ء

زاہدہ زیدی؛ زہرِ حیات، نئی دہلی: انجمن ترقی اردو ہند، 1970ء

زاہدہ زیدی؛ سنگ جاں، نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، 1989ء

زاہدہ زیدی؛ شامِ تنہائی، نئی دہلی: انجمن ترقی اردو ہند، 2008ء

ثانوی ماخذ:

احمد، عتیق: سجاد ظہیر، تخلیقی اور تنقیدی جہات، کراچی: نیو مجاز پریس، 1992
احمد، مجیب خاں، حجاب امتیاز علی حیات اور ادبی کارنامے، دہلی: تخلیق کار پبلشرز، 1996
احمد، مجیب خاں، حجاب امتیاز علی حیات اور ادبی کارنامے، دہلی: تخلیق کار پبلشرز، 1996
احمد، مجیب خاں، حجاب امتیاز علی فن اور شخصیت، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 2000
احمد، مجیب خاں، حجاب امتیاز علی فن اور شخصیت، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 2000
نارنگ، گوپی چند، ادبی تنقید اور اسلوبیات، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 1991
ازہر، نصیر الدین: سجاد ظہیر: حیات و جہات، نئی دہلی: مظہر پبلی کیشن، 2004
اعتماتوف، چنگیز، ماں کی کھیتی، مترجم حیدر قرۃ العین، لاہور: مکتبہ اردو ادب، 2013
بانو، جیلانی، ایوان غزل، نئی دہلی: این سی پی یو ایل، 2021
بانو، جیلانی، بات پھولوں کی، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 2001
بانو، شاہدہ، رشید جہاں: حیات اور کارنامے، لکھنؤ: نصرت پبلشرز، 1990
بانو، شاہدہ، رشید جہاں: حیات اور کارنامے، لکھنؤ: نصرت پبلشرز، 1990
بریلوی، عبادت، اردو تنقید کا ارتقاء، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، 1979ء
ظہیر الدین، فن ترجمہ نگاری، دہلی: سیمانت پرکاشن، 2006
عتیق اللہ، ترجیحات، دہلی: مصنف، 2002
محی الدین، قرۃ العین حیدر: ایک مطالعہ، دہلی: ایچ۔ایس۔آفسیٹ، 1999
پروین، طاہرہ، جدید شاعرات اردو نئی فکر اور نئے راستے، الہ آباد: انجمن تہذیب نو پبلی کیشنز، 2005
جعفر، سیدہ، تنقید اور انداز نظر، لکھنؤ: نیشنل بک ڈپو، 1969
جعفر، سیدہ، فن کی جانچ، حیدرآباد: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، 1965
حسین، بشیر زیدی، قدسیہ زیدی، نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لیمیٹڈ، 2013

حیات، مسعودہ، بوئے سمن، دہلی: مکتبہ جامعہ لیمیٹڈ، 1981
مہدی، صغریٰ، بچوں کی صالحہ عابد حسین، نئی دہلی: مکتبہ پیام تعلیم، 2011
راجہ، ثمینہ، ہویدا، اسلام آباد: مستقبل پبلی کیشنز، اسلام آباد، 1995
رحمانی، نجمہ، آزادی کے بعد اردو شاعرات، دہلی: مصنفہ، 1994
عابدی، رضی، مغربی ڈراما اور جدید ادبی تحریکیں، لاہور: ادارہ تالیف و ترجمہ، جامعہ پنجاب، 1987
ریاض، ترنم، بیسویں صدی میں خواتین کا اردو ادب، دہلی: ساہتیہ اکادمی، 2004
زیدی، ساجدہ (زو یا زیدی مرتبہ) نوائے زندگی، دہلی: اردو اکادمی، 2012
زیدی، ساجدہ، انسانی شخصیت کے اسرار و رموز، دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو، 1999
زیدی، ساجدہ، آتش سیال، دہلی: مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، 1972
زیدی، ساجدہ، تلاش بصیرت، لکھنؤ: مصنفہ، 1991
زیدی، ساجدہ، چاروں موسم، لکھنؤ: نصرت پبلشرز، 1984
زیدی، ساجدہ، سرحد کوئی نہیں، لکھنؤ: نصرت پبلشرز، 1991
زیدی، ساجدہ، موجِ ہوا پیچاں، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 1992
زیدی، ساجدہ، نوائے زندگی، دہلی: اردو اکادمی، 2012
سلطانہ، رفیعہ، اردو نثر کا آغاز و ارتقاء، حیدر آباد: مجلسِ تحقیقات اردو،
سلطانہ، رضیہ، رضیہ سجاد ظہیر: حیات اور کارنامے، دہلی: مصنفہ، 1994
شیریں، ممتاز، معیار تنقید، لاہور: نیا ادارہ، 1963
شیریں، ممتاز، مغربی افسانے کا اثر اردو افسانے پر، الہ آباد: اردو رائٹرس گلڈ، 1997
شیریں، ممتاز، منٹو نوری نہ ناری، دہلی: ساقی بک ڈپو، 1999
زیدی، ہمایوں ظفر، محمد عالم محفوظ (مرتبین) قرۃ العین حیدر شخصیت اور فن، دہلی: مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، 2007
حسین، صالحہ عابد، اردو ناول کا سماجی اور سیاسی مطالعہ، الہ آباد: سرسوتی پریس، 2000

حسین، صالحہ عابد، انتخاب مراثی، نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، 1990
حسین، صالحہ عابد، بات چیت (آل انڈیا ریڈیو کی تقریروں کا مجموعہ)، رامپور: مصنف، 1946
حسین، صالحہ عابد، ادبی جھلکیاں، الہ آباد: ادارہ انیس اردو، 1959
حسین، صالحہ عابد، ہمارے انیس: شخصیت اور فن، نئی دہلی: نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ، 1979
عبدالمغنی، قرۃ العین حیدر کا فن، نئی دہلی: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، 1985
علی سجاد خاں، رشید جہاں: حیات اور خدمات، نئی دہلی: جے۔اے آفسیٹ پریس، 1996
علی سجاد خاں، رشید جہاں۔حیات اور خدمات، نئی دہلی: جے۔اے آفسیٹ پریس، 1996
فتح پوری، فرمان، صرف شاعرات، لاہور: گنج شکر پریس، 2009
فرخی، آصف (مرتب)، یقیں کے آگے گماں کے پیچھے (جیلانی بانو کے افسانوں کا انتخاب)، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 2014
قریشی، عزیز (مرتب)، صالحہ عابد حسین نمبر (کتاب نما کا خصوصی شمارہ، دہلی: مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، 2012
کریم، ارتضٰی، قرۃ العین حیدر ایک مطالعہ، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 1992
بیگ، مرزا حامد، ترجمے کا فن، دہلی: کتابی دنیا، 2005
مستور، خدیجہ، آنگن، نئی دہلی: موڈرن پبلیشنگ ہاؤس، 1984
مستور، خدیجہ، زمین، دہلی: ہمالیہ بک ہاؤس، 1984
ممتاز، شیریں، مغربی افسانے کا اثر اردو افسانے پر، الہ آباد: اسرار کریمی پریس، 1997
نبی، شہناز، تانیثی تنقید، کلکتہ: کلکتہ یونیورسٹی، 2000
نوواوبرایا، یودوکیہ، مترجمہ قرۃ العین حیدر، نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لیمیٹڈ، 2013
ہارپرلی، نغمے کا قتل (مترجم الطاف فاطمہ)، لاہور: فیروزسنز لمیٹڈ، لاہور، 1969

ہاشمی، جمیلہ، آتش رفتہ، لاہور: داستان گو پبلشرز، 1961
ہاشمی، قاضی عبیدالرحمٰن، سید عابد حسین، نئی دہلی: ساہتیہ اکادمی، 1995

رسائل:

آجکل، جون، 2011، جلد 69، شمارہ 11۔ صفحہ، 06
نیادور لکھنؤ، قرۃ العین حیدر نمبر 11.12 جلد 63 فروری، مارچ 2009
محمد حسن، شاعر (نثری اور غزل نمبر)، جلد 54 شمارہ 7/8، ص 15/16
ایوان اردو، قرۃ العین حیدر نمبر، دہلی، جنوری، 2008

☆☆☆

ZAHIDA ZIAID KI ADABI KHIDMAT KA TANQIDI MUTALAA

[A Critical Study of Literary Works of Zahida Zaidi]

Thesis submitted to the Jawaharlal Nehru University in partial fulfillment of the requirement for the award of the Degree of

DOCTOR OF PHILOSOPHY

By

Zulfi Haseeb

Under the supervision of

Prof. Mazhar Hussain

CENTRE OF INDIAN LANGUAGES
School of Language, Literature & Culture Studies
Jawaharlal Nehru University
New Delhi-110067

2022

ZAHIDA ZIAID KI ADABI KHIDMAT KA TANQIDI MUTALAA

[A Critical Study of Literary Works of Zahida Zaidi]

Thesis submitted to the Jawaharlal Nehru University in partial fulfillment of the requirement for the award of the Degree of

DOCTOR OF PHILOSOPHY

By

Zulfi Haseeb

Under the supervision of

Prof. Mazhar Hussain

CENTRE OF INDIAN LANGUAGES
School of Language, Literature & Culture Studies
Jawaharlal Nehru University
New Delhi-110067
2022